رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

بازی گر: ایک آشفتہ سر کی سرگزشت

گردش: محبت کے رنگوں سے گندھی داستان

خالی دامن: خواہشوں کے اک غلام کا قضیہ

سیوک: ماروائی موضوع

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغربی ادب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ آنچل پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 نئے افق پبلی کیشنز کی مطبوعات ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ایدھی کے جھولے......!

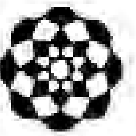
ایدھی ہومز اور چھیپا ہومز اور دیگر ایسے فلاحی اداروں کی جانب سے بار بار یاد دہانی کے طور پر کہا جاتا ہے' چھپوایا جاتا ہے کہ معصوم بے گناہ بچے جو چاہے آپ کے جائز ہوں یا ناجائز' انہیں قتل نہ کریں ہمارے جھولے میں ڈال دیں۔ کچھ مائیں اپنی غلط کاری کے نتیجے سے پیچھا چھڑانے کے لیے' کچھ اپنی غربت وافلاس کے باعث اپنے جگر کے گوشوں کو ہلاک کر دیتی ہیں یا پھر اپنی ممتا سے مجبور ہو کر انہیں زندہ رکھنے کے لیے ایدھی یا چھیپا جیسے اداروں کے پالنوں میں ڈال دیتی ہیں۔

آج جب کہ اسلام کا سورج طلوع ہوئے چودہ سو برس بیت چکے ہیں' جہالت ظلم و بربریت نے ہمارے ذہنوں کو اب بھی جکڑ رکھا ہے' مسموم کر رکھا ہے' آج بھی ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں کیونکہ ہم نے ایمان کی روشنی کو اپنے سے دور کر لیا ہے یا ایمان کی روشنی ہم سے دور ہو چکی ہے۔ قبل از اسلام عربوں میں یہ رواج عام تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ میرے خیال میں وہ لوگ آج کے لوگوں سے پھر بہتر تھے کہ وہ اس بچی کا قصہ ہی ختم کر دیا کرتے تھے۔ آج کے جدید ترین معلومات کے دور میں جب کہ بچے بڑوں کے کان کترتے ہیں ایسے ماحول میں یہ لاوارث بے نام والدین کی اولادیں کس ذہنی اذیت کن نفسیاتی مسائل سے دوچار ہوتی ہیں اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔

آج کے جدید ترین ٹیکنالوجی کے دور میں جب دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر سکنے کی صلاحیت عام ہو چکی ہے ایسے ماحول میں بھی اکثر جاہل کم عقل لوگ اپنی بیویوں کو محض اس لیے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں جس میں ان کے والدین بھی اکثر شریک ہوتے ہیں کہ گھر والی نے لڑکی کو کیوں جنم دیا یا ایک کے بعد دیگرے پے در پے لڑکیاں ہی لڑکیاں کیوں پیدا کر رہی ہے۔ حالانکہ احکام الٰہی اور قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق تو لڑکیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور جنت کا پروانہ ہوتی ہیں۔ ان عقل کے اندھوں کو یہ تمیز نہیں کہ قصوروار عورت نہیں وہ خود اصل قصوروار ہوتے ہیں' عورت کے بارے میں تو قرآن حکیم میں اللہ ذوالجلال کا فرمان ہے کہ ''عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں'' (سورۃ البقرۃ ۲۲۳) یعنی فطرۃ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیرگاہ نہیں بنایا بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ورشتہ ہے' کوئی بھی کسان اپنے کھیت میں محض تفریح وطبع کے لیے نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے اپنی نسل کی پیداوار حاصل کر سکے۔ اللہ کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اپنی کھیتی میں کس طرح کیسی کاشت کرتے ہو۔

انسان بطور کسان کے اپنی کھیتی میں جو اور جیسا بوتا ہے وہی کاٹتا ہے' یعنی اگر ہم اپنی زمین میں گیہوں کا بیج ڈالیں گے تو ہماری زمین جواب میں گیہوں کی ہی فصل پیدا کرے گی' ایسا ممکن نہیں کہ بیج تو گیہوں کا بویا جائے اور

پیداوار چنے یا باجرے کی ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد مبارک سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عورت کسی کھیتی کی مانند ہوتی ہے' اس سے یہ بات بھی کھل گئی کہ مرد اپنی کھیتی میں اپنا جیسا بیج بوئے گا' ویسی ہی پیداوار ہو گی یعنی یہ بات اس طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ لڑکیوں کی پیدائش میں عورت قطعی قصوروار نہیں اس میں سراسر قصور مرد کے نطفے کا ہے پھر سزا عورت کو کیوں دی جاتی ہے' اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے اس سے بڑی جاہلیت اور کیا ہو سکتی ہے کرے کوئی بھرے کوئی' مجرم تو خود مرد ہوتا ہے اور سزا عورت کو دی جاتی ہے۔ کیا کبھی ایسا بھی دیکھا یا سنا ہے کہ کسی کسان نے اپنی کھیتی اس لیے چھوڑ دی ہو یا جلا دی ہو کہ فصل اور پیداوار اس کی توقع کے مطابق کیوں نہیں ہوئی اور یہ بھی کہ بانجھ صرف عورتیں ہی نہیں ہوتی' مرد بھی بانجھ ہوتے ہیں' لیکن بانجھ ہونے کی سزا صرف عورت کو ہی دی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کو اور کسی حد تک عورتوں کو بھی سوچنا سمجھنا چاہیے جو اپنے جگر گوشوں کو اپنی ہوتے رہتے بستے ہوئے بھی لاوارث بے یار و مددگار بے نام ونشان چھوڑ دیتی ہیں۔ اسلام تو ایک تہذیب کا نام ہے جو ایک مہذب معاشرے کو جنم دیتا ہے' ظلم وجبر کے خلاف عفو ودرگزر رحم وفضل کو فروغ دیتا ہے۔ ایسے والدین ذرا سوچیں غور و فکر کریں' غیرت کریں کہ وہ اپنے جن بچوں کو یوں ایدھی کے جھولے میں ڈال جاتے ہیں' ان کے مستقبل سے وہ بے خبر' بے پروا ہو جاتے ہیں' کیا اس طرح ان کے حوالوں سے ان کی جان چھوٹ جائے گی؟ کیا روزِ محشر ان سے ان کے بارے میں پرسش نہیں ہو گی اگر وہ اپنے نطفے کی خرابی کے باعث کسی طرح غلط راستا اختیار کرنے والوں میں شامل ہو گئے تو اس کا جواب کون دے گا۔ ان کے وہ ماں باپ جنہوں نے ان بچوں کو پھینک دیا تھا' لاوارث کر دیا تھا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے کہ ہر ماں باپ اپنی اولاد کی بہتر تربیت کرے۔ یہ حکم ہر ذی شعور ماں باپ کو دیا گیا ہے' مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرنے کا حکم قرآن کریم میں سورۃ انعام آیت ۱۵۱' میں اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۳۱' میں دیا گیا ہے ''اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو' ان کو اور تم کو ہم ہی روزی (یعنی رزق) دیتے ہیں یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔'' (بنی اسرائیل ۔۳۱) آیات کریمہ میں ایسے والدین کو حکم دیا جا رہا ہے جو مفلسی اور غربت کے باعث اپنی اولاد کو قتل کر دیتے ہیں یا ایدھی کے جھولے کے حوالے کر دیتے ہیں' ایسے لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی اولادوں کو نہیں کھلاتے پلاتے ان کا سب کا اور ہمارا تمہارا سب کا رازق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے' وہی ہمیں اور ہماری اولادوں کی پرورش ونگہداشت کر رہا ہے' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا رب ہماری اولادوں کے باعث ہی ہمارے رزق میں بے پناہ اضافہ فرما رہا ہو' ہر کسی کا مقدر بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے' مایوسی کفر ہے۔ آج ہم مسلمان جس کس مپرسی کے عالم میں جی رہے ہیں اس کی سب سے بڑی اہم وجہ ہمارا اپنے دین اسلام سے دور ہونا ہے' ہم ہر کام شیطان کے بتائے بہکاوے کے مطابق کرتے ہیں' احکامات الٰہی اور سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انحراف کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اللہ ہمارا حامی ومددگار رہو۔ یقین جانیے اگر آج بھی ہم مسلمان اجتماعی طور پر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لیں اور احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہو جائیں' اپنی زندگی سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق گزارنے لگیں تو یقیناً دنیا کے سارے تاج وتخت ایک بار پھر مسلمانوں کے قدم تلے ہوں گے۔ نا ہی پھر کسی کو کسی بھی طرح کسی ایدھی ہوم کی یا ایدھی کے جھولوں کی ضرورت پڑے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اہل ایمان کو خصوصاً اہل پاکستان کو ایمان کی دولت سے سرفراز فرمائے اور ہمیں دین حق دین اسلام پر چلنے والا احکام الٰہی کو اپنانے والا بنائے' آمین یارب العالمین!



گفتگو

عمران احمد

فرمان رسولؐ

سیدنا نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی صفوں کو برابر کو لو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں میں تغیر پیدا کردے گا سیدنا انسؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ جب کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اپنی صفوں کو درست کرلو اور مل کے کھڑے ہو، اس لئے کہ میں تمہیں اپنی پیٹھ پیچھے سے (بھی) دیکھتا ہوں۔ بخاری: کتاب الاذان

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

موسم گرما، بجلی کی لوڈشیڈنگ اور مہنگائی اپنے عروج پر ہے۔ جس وقت ہم یہ تحریر لکھ رہے ہیں۔ بجٹ کا جھٹکا بھی عوام کو لگ چکا ہے۔ حسب سابق وزیر خزانہ صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ بجٹ عوامی ہے اور جن چیزوں پر براہِ راست یا بلاواسطہ ٹیکس لگایا گیا ہے اس سے عام آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ویسے ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم اس عام آدمی کو تلاش کررہے ہیں۔ جو کبھی مہنگائی اور بجٹ سے متاثر نہیں ہوتا۔ غالباً وہ عام آدمی ایوان صدر یا وزیراعظم ہاؤس میں رہتا ہوگا۔ اگر انسانوں کی بستی میں ہوتا تو کسی نہ کسی کو تو نظر آتا۔ دوسری طرف مادر پدر آزاد ٹی وی چینلوں میں حالات حاضرہ پر دکھائے جانے والے ڈراموں یعنی ٹاک شوز میں جاہلیت کی حدوں کو چھوتے دانش ور سیاست داں سول سوسائٹی کی بزعم خود نمائندہ بیبیاں ہمیں مستقبل کی جو تصاویر دکھا رہے ہوتے ہیں الامان لگتا ہے کہ دنیا آج ختم ہوئی کہ کل ختم ہوئی، اگر ہم نے اور معاشرے نے ان کی تجاویز پر عمل نہیں کیا تو۔ اللہ ہمیں اپنے حال پر رحم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارا رب بڑا رحیم و کریم ہے۔ کسی بھی مصور کو اپنی معمولی تخلیق سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ وہ اسے ضائع کرنے یا اس کا حسن بگاڑنے کی ہمت نہیں رکھتا تو وہ مصور جس نے اس کائنات کو خلق کیا جس نے اس میں اپنی محبت کے رنگ بھرے تو وہ کیسے اسے بگاڑ سکتا ہے۔ بس ہم خود ہی اسے بگاڑنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

شہناز بانو...... کراچی۔ محترم بھائی عمران احمد السلام علیکم اور بہت دعائیں۔ تمام قارئین کی خدمت میں بصد خلوص واحترام سلام عرض ہے اور ڈھیر ساری دعاؤں کے بعد سنایئے سب کیسے ہیں؟ اچھے ساتھیو بس کبھی مصروفیات کی وجہ سے خط نہیں لکھ پاتی ہوں یا عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ناول کی قسط کے ساتھ ہی خط بھی ارسال کردیتی ہوں لیکن کبھی قسط پہلے بھیجنی پڑتی ہے اور رسالہ دیر سے موصول ہوتا ہے اور خط رہ جاتا ہے۔ خط نہ بھی لکھ سکوں پھر بھی آپ سب کے محبت نامے بہت اشتیاق سے پڑھتی ہوں۔ جو بہن بھائی میری کمی محسوس کرتے ہیں ان کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور سب کے گھروں میں خوشیوں کے ڈیرے ہوں نازش (نازسلوش ذشے) بھئی میں تو نازش ہی کہتی ہوں۔ میرے بے حد اصرار پر تشریف لائی ہیں۔ کتنی بری بات ہے ہمارے سندھ کی برائی کررہی ہو۔ بھئی مانا کہ کشمیر بہت خوب صورت ہے ہر جانب ہریالی ہی ہریالی ہے اور سندھ......! لیکن سندھ کے لوگوں کے دل بہت بڑے ہیں۔ یہ تو تمہیں یہاں آکر اندازہ ہوگیا ہوگا یہ بات بھی خراب ہے کہ تمہیں میری کہانی پڑھنے کا ٹائم نہیں مل رہا ہے۔ فٹافٹ پڑھ کر رائے دو۔ ورنہ......! اب تم بھی منہ بنا کے کہوگی۔ ''آپ پھر ڈانٹ رہی ہیں۔'' میں پیار بھی تو تم سے اتنا ہی کرتی ہوں۔ اسی لیے سرزنش بھی زیادہ کرتی ہوں۔ ریحانہ سعیدہ نے لکھا ہے کہ طاہرہ بڑی حسرت سے کہتی ہیں کہ ایسے سیوک ہمیں بھی مل جائیں۔ میری چندا اللہ سے پناہ مانگو ایسے سیوک اچھے نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں بہنوں کو اپنی امان میں رکھے۔ نوید اسلم نے اللہ دتہ عابد کی شادی کی اطلاع دی ہے۔ بھئی ہماری جانب سے بھی مبارک باد قبول ہو۔ لگتا ہے محفل کے ساتھیوں سے ناراض ہیں ورنہ یہ خوش خبری وہ خود بھی سنا سکتے تھے۔ خیر جناب ہماری جانب سے دعائیں ہی دعائیں جہاں رہیں خوش رہیں اور پاکستان کی آبادی میں اضافہ کریں۔ ریاض حسین قمر دیکھا نا عصمت اقبال خفا ہوگئیں۔ بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں تو بہنیں دکھ سکھ کی رازداں ہوتی ہیں۔ عصمت

آپ بھی میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ عبدالمالک کیف تم نے سرورق کے بارے میں یہ کیا کہہ دیا۔ اتنے نازک دل کے مالک ہو کہ ایسے سرورق سے ڈر جاتے ہو۔ بھئی اب بڑے ہو بھی جاؤ۔ ویسے میرے خیال میں نئے افق کے مزاج کے اعتبار سے ایسے ٹائٹل ہی موزوں ہیں۔ خواتین کی تصاویر کے ٹائٹل خواتین کے ڈائجسٹوں پر ہی بھلے لگتے ہیں۔ عالیہ انعام اپنے زبردست تبصرے کے ساتھ بہت اچھی لگیں۔ میں آج بھی تمہاری فون کال کی منتظر ہوں یا کم از کم عمران بھائی کو اپنا نمبر دے دیتیں میں خود ہی کال کرلیتی۔ مجاہد ناز عباسی تم سے سلسلے وار ناولز نہیں پڑھے جاتے لیکن پھر بھی میرا ناول پڑھ رہے ہو اس کے لیے شکریہ۔ ویسے میرا مشورہ یہ ہے کہ ہر چیز کو جلدی حاصل کرنے کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔ صبر کرنا سیکھو۔ کیونکہ اس کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ زندگی میں بھی خواہش کے مطابق ہر چیز فوراً حاصل نہیں ہوتی۔ جن لوگوں میں برداشت کا مادہ ہوتا ہے وہ بہت بہادر اور زندگی میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ عبداللہ شاہد میرے بھائی کیسے ہو شکریہ جس خلوص کے جذبے سے میں نے تم سے بات کی تھی تم نے اسے محسوس کیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا یہ جان کر کہ تنہا زندگی گزار رہے ہو۔ دیکھو ہر عورت بے وفا نہیں ہوتی۔ تمہیں دوسری شادی کرلینی چاہیے۔ ابھی اتنی عمر بھی نہیں ہے۔ ایسے کیسے زندگی گزرے گی۔ ابھی تو پھر بھی وقت گزر جائے گا۔ لیکن عمر کے آخری دور میں ساتھی کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ جب بوڑھوں کے لیے کسی کے پاس ٹائم نہیں ہوتا تو اپنا ساتھی ہی کام آتا ہے۔ یقین جانو میں تمہارا نام لے کر دعا کرتی ہوں۔ اللہ تمہیں صحت مند اور پرسکون رکھے اور ہاں میرے مشورے پر سنجیدگی سے غور ضرور کرنا۔ بھائی فقیر لنگاہ کی خدمت میں بہت سلام جناب صحت کیسی ہے۔ خیال رکھا کریں۔ بچوں کے لیے بہت دعائیں۔ ناظم بخاری میں نے تمہاری تعریف محض دل رکھنے کے لیے نہیں کی حقیقت میں تم بہت اچھا لکھتے ہو اور مجھے امید ہے تم آگے چل کر مزید اچھا لکھو گے۔ جتنا زیادہ لکھو گے تحریر میں پختگی آتی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اچھے مصنفین کی تحریروں کو بھی پڑھتے رہو۔ پڑھنے سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے میں آج بھی سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ سوچ کر کہ شاید میں بھی اچھا لکھنے لگوں۔ تمہاری پیاری سی دلہن کے لیے ڈھیر سارا پیار اور دعائیں۔ این شاہین گڑیا تمہیں کسی نے نہیں بھلایا۔ بس خط لکھتے وقت پرچہ سامنے ہوتا ہے اور خطوط میں جو بات جواب طلب ہوتی ہے اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی سچی مچی تمہیں یاد کررہی تھی۔ یہ بتاؤ تمہاری امی کی طبیعت کیسی ہے۔ انہیں میرا سلام کہنا۔ گردش اپنے حساب سے لکھ تو رہی ہوں اب تم کون سے رنگ کی بات کررہی ہو۔ وضاحت کردیتیں تو میرے لیے آسانی ہوجاتی۔ ویسے میں نے سوچا تھا کہ گردش زنجیر سے ہٹ کر ہو۔ ویسے بہت سے لوگوں کو شاید اس بات کی تکلیف ہے کہ دوسروں کی چھوڑے ہوئے ناولز میں ہی کیوں لکھتی ہوں۔ بھئی یہ سوال تو ایڈیٹر سے ہی کرنا چاہیے کہ انہیں دوسروں کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام پورے کرنے کے لیے میں ہی کیوں نظر آتی ہوں۔ جاوید احمد صدیقی صاحب بہت عرصے کے بعد تشریف لائے۔ کسی ساتھی سے بات نہیں کی۔ بس آئے جلدی جلدی میں نئے افق کی تعریف کی اور چلے گئے ایسی بھی کیا ناراضگی ہوگئی بھئی۔ اگر کسی ساتھی کی کوئی بات بری لگی ہے تو سب کی جانب سے میں معذرت کرلیتی ہوں۔ آپ کے خطوط تو محفل کی رونق ہوا کرتے ہیں۔ صحت کیسی ہے اللہ آپ کو اچھا کرے۔ یہ تو رہی ساتھیوں سے گفتگو اب نئے افق کے بارے میں بات کرلیتے ہیں۔ بہت شکریہ عمران بھائی کہ آپ نے افسانے نئے افق سے ختم کردیے مضامین کی فہرست کا صفحہ بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے نئے افق کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ٹائٹل کی بھی بات کروں گی۔ ٹائٹل ہر مرتبہ بہترین ہوتا ہے نئے افق کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اسماء الحسنیٰ کا سلسلہ بہترین ہے لیکن بہت مختصر ہوتا ہے کچھ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ سچی کہانیاں ساری بہترین رہیں۔ مغربی ادب سے انتخاب بھی اچھا تھا۔ ناول میں مجھے خالی دامن زیادہ پسند آئی ہے بہ نسبت سیوک کے۔ سیوک کی کہانی کا پلاٹ اچھا ہے۔ لیکن واقعات مزیدار نہیں ہیں۔ ان میں افسانوی پنچ زیادہ ہے۔ جو سیوک جیسی کہانی کا مزہ خراب کررہا ہے۔ اس ناول کو اسی انداز میں لکھا جائے جیسا یہ موضوع ہے یہ میری ادنیٰ رائے ہے امید ہے خورشید پیرزادہ صاحب اس پر غور ضرور کریں گے۔ بازی گر بھی اچھی ہے۔ حسام بٹ صاحب مجھے ذرا سسپنس کی کمی محسوس ہورہی ہے۔ ویسے آپ بہت بہترین رائٹر ہیں۔ خوشبوئے سخن میں عبدالحکیم ساجد کی ''ادھورا پن'' بہت پسند آئی اس کے علاوہ مجاہد ناز عباسی کی غزل بھی شاندار تھی۔ میری دعا ہے کہ اللہ کرے نئے افق اور زیادہ ترقی کرے آمین۔ خط خاصا طویل ہوگیا ہے اس لیے اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ اللہ تعالیٰ پاکستان میں امن وامان پیدا

کرے۔ عوام کے مسائل حل ہوں۔ غربت، بے روزگاری اور ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہو اور اللہ تعالیٰ ہمیں حکمران کے طور پر کوئی مرد مومن اور مرد آہن عطا کرے آمین۔ اللہ آپ سب کو آباد رکھے آمین

شہنی ارشاد...... کراچی۔ السّلام علیکم! اللہ کی رحیم و کریم ذات سے امید کرتی ہوں کہ سب بخیر و عافیت ہوں گے۔ پچھلے ماہ حاضر نہ ہو سکی۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں نے لیٹر لکھ کر شہناز آپی کے حوالے کر دیا تھا کہ آپ اپنے لیٹر کے ساتھ اسے بھی بھیج دیجیے گا لیکن انہوں نے بعد میں معذرت کر لی کہ وہ اپنا لیٹر بھی مصروفیت کے سبب لکھ نہ سکیں تو میرا بھی رہ گیا۔ اس مرتبہ نئے افق جلدی مل گیا تھا اسی لیے مطالعہ بھی ہو گیا۔ بھئی ماشاء اللہ کہنا چاہیے کسی دشمن کی نظر نہ لگے۔ اس ماہ کا پرچہ بہت شاندار رہا۔ ہر کہانی نگینے کی طرح فٹ تھی۔ تمام سلسلے بہترین لگے۔ دستک میں مشتاق انکل بجلی کے در پر دستک دیتے ہوئے نظر آئے کاش کہ یہ دستک ہمارے اعلیٰ حکام کے کانوں تک بھی پہنچ جائے لیکن ایسا لگتا ہے کہ حکمرانوں نے عوام کی آہ و فغاں کی جانب سے اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ اب بھی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہم عوام کو ریلیف دے رہے ہیں۔ بجٹ آ چکا ہے جس نے مزید عوام کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ اب تو معصوم بچے بھی خودکشیاں کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کاش کہ یہ لوگ ایک لمحہ کو یوم حساب کو یاد کر لیں جہاں کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہو گا۔ حسام بٹ صاحب نے اسماء الحسنیٰ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ ہماری معلومات میں اضافے کا موجب بن رہا ہے۔ طاہر بھائی نے اقرأ میں حیا کے موضوع پر احادیث کا بہترین چناؤ کیا ہے خوش بو سخن میں عبدالحکیم ساجد کی نظم اور راغب عثمان کیانی کی غزل پسند آئی ہے۔ لو بھئی ناز سلوش ذشے بھی آخر تشریف لے ہی آئیں۔ نازش میں تم سے ناراض ہوں تم کراچی آ کر میرے گھر کیوں نہیں آئیں۔ مجھے پتا ہے بہت مصروف ہو لیکن عالیہ انعام الہٰی اپنے بہترین اور طویل تبصرے کے ساتھ آئیں۔ آپ کا تبصرہ بہت بہترین ہوتا ہے کیسی ہیں آپ مسئلے مسائل ختم ہوئے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر مشکل کو دور فرمائے مجاہد ناز عباسی ویلکم کہنے کا شکریہ۔ بھئی ہم تو اس محفل کے پرانے باسی ہیں ہمیشہ آتے ہیں بس کبھی سستی کبھی مصروفیات آڑے آ جاتی ہیں تو غائب ہو جاتے ہیں۔ عبداللہ شاہد آپ کو کیسے پتا کہ میں پرستان گئی ہوئی تھی بھئی وہاں الیکشن تھے اور پریوں نے مجھے اپنی ملکہ منتخب کر لیا ہے۔ کہیں ناز سلوش ذشے نے تو نہیں بتا دیا وہ بھی تو تھی وہاں آپ نے مجھے بھلکڑ کا خطاب دے دیا میں بھلکڑ نہیں ہوں بلکہ پرچہ سامنے رکھ کر تبصرہ لکھتی ہوں۔ سوری آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ ویسے ارشاد صاحب نے بھی تبصرہ کیا تھا اور قریشی صاحب نے سر نہیں پکڑا ہو گا بلکہ میری غلطی پر ہنس دیے ہوں گے ہیں نا۔ عمران بھائی سے پوچھیں کہ وہ میری کہانیاں کیوں نہیں لگاتے میں تو ہر ماہ بھیجتی ہوں۔ لنگاہ انکل السّلام علیکم کیسے ہیں آپ؟ آپ کی ڈھیر ساری دعائیں چاہئیں کیونکہ...... ! عصمت اقبال عین صاحبہ شاعرہ ہیں۔ کیا کہانیاں بالکل نہیں پڑھتیں۔ اسی لیے کہانیوں پر تبصرہ نہیں کرتیں۔ ویسے آپ کا مجھے مخاطب کرنا اچھا لگا۔ ناظم بخاری آپ اور ہماری بھابی صاحبہ کیسی ہیں۔ اللہ آپ دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ انہیں میرا سلام کہیے۔ این شاہین بہت دن کے بعد آئیں خیریت تو ہے نا' امی کیسی ہیں۔ اللہ سب کی ماؤں کو سلامت رکھے۔ میری امی بھی بیمار ہوتی ہیں تو میرا حال بہت ہی خراب ہوتا ہے ابو تو دنیا سے چلے گئے۔ اللہ امی کو سلامت رکھے۔ ماں باپ جیسی ہستیاں اور نعمت دنیا میں اور کوئی نہیں۔ جاوید انکل روٹھے روٹھے سے تھے یا بہت جلدی میں تھے۔ انکل کیا ہو گیا آپ کو۔ کیا قلم گم ہو گیا تھا جو اتنا مختصر خط لکھا۔ کہیں تو بھجوا دوں؟ آ کاش بخاری کیسے ہو کہاں ہو۔ اپنا حال احوال بیان کرو۔ نئے افق کے بہت سے پرانے ساتھی غائب ہیں۔ سب کی یاد آ رہی ہے۔ اللہ دتہ عابد کی شادی کا پتا چلا بھائی بھابی بہت بہت مبارک ہو۔ اب تو آپ کو یہ بھی ہوش نہیں ہو گا کہ سورج کب نکل رہا ہے اور کب غروب ہو رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ سدا خوش رہیں۔ اچھا بھئی اجازت دیں اگر کوئی مخاطب ہونے سے رہ گیا ہے تو معاف کر دیں۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے میرے لیے دعا ضرور کریں۔ اسعد علی کے ایگزام ہو رہے ہیں ان کی کامیابی کی بھی ضرور دعا کریں۔ والسّلام

مجاهد ناز عباسی...... سنجر پور۔ جناب عمران احمد صاحب السّلام علیکم! آج پھر ایک نئی پریشانی جو عورتوں کے لیے شروع ہوئی ہے۔ پہلے وطن کارڈ کے نام پر لوگوں کو لوٹا جا رہا تھا اس دفعہ تو لوگوں نے عورتوں کو بھی نہیں بخشا آج کرپٹ لوگ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی آڑ میں عورتوں سے پیسے لے رہے ہیں کہ ہم آپ کو انکم سپورٹس کے پیسے دلوائیں گے عورتیں بے چاری مجبور ہوتی ہیں انہیں آسرا ل جاتا ہے کہ ہمیں کچھ نہ کچھ روپے ملیں گے چلو کچھ تو گھر کا گزارہ ہو جائے گا۔ شروع میں

جب بے نظیر انکم کے فارم لکھے گئے تو فی فارم کا ایک سو روپیہ لیا گیا۔ اس کے بعد پھر عورتوں کو لوٹنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا کہ ہر گاؤں میں ایک لڑکا لیپ ٹاپ لے کر گیا کہ انکم سپورٹ والے فارم چیک کرائیں۔ تاکہ آپ کو پتا چل جائے آپ کا فارم منظور ہو چکا ہے یا نہیں تو وہ فارم چیک کرنے کے 50 روپے فی فارم لیتا تھا۔ اس کے بعد جب کسی کے پیسے منظور ہو گئے تو پیسے لیتے وقت ڈاکخانہ کے باہر پھر ایک نئی چال کہ وہ ایجنٹ ہر عورت سے دو سو روپے لے رہا ہے اور اسے پیسے دلوا رہا ہے۔ اب پھر یہ سننے میں آیا ہے کہ اب بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام والے جن عورتوں نے پیسے لیے ہیں انہیں اے ٹی ایم کی شکل میں ایک کارڈ ملے گا۔ اب پریشانی یہ ہے کہ عورتوں کو اے ٹی ایم کارڈ دلوائے کون؟ اب عورتوں کو صبح سے شام تک ایک لائن میں کھڑا ہونا پڑتا ہے اور وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ اتنی چپکی ہوتی ہیں کہ بیچ میں ایک انچ کی بھی جگہ نہیں ہوتی اور اگر زیادہ رش ہو جائے تو وہاں کی انتظامیہ عورتوں کو دھکے دے کر باہر نکال دیتی ہے یا پھر انہیں سخت طنزیہ الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔ سنا ہے جب عورتوں کا زیادہ مجمع ہو جائے تو ان پر مار بھی برسائی جاتی ہے۔ اللہ معاف کرے یہ آج ہمارے ملک میں عورتوں کی اتنی بے حرمتی کیوں ہو رہی ہیں۔ کیا ہمارے اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہم عورتوں کو ذلیل کریں۔ کاش ہمارے ملک میں اتنی غربت نہ ہوتی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ہمیں عورتوں کی عزت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اب آتا ہوں رسالے کی طرف مشتاق احمد قریشی صاحب ہمارے ہاں تو سب سے زیادہ لوڈ شیڈنگ ہے کل میں نے بھی ٹھان لی تھی کہ آج سارا دن بجلی کی ٹائمنگ نوٹ کروں گا کہ کتنے گھنٹے موجود رہی ہے اور کتنے گھنٹے بند صبح 6 بجے سے لے کر رات 12 بجے تک صرف 49 منٹ موجود ہوئی۔ اس کے بعد پھر رات گئے 12 سے صبح 6 تک میں تو سو گیا تھا مطلب 18 گھنٹے میں صرف 49 منٹ لائٹ تھی۔ 17 گھنٹے اور 11 منٹ بند تھی۔ واہ رے ہماری حکومت سلام ہے آپ کو ناز جی کی طرف سے۔ ناز سلوش ذشے وعلیکم السّلام محمد اسلم جاوید بھائی آپ نے ٹھیک کہا کہ رسالے کا ٹائٹل تبدیل کرنا چاہیے۔ ریحانہ سعیدہ نے پاکستان کے حالات پر تھوڑی بحث کی لیکن باجی ہم کیا کر سکتے ہیں ہم سب تو ان حکمرانوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں۔ بہت شکریہ ریاض حسین قمر صاحب آپ کا کہ آپ نے میری نظم کو پسند کیا۔ عبدالمالک کیف صاحب نے بھی حاضری دی (واہ بھئی واہ) باجی عالیہ آپ صرف دعا کریں کہ ہمارا پیارا ملک ایک اسلامی ملک بن جائے۔ ہمارے ملک میں غربت، بیروزگاری اور ڈرون حملے ختم ہو جائیں۔ سید عبداللہ شاہد السّلام علیکم و رحمتہ اللہ بعد دعائے سعادت مندی نیک اطواری کے واضح ہو۔ فقیر محمد صابر لنگاہ جناب کیسے مزاج ہیں آپ کے۔ انکل آج کل آپ کے میسج آنا کم ہو گئے ہیں کیوں انکل ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا؟ عصمت اقبال عین کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا۔ ناظم بخاری صاحب ان شاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ باجی شاہین وعلیکم السّلام اور میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میری غزل کو پسند کیا۔ جاوید احمد صدیقی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ محمد ارشاد قریشی صاحب آپ کیوں غیر حاضر ہیں بھائی خیر تو ہے۔ فاطمہ جی آپ صرف نئے افق پڑھتی ہیں لیکن پلیز کبھی لکھنے کی جسارت بھی کر لو۔ اقرأ میں جناب طاہر قریشی نے بے حیائی سے بچنے کے لیے بہت اچھی تعلیم دی۔ خوش بو سخن کا سارا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔ ذوق آگہی' افسانچہ' بہت خوب تھا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے رہے۔ ''گردش'' ٹاپ پر رہی۔ سچی کہانیوں میں سانپ بہت پسند آئی۔ بہت مبارک ہو انجم فاروق ساحلی صاحب باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ آخر میں تمام نئے افق پڑھنے والوں اور تمام افق کے رائٹرز اور تمام افق کے اسٹاف کو میری طرف سے سلام۔ والسّلام آپ کی محبتوں کا مقروض۔

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران بھائی السّلام علیکم امید ہے آپ بمعہ اپنے تمام اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ابھی خط لکھنے سے پہلے ٹیلی ویژن کے ایک نیوز چینل پر اغوا شدہ بچوں کے بارے میں رپورٹ دکھائی جا رہی تھی۔ ان بچوں کے انٹرویوز اور ان کے وہ حالات جن کی وجہ سے وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اتنی چھوٹی عمروں میں روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر دھکے کھاتے رہے ہیں اور پھر کس طرح وہ بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اس کے پیچھے بھی ہمارے معاشی، معاشرتی سیاسی اور تعلیمی نظام کی پس ماندگی بے روزگاری گھریلو نظام کی ابتری اور غربت بول رہی ہے۔ بچوں نے جو اپنے حالات بتائے اور جس مقصد کے لیے انہیں اغوا کیا گیا یقین جانیں سن کر شدید دکھ ہوا۔ اسی طرح کے بے شمار انوکھے واقعات جرائم قتل و غارت کی خبریں جب دیکھی اور سنی جاتی ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہم کس

معاشرے کے لوگ ہیں کیا ہم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں اس وقت بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ یا یہ ساری مصیبتیں اور آزمائشیں ہمارے اوپر نازل ہو رہی ہیں۔ اس میں ایک بات اور بھی ہے شاید ہمارے جذبات و احساسات کو تیزی سے بھڑکانے اور احساس عدم تحفظ اور مایوسی پیدا کرنے میں میڈیا نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ کوئی بھی مجرم جس نے سنگین جرم کیا ہو تو تمام نیوز چینلز باری باری اس سے انٹرویوز کرنے اور اس سے جرم کو کھول کھول کر اگلوانے میں آگے آگے ہوتے ہیں۔ مقصد شاید یہ ہوتا ہے کہ یہ جرم سب کو زبانی یاد ہو جائے اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ ان جرائم کو باقاعدہ ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ جو لوگ خبر کے طور پر مس کر گئے ہیں تو وہ یہ ڈراما ہی دیکھ لیں۔ خدا جانے نیوز چینلز والے ہم پاکستانیوں کو کیا بتانا چاہتے ہیں لوگوں میں خوف و ہراس اور عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جرائم و حادثات کے بارے میں جو خبریں آتی ہیں ان پر ڈرامے بنانے اور لوگوں کو طریقے سمجھانے کے بجائے ان کے بارے میں ٹاک شوز کیے جائیں جن میں ایسے لوگوں کے نفسیاتی معاشی اور تعلیمی مسائل پر بات کی جائے اور اصلاحی پروگرام دکھائے جائیں تاکہ ان کو دیکھ کر لوگ سبق سیکھیں نہ کہ مایوسی کا شکار ہوں۔ میڈیا کی طاقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر حقیقت یہ ہے کہ جس میڈیا کو ابلاغ کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے تھا وہ کام تو یہ ہی کر رہا ہے لیکن ابلاغ خبروں کا نہیں کسی اور چیز کا کر رہا ہے۔ میڈیا کا کردار لوگوں میں تعلیمی شعور قومی استحکام اور یکجہتی پیدا کرنا ہے اور آخر میں تفریحی پروگرام کا نمبر آتا ہے ہمارے ہاں یہ ترتیب الٹ ہو گئی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیں بدل گئی ہے۔ یہ کیوں ہوئی اور کس کے کہنے پر ہوئی اس جانب ہمارے سنجیدہ طبقے اور ارباب اختیار کو سوچنا چاہیے اور میڈیا کا قبلہ درست کیا جانا چاہیے۔ فحش ویب سائٹس ایف ایم ریڈیو پر قابل اعتراض گفتگو اور عریاں اشتہارات کے لیے ضابطہ اخلاق ہونا چاہیے۔ کس کس سے کیا کیا گلہ کریں یہ باتیں تو نہ ختم ہونے والی ہیں۔ خدا ہمارے ملک پر کرم فرمائے اور ہمیں مثبت سوچ سے نوازے۔ نئے افق کے تازہ شمارے کا مطالعہ جاری ہے۔ اس مرتبہ شمارے میں بزم سخن کی کمی تھی کیا وجہ ہوئی؟ گفتگو میں ناز سلوش، محمد اسلم جاوید، ریحانہ سعیدہ، سید عبداللہ شاہد، فقیر محمد بخش، ناظم بخاری، این شاہین اور جاوید احمد نے حاضری لگوائی سب کے تبصرے خوب تھے آخر میں سب کے لیے۔

سدا خوش رہیں سب دل نے مرے یہ دعا کی
پھر ہوگی ملاقات گر زندگی نے وفا کی

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السّلام علیکم ماہ جون کا شمارہ اس بار ذرا لیٹ یعنی 22 مئی کو ملا۔ اپنے محبوب رسالے کے انتظار میں جس طرح ہم نے گھڑیاں گزاریں اس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ بہرحال سب سے پہلے فہرست پر نظر ڈالی۔ اپنی ارسال کردہ کہانی نہ پا کر مایوسی ہوئی اور سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میرا خط بھی غائب تھا۔ چلیں جو کچھ ہوا اس کو یہیں چھوڑتے ہیں آگے بڑھتے ہیں۔ مشتاق احمد قریشی صاحب اس بار "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" لے کر آئے۔ بجلی کا مسئلہ دن بدن گمبھیر اور ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ جوں جوں گرمی بڑھ رہی ہے بجلی کم سے کم ہو رہی ہے۔ حکمران اس مسئلہ کو حل کرنے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ اب تو صرف یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ خدا بد چلن اور بے ایمان حکمرانوں سے نجات دلائے آمین۔ اب بڑھتے ہیں گفتگو کی طرف۔ کشمیر کی حسین وادیوں سے بہن ناز سلوش ذشے چار پانچ ماہ بعد تشریف لائی ہیں۔ ہم آپ کو نہیں بھولے ہر ماہ محفل میں آپ کا خط ڈھونڈتے رہے ہیں لیکن آپ کے موجودہ خط سے یہ محسوس ہوا کہ جیسے آپ مجھے بھول گئی ہیں آپ کا تبصرہ جامع اور موثر ہے محمد اسلم جاوید کیسے ہو بھائی آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ لوگ آج کل خوب صورت سرورق دیکھ کر رسالہ خریدتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بہرکیف اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہمارا رسالہ اتنی کم قیمت میں سب سے بہترین ہے۔ ریحانہ سعیدہ بہن بھی اپنے مختصر سے خط کے ساتھ موجود ہیں۔ ریاض حسین قمر صاحب یاد آوری اور خط پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کا ارسال کردہ شعر پسند آیا۔ عبدالمالک کیف بھائی میں تو آپ کو ہر خط میں یاد کرتا ہوں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے آمین۔ عالیہ انعام بہن ہمیشہ کی طرح کٹیلے اور خوب صورت لفظوں کی مالا میں پروئے خط کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ نے ہر بات کو خوب بیان کیا ہے۔ کس کس بات کا رونا رویا جائے۔ انسانی خون پانی سے بھی سستا ہے۔ سید عبداللہ بھائی آپ دکھی نہ ہوا کریں۔ صبر کریں اور کثرت سے ذکر الہٰی کرتے رہا کریں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھولنے کی کوشش

کریں۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ اس بار فقیر محمد بخش صابر لنگاہ مختصر خط کے ساتھ محفل کی شان بڑھا رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے میں ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں ناظم بخاری صاحب شکر ہے آپ محفل میں آئے تو۔ میں آپ کی طرف سے فون کا منتظر رہوں گا۔ این شاہین اور جاوید احمد صدیقی بھی محفل کو چار چاند لگا رہے ہیں۔ آتے رہا کریں۔ اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی طرف۔ اس بار شعروں سے سجی محفل بزم سخن کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ صفحہ بہ صفحہ بکھری کترنیں پسند آئیں۔ خوش بو سخن میں سب غزلیں اچھی ہیں۔ اس بار اس محفل میں زیادہ نکھار نظر آیا۔ ذوق آگہی میں شہناز بانو کی چھکلی سوچ کے در وا کر رہی ہے۔ بہن ویل ڈن زندگی کا نغمہ (مجاہد ناز عباسی) معلومات کا خزانہ (پروفیسر واجد نگینوی) اور دیگر تحریریں بھی پسندیدگی کی سند پا گئیں اب باری آئی ہے کہانیاں کی۔ سچی کہانیوں میں آبرو والے، تسلسل، انجانی محبت اور انسانی اسمگلر زیادہ پسند آئیں۔ باقی بھی اچھی ہیں۔ ناولوں میں سیوک اور خالی دامن اچھی بلکہ بہترین ہیں۔ حسام بٹ کی بازی گر اور بہن شہناز بانو کی گردش کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ دونوں سلسلے وار کہانیاں اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اب اجازت اللہ حافظ۔

انجم فاروق ساحلی...... لاہور۔ آداب امید ہے آپ اور دیگر احباب بخیر و خوبی ہوں گے۔ ٹائٹل اس بار سبزے اور ہریالی سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن پچھلا منظر کچھ واضح نہ تھا ادارتی گفتگو فکر انگیز تھی۔ محترم قارئین کو ساتھیوں کا حال احوال سیاسی ماحولیاتی گفتگو کے علاوہ نئے افق کی کہانیوں اور مواد پر تبصرہ و رائے کو ترجیح دینی چاہیے۔ جن خواتین و حضرات نے "سانپ" کو پسند کیا ان کا بے حد مشکور ہوں کہانیوں میں تسلسل، انسانی اسمگلر، رشتا، فرار اچھی معلوم ہوئیں۔ گردش بھی خوب چل رہی ہے۔ سیوک بھی اپنے مخصوص انداز میں خوب جا رہا ہے۔ خوش بو سخن میں عبدالحکیم ساجد، رانا پرویز احمد، امیر حمزہ چمن آباد کا انتخاب جاذب نظر تھا۔ تعظیم لنگاہ صاحب کی بہترین شعری انتخابی کاوش تھی۔ ذوق آگہی کی مختصر تحریریں بھی خوب تھیں۔ کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ سانپ شائع کرنے کا شکریہ۔ ناز سلوش ذشے صاحبہ کہانی کو دلچسپ قرار دینے کا شکریہ۔ (گاڑی کے بجائے فوزیہ کو موٹر سائیکل فوراً ہی گھر سے مل گئی تھی اس لیے فوری ضرورت کے تحت اس سے کام چلایا گیا اور عمر اور ماحول کی پروا نہ کی گئی آج کل تو خواتین ہر کام میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ فوزیہ کو ممبئی کا موٹر سائیکل چلانا اچھا معلوم ہوتا تھا موقع ملتے ہی اس نے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر لی۔ فوزیہ اتھلیٹ رہ چکی تھی اس لیے اس کے اندر پچاس برس کی عمر میں بھی پھرتی موجود تھی۔ بڑے قریشی صاحب نے بھی دستک میں ملکی حالات کا بہترین جائزہ قلمبند کیا۔ لوڈ شیڈنگ سے ملک آگے کے بجائے پیچھے جا رہا ہے۔ اللہ اس ملک کے لوگوں کو سیدھی راہ دکھائے۔

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد۔ السّلام علیکم ورحمہ میں خدائے مطلق سے امید واثق رکھتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ مجلس ادارت میں مذکورہ احباب اور دیگر ارکان نئے افق کے لیے سلام پرخلوص اور نیک خواہشات اس بار آنچل کے ریفرنس سے نئے افق موصول ہوا۔ بہر غرض اس مرتبہ کا سرورق سرسبز جنگلات اور ذیل میں لکھی گئی روشنائی سے جگمگاتے جملوں کی وجہ سے اچھا لگا۔ یہ انداز بھی رسالے کے لیے نیا اور منفرد ہے۔ خوب صورت فہرست پر بے چینی سے نظریں دوڑائیں تاہم اس مرتبہ بھی اپنی کوئی کہانی شامل اشاعت نہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کمپنی اور ترازو کا قلق تو گہرا ہو چلا ہے لیکن حصار جسے چار ماہ ہو رہے ہیں اسے بھی شائع نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری ہست و بود نے خانقاہ تحکمانہ مزاج اور اس کے مکر و فریب کو انتہائی کسمپرسی میں بھگتا ہے اور استحصالی رویوں بحالت مجبوری آبلہ پائی سے گزرا ہوں لیکن اس کے قطع نظر بحیثیت مسلمان کے آپ کو حقیقت پسند اور منصفانہ مزاج کا حامل سمجھتا ہوں۔ اس سوچ و فکر کے باوجود آپ میری کہانیوں کو التوا میں رکھے ہوئے ہیں۔ گزشتہ خط کے ساتھ میں نے افسوس کے اظہار کے ساتھ نئی کہانی شب خون بھجوائی تھی کم و بیش ڈیڑھ دو ماہ تک یہ عنوان صفحات پر لکھتا رہا لیکن آپ نے رسید دینا ضروری نہیں سمجھا۔ آپ کیسے عمران احمد ہیں جناب محترم؟ برادر اقبال بھٹی صاحب سے معانقہ و مصافحہ اب سوالیہ نشان لگتا ہے۔ کیا یہ دکھ ازلی رہے گا کہ آپ محض 50 روپے میں 25000 ہزار روپوں کا تازیانہ دل پر لگاتے رہیں گے۔ دھوبی گھاٹ کی دھلائی اور کتے کی پٹائی کا کھیل آپ کسی بڑے شہر میں بھی کھیل سکتے ہیں کراچی بہت پیارا چہیتا اور کماؤ پوت ہے تو حیدر آباد معتوب اور گناہ گار کیوں ہے؟ آپ کو صبر و برداشت کی بہترین مثال سمجھتا ہوں اس لیے ناراض نہ ہوئے گا۔ پندار ہر دفعہ اپنے محیط کا رونا روتا ہے۔ ☆ (عبداللہ شاہد صاحب! قدرے تلخی و ترشی لیے خط کا شکریہ۔

حصار اگست کی فہرست میں شامل ہے۔ ہم نے آپ کو آپ ہی کے مفاد میں مشورہ دیا تھا کہ آپ مختصر کہانیاں بھی لکھیں جو جلد شائع ہوجاتی ہیں جبکہ طویل کہانیوں کے لیے فہرست میں جگہ بنانا فوری طور پر مشکل ہوجاتا ہے)۔ اب تازہ شمارے سے متعلق مختصر تبصرہ۔ بابا مشتاق احمد قریشی کی خدمت میں سلام و نیک تمنائیں۔ انہوں نے اس بار دستک کے ذریعے بجلی کے بحران پر عوامی غم و غصے کی جانب توجہ دلاتے ہوئے موجودہ حکمرانوں کو موثر انداز میں تنبیہ کی ہے۔ حسب عادت سب سے پہلے مغربی تراجم کا مطالعہ کیا۔ ''رشتہ'' (احمد صغیر صدیقی) عمدہ اسٹوری لگی۔ روچین کے نیک جذبات اور وطن پرستی کا مذاق اڑانے والے امریکی اور ایجنسی کو سزا دی جانی چاہیے۔ ''فرار'' ایک ناقابل یقین تحریر تھی۔ بچی کہانیوں میں محمد یعقوب بھٹی کی ''تسلسل'' پہلے نمبر پر دوسرے نمبر پر خلیل جبار کی ''بدانجام'' اور ''انجانی محبت'' جسے عثمان خالق نے تحریر کیا تیسرے نمبر پر رہی۔ دیگر کہانیاں اوسط درجے کی تھیں۔ سلسلے وار ناول میں ''گردش'' اپنی دلچسپ موشگافیوں اور ہمہ جہتی کی بدولت ٹاپ پر چل رہی ہے۔ بجیا شہناز بانو نے سرمئی سے وابستہ رشتوں کو جس انداز میں قلم بند کیا ہے بہت عمدہ ہے بلکہ لاجواب ہے بجیا کے لیے میری پرخلوص دعائیں۔ اللہ عزوجل ان کے قلم کی جولانی کو تاحیات زندہ و تابندہ رکھے آمین۔ حسام بٹ کی ''بازی گر'' میں فرحانہ کی محبت اسداللہ کے گلے کا طوق بنتی جارہی ہے۔ مجھے ایسی محبت کبھی پسند نہیں آئی جو آدمی کے لیے وبال جان بن جائے۔ ''سیوک'' کا دوسرا حصہ بھی ذوق و شوق کو دوبالا کررہا ہے۔ خورشید پیرزادہ کو مبارک باد۔ نیا ناول ''خالی دامن'' پہلی قسط قدرے سست ہونے کے باوجود اچھی لگی۔ کرم دین کی چوری اور چلے کا انجام پڑھنے کے لیے انتظار رہے گا۔ اس بار تبصرہ مختصر کررہا ہوں اس لیے گفتگو کے تمام دوستوں اور ساتھیوں اور تبصرہ نگار خواتین کی خدمت میں سلام اور نیک خواہشات۔ ذشے کی چنچل گفتگو جاوید صدیقی کی واپسی ریاض حسین کی محبتوں کا اور ناظم بخاری کی پرخلوص یاد آوری کا شکریہ۔ ذشے کے لیے نیک تمنائیں اور دعائیں۔ امید ہے کہ آپ میں سے کوئی خفا نہیں ہوگا۔ بلکہ درگزر کیا جائے گا۔ عمران بھائی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ناز سلوش ذشے ...... میر پور آزاد کشمیر۔ السلام علیکم۔ حسب وعدہ پھر شامل گفتگو ہوں۔ نئے افق چند روز قبل ہی موصول ہوا ہے۔ ٹائٹل کے علاوہ باقی سب ٹھیک ہے۔ پہلے صفحہ پر آنچل کی جھلک دیکھ تو لی۔ مگر آنچل ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ فہرست میں سوائے شہناز بانو کے اس بار سارے مرد براجمان تھے۔ یہ تو ہم لڑکیوں کے ساتھ کھلا تعصب ہے عمران بھائی۔ اپنا نام نہ پاکر آپ سوچ سکتے ہیں مجھے کتنا غصہ آیا ہوگا۔ کیونکہ پچھلے فون پر آپ نے کہا تھا ''شہر آزار'' کمپوزنگ کے مرحلے میں ہے۔ پھر نجانے کمپوزنگ کے مرحلے سے باہر آکر وہ شمارے کی زینت کیوں نہیں بنی۔ بہرحال آف موڈ کے ساتھ برے برے منہ بنانی میں دستک پر پہنچی۔ یہاں مشتاق انکل ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے نظر آئے۔ یقین مانیں میں نے تو اے سی روم میں سونا ہی چھوڑ دیا کہ بجلی ضائع نہ ہو۔ مگر بجلی ضائع تو تب ہوگی جب وہ آئے گی اور جب تک یہ حکومت ہے اس کے آنے کے امکانات نظر تو نہیں آتے۔ بہرحال اداریہ پرفیکٹ رہا۔ گفتگو میں اپنے اور غیر ملک کے کارنامے پڑھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ کیا پاکستان میں اب انسانی زندگی کتوں سے بھی بدتر ہوگئی ہے؟ چار سالوں میں صدارتی کرسی کا قرعہ اپنے نام نکلتے دیکھ کر آف موڈ یکدم آن ہوگیا۔ کہانی پر قینچی چلا کے عمران بھائی نے صدارتی کرسی کی ٹافی سے آخر مجھے بہلا ہی لیا۔ اس بار گفتگو میں چند اور نئے نام بھی شامل رہے۔ ویلکم نیو کمرز یہ اور بات کے کسی نے اس کشمیری سیب کو اپنی دعا سلام میں یاد نہیں رکھا۔ عبدالمالک کیف بھائی آپ بھی کہانیوں کا رونا رو رہے ہیں...... ہاہاہاہا...... یہ بڑا دکھی موضوع ہے۔ عالیہ انعام ریحانہ سعیدہ این شاہین چلیں گفتگو میں کہیں تو اپنی جنس دیکھنے کو ملی۔ یہ شہناز بانو اور تہنی کہاں غائب ہیں۔ دونوں سہیلیوں کی اکٹھی چھٹی نہ نہ فائن کردوں گی ورنہ لوٹ آئیں۔ مجاہد ناز عباسی کراچی جاتے ہوئے صادق آباد سے گزری تو تھی میں مگر آپ کے بجائے کالج ڈرامے والی ''نیناں فرام صادق آباد'' کا خیال ضرور ذہن میں آیا تھا۔ آپ کا دعوت دینا ہی بہت معنی رکھتا ہے۔ سید عبداللہ شاہد بھائی میری دعا ہے کہ خدا آپ کو جلد اپنے بچوں سے ملوائے اور پھر سے آپ کے آنگن کی خوشیاں لوٹ آئیں۔ کافی عرصے سے آپ نے کوئی کہانی نہیں لکھی وجہ......؟ عصمت سوری آپ کا نام ابھی پڑھا میں نے منگلا تو پڑوس میں ہے میرے کبھی چکر لگائیے گا میری طرف۔ میں ابھی تک منگلا کی صرف بوٹنگ کلب اور واپڈا کالونی ہی دیکھ پائی ہوں۔ اس دفعہ تو ناظم بخاری بھی حاضر ہوئے۔ بڑے پرانے ساتھی ہیں ہمارے اسی طرح اپنے خط میں میں نے جاوید احمد صدیقی انکل کو یاد کیا۔ اس بار وہ بھی

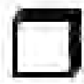
حاضر ہوئے تو مگر بہت مختصر خط کے ساتھ۔ اسماء الحسنیٰ اور اقرا ہمیشہ کی طرح ایمان افروز رہا۔ سلسلے وار کہانیوں کو ہاتھ لگائے بغیر شرافت سے مغربی ادب کی طرف بڑھی میں۔ ''رشتہ'' اچھی کہانی رہی۔ مگر بے چارے کو بہت عزت کے ساتھ الو بنا کر لوٹا گیا۔ غیر ملکی بھائی و یار غیر میں ایسی چال بازیوں سے محتاط رہیں کٹ پیس میں دیوالی کی صفائی پڑھ کر ہنسی آگئی خود میری چھوٹی بہن صفائی کے وقت سارے کاغذ پھاڑ دیتی ہے لیکن جب میں منع کروں تو کہتی ہے۔ ''اس گھر میں تو کوئی صفائی بھی نہیں کرنے دیتا۔'' ''فرار'' کو بڑے تجسس کے ساتھ پڑھا میں نے مگر اس کا اینڈ کاش آگے سلاخیں نہ ہوتیں۔ ''سانپ'' کہانی جہیز کے موضوع پر لکھی گئی۔ انداز اچھوتا تھا۔ سو بہت پسند آیا۔ ''تسلسل'' میں پہلے ہی صفحے پر گھڑیوں کا ذکر پڑھ کر مجھے لگا کہ کہانی کے تھیم پر یہ ضرور اثر انداز ہوں گی۔ کیونکہ جب میں نے برسوں قبل انکل جی کہانی لکھی تھی تب اس میں انکل کی گاڑی کو بہت ہائی لائٹ کیا تھا مگر کہانی کے آخر میں اس کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ تب تادیب کے ایڈیٹر حمید قیصر انکل نے مجھے کہا تھا ''بیٹا جس چیز کو ہائی لائٹ کرو اس کا کہانی میں استعمال بھی کرو۔ اگر تم ایک کمرے کا سین دکھاتی ہو جہاں دیوار پر برسوں پرانی تلوار لٹک رہی ہے۔ کہنے کو یہ بے کار ہے لیکن کمرے میں موجود دو نفوس کی آپس کی لڑائی میں تم یہ دکھاؤ کہ ایک بندے نے اس بے کار تلوار سے دوسرے کا خاتمہ کردیا۔ یہی چیز کہانی کے تھیم کو پختہ کرتی ہے۔'' اور میں نے دیکھا تسلسل میں یہی سب ہوا۔ زین نقوی کی ''آبرو والے'' کیا انت کہانی لکھی ہے آپ نے۔ واقعی ہم جب بھی کسی مسئلے پر آواز اٹھانے لگتے ہیں کہیں نہ کہیں کوئی عزت والا کوئی آبرو والی ہاتھ جوڑے التجا کرتے نظر آتے ہیں کہ خدارا ہماری عزت کو اور تار تار مت کرو۔ پھر بھلا تبدیلی آئے کیسے۔ بس جی اس کے علاوہ اور میں نے کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ ویسے عمران بھائی اس بار اشعار کا قحط تھا جو بزم سخن پورے کا پورا غائب رہا۔ یاد آیا برسوں پہلے احوال قارئین کے نام سے آپ نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا وہ کیوں بند کردیا ہے؟ اچھا اب اجازت۔

عبدالمالک کیف ...... صادق آباد نئے افق 18 تاریخ کو ہی مل جایا کرتا ہے مگر اس دن میں ''چوہدری نیوز ایجنسی'' صادق آباد پہنچا تو انہوں نے کہا ابھی تک نہیں آیا نئے افق۔ پھر 23 تاریخ کو اسی نیوز ایجنسی پہنچ گیا تو پتا چلا کہ نئے افق آیا بھی تھا اور ختم بھی ہوگیا ہے۔ پہلے تو غصہ آیا پھر خوشی بھی ہوئی کہ چلو سرکولیشن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ سو نئے افق کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ پھر میں دس پندرہ قدم پر موجود اتفاق بک اسٹال پر پہنچا تو دور سے ہی ''نئے افق'' سرورق کی پیلی رنگت کے ساتھ کسی منچلی دوشیزہ کی طرح اپنے جوبن کے عروج کے ساتھ اپنی آب و تاب سے چمکتا نظر آیا جانے کیوں اس بار ڈائجسٹ کچھ زیادہ ہی پیارا لگ رہا تھا۔ ایمان سے عمران بھائی کوئی جھوٹی تعریف نہیں کررہا۔ اپنی محبت کا اظہار تو کرنا چاہیے نا ورنہ پچھتانا پڑتا ہے۔ دوسری بات نئے افق سنجر پور جو میرا شہر ہے وہاں نئے افق نہیں ملتا۔ اس لیے مجھے صادق آباد جانا پڑتا ہے۔ ہاں مگر ''آنچل ڈائجسٹ'' ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے۔ آپ سے ایک گزارش ہے اس میں ہمیں بھی لکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ وہاں صرف رائٹرز بہنیں چھائی ہوئی ہیں۔ (یا انہیں ٹھیکے پردے رکھا ہے) کیوں نئے افق میں بھی بھائی بہن ساتھ مل کر پرچے کی خوب صورتی اور تحریروں کو معیاری بنا رہے ہیں۔ ☆ (آنچل والی بہنیں آنچل میں کسی بے آنچل کو برداشت نہیں کرتیں)۔ ''دستک'' مشتاق احمد قریشی صاحب نے بجلی کی لوڈشیڈنگ اور ملکی حالات کا آئینہ دکھایا مگر لگتا ہے حکومت تب تک نہ سدھرے گی جب تک کہ عام آدمی کا ہاتھ اس کے گریبان تک نہ پہنچے گا۔ گفتگو میں عمران بھائی نے ایک دو خبروں پر تبادلہ خیال کیا آج کل تو ایسی ایسی خبریں رپورٹ ہورہی ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ پہلا خط ناز سلوش ذشے آزاد کشمیر سے۔ بھئی مجبوریاں کام دھندے ہر کسی کو ہوتے ہیں۔ بس نئے افق کا ساتھ نہ چھوڑیں دنیاداری بھی چلتی رہے اور دل و روح کے سکون کے لیے بھی بندہ نئے افق جیسے دوست کا ساتھ نبھاتا رہے۔ ''انوکھا انتقام'' پر آپ کی تنقید نظر سے گزری مانا کہ کہانی لکھنا مشکل ہے مگر کوشش جاری رکھنی چاہیے اور میں نے پہلا قدم رکھ لیا ہے آئندہ معیاری بنانے کی کوشش کروں گا۔ مگر آپ یہ دعویٰ کیسے کرسکتی ہیں کہ آپ کو سچی کہانی نہیں لگی۔ کیا آپ نے ایسا کوئی آلہ ایجاد کرڈالا ہے کہ جس سے سچ اور جھوٹ میں پرکھ کی جاسکے۔ محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے محو گفتگو تھے۔ محترم کیا حال چال ہیں۔ انوکھا انتقام کو پسندیدگی کی نگاہ بخشنے کے لیے آپ کی نوازش۔ تیسرے نمبر پر موجود افق نامہ لاہور سے ریحانہ سعیدہ کا تھا۔ آپ نے قربانیوں کا ذکر کیا اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد ہم لوگ انقلاب کا ایسا دور دیکھنے والے ہیں کہ جب ہمارے پیارے پاکستان میں خوشحالی امن اور صحیح معنوں میں بھائی چارہ قائم ہوگا اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا دینی فریضہ ہوگا۔ اللہ کرے

ہمیں یہ دن دیکھنا جلدی نصیب ہو آمین۔ نوید اسلم منچن آباد بھائی یونہی ہر ماہ حاضری دیا کرو آپ منچن آباد سے آنے والے جانے کہاں غائب ہوگئے اور یہ احمد علی کیف کس مسئلے میں پھنسا ہے کہ نئے افق کی محفل چھوڑ دی ہے۔ کسی اور سے نہیں تو ہماری خاطر آ دیا کر۔ ریاض حسین قمر کا منگلا ڈیم سے تبصرہ بہت اچھا تھا۔ چھٹے نمبر پر میرے محبت نامے کو پیش کیا گیا۔ ہماری کوشش تو بہت ہوتی ہے کہ ہر ماہ حاضری دی جائے جیسے تیسے تبصرہ بھی لکھ لیتے ہیں پر کبھی کبھی لیٹ ہوجاتے ہیں یا محترم ڈاک کی محبت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ انہیں شاید ہمارا تبصرہ اتنا پیارا لگتا ہے کہ وہ اپنے گھر آرام سے بیٹھ کر پڑھنے کے لیے لے جاتے ہیں کیوں ڈاک ماموں یہی بات ہے نا۔ عالیہ انعام الٰہی کراچی سے تبصرہ پسند آیا کراچی کے حالات پر ہر ذی شعور بندہ خون کے آنسو رونے پر مجبور ہے۔ روشنیوں کے شہر کو جانے کس بد بخت کی نظر لگ گئی ہے۔ جانے کون بدنیت پس پردہ ہیں جو خوف و دہشت پھیلا کر خون کی ہولی کھیلنے میں مصروف عمل ہیں۔ مجاہد عباسی کے بعد سید عبداللہ شاہد صاحب تھے جو ہمیشہ اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ آتے ہیں۔ پڑھ کر دکھ ہوا کہ آپ تنہائی کا شکار ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی اچھا اور نیک ساتھی عطا فرمائے۔ جو آگے کی زندگی کو خوشگوار بنائے اور ہمارے بزرگ رائٹر فقیر محمد بخش صابر لنگاہ، محمد شفاعت حسین ثقلین صابر لنگاہ پرانا موڑ خانیوال اپنی حاضری لگوائی بخش انکل کیا حال ہیں اللہ آپ کو خوش رکھے کہانی پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ عصمت اقبال عین نے جس منظر میں بیٹھ کر خط لکھا بہت ہی دلکش موسم کو پیش کیا ایسے موسم کی دلکشی اور سحر انگیزی میں تو ایک رائٹر کے قلم سے پھوٹ پھوٹ کے شاعری کی سوغات نکلتی ہے۔ عصمت اقبال عین صاحبہ میری کہانی ''انوکھا انتقام'' آپ کو اچھی لگی شکریہ۔ ناظم بخاری بھائی ماشاء اللہ آپ تو اب ٹائم نکالنے لگے نئے افق کے لیے۔ آپ کے والد کے انتقال پر دلی رنج و دکھ ہوا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ انوکھا انتقام پسند کرنے کا شکریہ۔ این شاہین واہ کینٹ سے این شاہین جی یہاں دنیا میں ساتھ چلتے رہو تو یاد رکھا جاتا ہے کسی مجبوری کے تحت کوئی اخذ نہ کرے ادھر اُدھر ہوجائے تو اک دو بار یاد کرنے کے بعد ہر کوئی بھولنے لگتا ہے۔ سوائے اپنے ان پیاروں کے جن سے رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ خیر آباد رہو اور حاضری یقینی بناؤ سب یاد رکھیں گے زور قلم اور زیادہ ہو۔ آخری خط جاوید احمد صدیقی راولپنڈی مختصر سا خط لکھا بہت خوب۔ مگر یہ ہماری ادبی شہناز بانو کہاں رہ گئیں۔ گفتگو کا اختتام ہوا۔ اسماء الحسنٰی میں حسام بٹ نے ''یاواجد'' کے اسم مبارک کے ورد فضائل وظائف ہمیں بتائے اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ حسب معمول اسماء الحسنٰی کے بعد اقرأ پیریڈ میں بیٹھے جہاں پر طاہر قریشی معلم کے فرائض نبھا رہے ہوتے ہیں۔ موضوع شرم و حیا ہی تھا۔ کہانیوں میں بازی گر کی قسط نمبر 6 پڑھی مگر جانے کیوں کچھ سست رفتاری سے چل رہی ہے کہ ہیرو ابھی تک اپنی محبوبہ فرحانہ تک بھی نہیں پہنچ پایا اور باقی آئندہ ماہ کا لفظ منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ ''خالی دامن'' محمد اعظم خان کی آخری صفحات کے ناول نے متاثر کیا۔ سچی کہانیوں میں ''سانپ'' تسلسل انجانی محبت'' اچھی لگیں۔ مغربی کہانیوں میں رشتہ بھلی لگی۔ بزم سخن کے صفحے نہیں مل رہے تھے پتا چلا اس ماہ غائب ہے۔ خوش بو سخن میں سرور شاذ کی تشنگی' امیر حمزہ منچن آباد کی غزل' پروفیسر واجد نگینوی کی غزل' عصمت اقبال عین کی غزل' سلمٰی غزل کراچی کی غزل اچھی لگیں۔ عمران بھائی خوش بو سخن میں میری تحریریں کیوں شامل نہیں ہورہی ہیں۔ ذوق آگہی کی تحریریں دل کو چھو لینے والی ہوتی ہیں۔ باقی مطالعہ جاری ہے۔ ورنہ گفتگو میں شامل نہ ہوپاؤں گا۔ سب کو سلام جو جو نئے افق کے ساتھ جڑے ہیں۔ اللہ نگہبان

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم! پیارے عمران صاحب میرا اور آپ کا ساتھ ماشاء اللہ بہت پرانا ہے۔ جو بفضل اللہ پاک بہت اچھا گزرا اور گزر رہا ہے اور آئندہ بھی گزرے گا بشرطیکہ زندگی۔ میں نے ایک کہاوت سنی تھی کہ ایک ریٹائرڈ زندگی گزارنے والے شخص نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی کام کرلیا جائے جس سے روزی روٹی کا بندوبست عزت سے چل سکے تو اس نے گلاب کے پھول کاشت کرکے اور ان کے پودوں سے تازہ گلاب حاصل کرکے گلدستے بنا کر فروخت کرنے کا سوچا تاکہ ان سے جو آمدنی ہو اس سے گھر کو اچھے طریقہ سے چلایا جاسکے اور اس نے مشورہ کے لیے جس سے بات کی وہ ایک وکیل نکلا۔ اس نے مشورہ تو بہت اچھا دیا کہ جس سے آمدنی میں کسی قسم کی کوئی کمی نا آئی لیکن مشورہ دینے کے بعد اس نے جو اپنی مشورہ فیس مانگی اس کے بعد کاشت کرنے بیج خریدنے اور گلاب کے پھولوں کو اگا کر روزی حاصل کرنے کا خواب دھرے کا دھرا رہ گیا کیونکہ رقم تو وکیل صاحب فیس کے نام پر لے گئے اور اب وہی قصہ میرے ساتھ کردیا آپ نے کہ میں

نے سوچا تھا کہ ادب کی خدمت کرو اور فیض اٹھاؤ کبھی نہ کبھی تو ان کی نذر کرم ہم جیسے فقیر پر بھی پڑ جائے گی اور پھر بیڑا پار ہوجائے گا اور ہم نے بھی لکھاری بننے اور سچ بیانیوں کو تلاش کرنے کے سلسلہ میں بھاگ دوڑ شروع کردی اور منحوس لکھنے کے بعد مایوسی کے چولے کو اتار پھینکا اور ہمت مرداں مدد خدا کا دامن تھام کر کاغذ اور قلم کے ہتھیار کو تھام لیا اور پھر میں نے تلاش بسیار کے بعد جو تحریریں لکھیں ان کے نام درج ہیں۔ پچھتاوا' بدلے کی آگ' شیطان کی اولاد' خوف خدا' انجام محبت' دل اور دنیا' محبت کی جیت۔ کا نام دے کر صاف لکھائی وقفہ رکھ کر لکھائی کرنا اور ترتیب کو بھی مدنظر رکھ کر لکھنا پر اپنی تمام تر محنت و لگن کو کام میں لا کر مکمل کرنے کے بعد بذریعہ ڈاک یو ایم ایس ارسال کیا جبکہ میں پہلے ہی مریض آدمی ہوں۔ مگر اس کام کو کرتے ہوئے میں نے اپنی صحت کی بھی پروانہ کی اور اشاعت کا موقع صرف ایک تحریر پچھتاوا کو حاصل ہوا اور باقی کی تحریریں ابھی تک زیر غور ہیں حالانکہ ان میں کسی بھی طرح کی کمی بیشی نہیں رکھی گئی مانا کہ وہ ذرا سی طویل ضرور ہیں مگر قاری کو اپنی گرفت میں لے کر کامیابی سے ادب کی سند ضرور حاصل کرسکتی ہیں اگر ان کو ایڈیٹر صاحبان سے مکمل ایمانداری سے چیک کروایا جائے اور فقیر محمد بخش صابر لنگاہ نے بھی سوچا تھا کہ داد ملے گی اور کچھ نہ کچھ روزی روٹی کا سلسلہ بھی بن جائے گا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا میری ارسال کردہ تحریریں آپ کے معیار پر نہیں اتریں کسی بھی قابل نہیں ہیں او ر اشاعت کے قابل نہیں یا یہ اشاعت میں شامل ہوں گی۔ جس سے ہمارا بھی کچھ بھلا ہوگا۔ اس کا جواب دینا آپ پر فرض ہے اور ضرور دیجیے گا کہ ہمارے قلم میں دم ہے یا ہم ناکارہ ہیں تاکہ اس کے مطابق آگے قدم بڑھایا جاسکے شکر گزار رہوں گا۔ ☆ (محترم لنگاہ صاحب! خط لکھنے کا شکریہ آپ کی ایک کہانی شائع ہوئی مگر آپ نے اس کہانی پر غور نہیں کیا کہ اس میں ہم نے کیا تبدیلیاں کیں۔ ہمیں تو امید تھی کہ آپ جیسا سینئر قاری خامیوں کو ضرور سمجھ لے گا۔ مختصر کہانیوں کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے چند صفحات میں موضوع کو سمیٹ لینا ہی فن ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کہانی لکھتے ہوئے جذباتی ہوجاتے ہیں اور خود کرداروں کے بارے میں فیصلے بھی صادر کردیتے ہیں۔ جبکہ یہ کام صرف قاری کا ہوتا ہے کہ وہ کہانی اور اس کے کرداروں سے کیا اخذ کرتا ہے۔ آپ سچ بیانی میں صرف سچ بیان کریں۔ خواہ سچ کتنا کڑوا اور قابل نفرت کیوں نہ ہو۔ آپ لکھ سکتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں)۔ محبوب شمارے نئے افق کی آمد مورخہ 24 مئی بروز جمعرات کو ملتان شریف سے جو کہ وزیراعظم محمد یوسف رضا گیلانی کا شہر جہاں کی گلی گلی بزرگوں کے مزارات سے بھری پڑی ہے سے ہمارا پیارا ہونہار فرزند محمد ثقلین صابر لنگاہ خرید کر لایا اور مجھے بطور تحفہ پیش کیا کیونکہ کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ جب ہو اپنی جیب خالی تو بن جاتے ہیں سب رب کے سوالی۔ ماہنامہ کو وصول کر کے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر دلی خوشی ہوئی اور ادارہ نئے افق کے لیے دعائے خیر نکلی۔ بابت جون کے شمارہ نئے افق کے سرورق کے مصور صاحب نے بہت خوب صورت انداز میں سجا کر پیش کیا وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ماڈل اور اشتہارات بس نام کو تھے مگر مشروب روح افزاء کی بوتل نے گرمی اور محکمہ واپڈا کی کارکردگی کہ بل تو ہے مگر بجلی نہیں کی یاد کو تازہ کردیا کہ فریج میں برف جمی ہوئی نہ تھی ورنہ عمران صاحب' قریشی صاحب کے ساتھ ساتھ سب قارئین بہن بھائیوں کو ایک ایک گلاس روح افزاء کے مشروب کا پیش کرتے اور شکریہ حاصل کرتے۔ چند ماہ سے لسٹ مضامین کو جس طرح سجا کر پیش کیا جارہا ہے وہ اس ماہ بھی برقرار رہا۔ شکریہ دیگر اس ماہ بزم سخن کو اشاعت میں شامل نہ کیا گیا۔ ہماری طرف سے ارسال کردہ سچ بیانیوں میں سے بھی کسی کو اشاعت میں شامل نہ کیا گیا۔ اس کی وجہ ضرور بتائیں دیگر تعداد اشاعت 18 رہی اور ظاہر ہے کہ ہر رنگ نے اپنا آپ منوا کر عمران صاحب سے اشاعت اور مبارک باد کی سند حاصل کی ہوگی۔ لہٰذا فقیر صابر لنگاہ کی طرف سے بھی تمام لکھاریوں کو مبارک باد و دعائیں۔



اسماء الحسنیٰ

حسام بٹ

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے اَن گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَـلِیْـمُ الْـخَبِیْر کو ہے۔ میں کوئی عالم فاضل یا مفتی نہیں ہوں لہٰذا کسی علمی بحث کو چھیڑنا یا تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینا میری علمی ہمت اور بساط سے باہر ہے اور یہاں پر یہ میرا مقصود اور موضوع بھی نہیں۔ میں دین کی واجبی سی سُوجھ بُوجھ رکھنے والا ایک عام سا دنیا دار انسان ہوں۔ البتہ اس بات پر مجھے فخر ہے کہ اس ذاتِ باری نے مجھے جتنا بھی علم و ہنر عطا کیا ہے اس کا درست استعمال جانتا ہوں اس کے باوجود بھی اگر اس کارِخیر کے دوران مجھ سے کہیں کوئی بھول چُوک یا بے ادبی ہوجائے تو وہ رؤف الرحیم میری چھوٹی بڑی ہر خطا کو معاف فرمائے جس کے اسماء الحسنیٰ پر قلم اٹھانے کی میں نے جرأت کی ہے۔

قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہ نامہ ''نئے افق'' کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہوں۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تسعہ و تسعین اسماما ئتۃ الا واحدا من احصاھا دخل الجنۃ.

ترجمہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔

میں بھی ''نئے افق'' کے ان صفحات پر قادر مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسنیٰ کا تذکرہ کروں گا۔

اپنی جائز ضروریات و حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذات پاک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق ''دعا'' ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل میں دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کیے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلائیں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل زرِّیں اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پَر لگ جاتے ہیں۔

ہر دعا کے ساتھ اول آخر حسبِ توفیق درود شریف پڑھنا نہایت ہی کارآمد اور ضروری ہے۔ اس عمل سے آپ کی دعا کے ساتھ اللہ کے محبوب کی تائید بھی شامل ہوجاتی ہے۔

کسی بھی دعا سے پہلے نیکی اور بھلائی کا کوئی کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی بڑی نیکی کا موقع میسر نہ ہو تو انسانوں کی گزرگاہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہی ہٹادیں یا مسکرا کر کسی کو سلام ہی کرڈالیں۔

ناممکن اور ناجائز کاموں کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔ وہ ذاتِ کریم مثبت صفات کا مالک ہے۔ اس سے ہمیشہ بھلائی، خیر اور تعمیری مقاصد کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔

اگر حصولِ مقصد میں دیر ہو رہی ہو تو بددل یا مایوس ہرگز نہ ہوں بلکہ پوری دل جمعی سے دعا کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس مالک الملک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہِ عظیم ہے۔

اگر کسی دعا گو شخص کی نیت صاف، دل شفاف، کھانا پینا اور لباس رزقِ حلال کا رہینِ منت ہو تو رحمتِ خداوندی اس کی دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی جوش میں آجاتی ہے۔

حَیُّ

معانی: زندہ جاوید لافانی، لاثانی، اپنے بل پر زندہ جس کی زندگی کسی کی بخشی ہوئی نہ ہو

تاثیر: اسمِ جلالی

اعداد: 18

مفرد عدد: 9

ح	ی
8	10

ورد: یاحَیُّ

فیوض و برکات اور وظائف:۔

☆ اگر کوئی شخص روزانہ کسی بھی وقت سو مرتبہ یاحی کا ورد کرے تو......

۱:۔ اس کی روح میں بے پناہ قوت پیدا ہوگی۔

۲:۔ اس کا سینہ نورِ توحید سے منور ہوجائے گا۔

۳:۔ تمام جائز مقاصد میں اسے کامیابی حاصل ہوگی۔

☆ اگر کوئی شخص اٹھتے بیٹھتے بکثرت یاحی کا ورد جاری رکھے تو......

۱:۔ اسے ہر نوعیت کی بیماری سے شفا نصیب ہوگی۔

۲:۔ وہ ہمیشہ تندرست، صحت مند اور توانا رہے گا۔

۳:۔ اس کی عمر حیرت انگیز طور پر دراز ہوگی اور صحت بھی برقرار رہے گی۔

☆ اگر کوئی شخص خطرناک فرائض کی بجاآوری پر مقرر ہو یا کسی جان لیوا مہم پر روانہ ہو رہا ہو تو وہ پچانوے مرتبہ یاحی کا ورد کرکے گھر سے نکلے تو......

۱:۔ اس کی واپسی بخیر و عافیت ہوگی۔

۲:۔ وہ ہر قسم کے جانی و مالی نقصان سے محفوظ رہے گا۔

۳:۔ کسی بھی آفت اور مصیبت میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔

☆ اگر کوئی شخص اس اسم مبارک کو ہر فرض نماز کے بعد ایک سو آٹھ مرتبہ پڑھنا اپنا معمول بنالے تو......

۱:۔ مصائب و آلام اس سے دور رہیں گے۔

۲:۔ وہ کبھی بیمار نہیں پڑے گا اور ہمیشہ خوش رہے گا۔

۳:۔ وہ اپنے اندر قوتِ حیات کو باقاعدہ محسوس کرے گا۔

اس اسم مقدس کو یاحی یا قیوم برحمتک استغیث کی شکل میں پڑھنا مجرب الجرب ہے۔ ہر مشکل و مصیبت میں یہ تیر بہ ہدف کام کرتا ہے۔

میرا رب، میرا پروردگار ربُ المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ ربُ العالمین ہے لہٰذا غیر مسلم حتیٰ کہ اس کے وجود سے انکاری افراد بھی اسماء الحسنیٰ کی برکات سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

غیر مسلم افراد اس اسم مبارک کو اپنے جائز اور نیک مقاصد کے حصول کے لیے طلوعِ آفتاب سے پہلے والے ایک گھنٹے میں یا غروبِ آفتاب کے بعد والے ایک گھنٹے میں، بیان کردہ تعداد میں اپنی سہولت کے مطابق پڑھ سکتے ہیں۔

اس کی ذات سے انکار کرنے والے افراد جب دل چاہے اور جتنی بھی توفیق ہو اس اسم پاک کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان کی ہر جائز، مثبت اور تعمیری تمنا پوری ہوگی۔ میرا رب بلاشبہ ان کا بھی خالق، مالک اور رزاق ہے۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

قناعت واستغناء اور حرص وطمع:۔

جن اخلاق کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور اس دنیا میں بھی بہت بلند ہو جاتا ہے اور دل کی بے چینی اور کڑھن کے سخت عذاب سے بھی اس کو نجات مل جاتی ہے ان میں سے ایک قناعت اور استغناء بھی ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو جو کچھ ملے اس پر وہ راضی اور مطمئن ہو جائے' اور زیادہ کی حرص ولالچ نہ کرے...... اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو قناعت کی یہ دولت عطا فرمائے' بلاشبہ اس کو بڑی دولت عطا ہوئی' اور بڑی نعمت سے نوازا گیا۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیے۔

(۲۳۰)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو حقیقت اسلام نصیب ہوئی۔ اور اس کو روزی بھی بقدر کفایت ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنادیا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) بلاشبہ جس بندہ کو ایمان کی دولت نصیب ہو اور ساتھ ہی اس دنیا میں گزارے کا کچھ ضروری سامان بھی' اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل کو قناعت اور طمانیت کی دولت بھی نصیب فرمادے' تو اس کی زندگی بڑی مبارک اور بڑی خوشگوار ہے اور اس پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے...... یہ قناعت اوروں کی طمانیت وکیمیا ہے' جس سے فقیر کی زندگی بادشاہ کی زندگی سے زیادہ لذیذ اور پرمسرت بن جاتی ہے۔

این کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

آدمی کے پاس اگر دولت کے ڈھیر ہوں لیکن اس میں اور زیادہ کے لیے طمع اور حرص ہو اور وہ اس میں اضافہ ہی کی فکر اور کوشش میں لگا رہے اور "ھل من مزید" ہی کے پھیر میں پڑا رہے تو اسے کبھی قلبی سکون نصیب نہ ہوگا اور وہ دل کا فقیر ہی رہے گا۔ برخلاف اس کے اگر آدمی کے پاس صرف جینے کا مختصر سامان ہو مگر وہ اس پر مطمئن اور قانع ہو تو فقر و افلاس کے باوجود وہ دل کا غنی رہے گا' اور اس کی زندگی بڑے اطمینان اور آسودگی کی زندگی ہوگی...... اس حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

(۲۳۱)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ دولت مندی مال واسباب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔

(صحیح بخاری)

اور اس سے بھی زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یہی حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مخاطب بنا کر اس طرح سمجھائی۔

(۲۳۲)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھ سے ارشاد فرمایا:۔ ابوذر! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال زیادہ ہونے کا نام تونگری ہے؟ میں نے عرض کیا۔ ہاں حضور (ایسا ہی سمجھا جاتا ہے) پھر آپ نے فرمایا:۔ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ مال کم ہونے کا نام فقیری اور محتاجی ہے۔ میں نے عرض کیا:۔ ہاں حضور (ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے) یہ بات آپ نے مجھ سے تین دفعہ ارشاد فرمائی...... اس کے بعد ارشاد فرمایا: اصل دولتمندی دل کے اندر ہوتی ہے اور اصلی محتاجی اور فقیری بھی دل ہی میں ہوتی ہے۔

(معجم کبیر للطبرانی)

(تشریح) حقیقت یہی ہے کہ تونگری اور محتاجی خوشحالی اور بدحالی کا تعلق روپیہ پیسہ سے زیادہ آدمی کے دل سے ہے۔ اگر دل غنی اور بے نیاز ہے تو آدمی خوش حال ہے اور اگر دل حرص اور طمع کا گرفتار ہے تو دولت کے ڈھیروں کے باوجود وہ خوشحالی سے محروم اور محتاج وپریشان حال ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ کا مشہور قول ہے۔

"تونگری بدل ست نہ بہ مال"

(۲۳۳)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ کچھ طلب کیا' آپ نے ان کو عطا فرمادیا (لیکن ان کی مانگ ختم نہیں ہوئی) اور انہوں نے پھر طلب کیا' آپ نے پھر ان کو عطا فرمادیا' یہاں تک کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا وہ سب ختم ہو گیا' اور کچھ نہ رہا تو آپ نے ان انصاریوں سے فرمایا:۔ سنو! جو مال ودولت بھی میرے پاس ہوگا اور کہیں سے آئے گا میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا اور اپنے پاس ذخیرہ جمع نہیں کروں گا (بلکہ تم کو دیتا رہوں گا' لیکن یہ بات خوب سمجھ لو کہ اس طرح مانگ مانگ کر حاصل کرنے سے آسودگی اور خوش عیشی حاصل نہیں ہوگی' بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ) جو کوئی خود عفیف بننا چاہتا ہے یعنی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے اپنے کو بچانا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور سوال کی ذلت سے اس کو بچا دیتا ہے' اور جو کوئی بندوں کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر کرنے سے بچنا چاہتا ہے یعنی اپنے کو بندوں کا محتاج اور نیازمند بنانا نہیں چاہتا تو اللہ تعالیٰ اس کو بندوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور جو کوئی کسی کٹھن موقع پر اپنی طبیعت کو مضبوط کر کے صبر کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے (اور صبر کی حقیقت اس کو نصیب ہو جاتی ہے) وہ کسی بندہ کو بھی صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث کا خاص سبق یہی ہے کہ بندہ اگر چاہتا ہے کہ وہ دوسرے بندوں کا محتاج نہ ہو اور ان کے سامنے اس کو دست سوال دراز کرنا نہ پڑے اور مصائب ومشکلات اس کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکیں تو اسے چاہیے کہ اپنی استطاعت کی حد تک وہ خود ایسا بننے کی کوشش کرے' اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی پوری پوری مدد فرمائے گا اور یہ سب چیزیں اس کو نصیب ہو جائیں گی۔

حدیث کے آخری حصہ میں فرمایا گیا ہے کہ "کسی بندے کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی۔" واقعہ ہے کہ "صبر" دل کی جس کیفیت کا نام ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت وسیع اور نہایت عظیم نعمت ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کی آیت "واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ" میں "صبر" کو صلوٰۃ یعنی نماز پر بھی مقدم کیا گیا ہے۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

سیوک آگ

خورشید پیرزادہ

جب زندگی کے راستے کٹھن ہوجائیں، منزل نگاہوں سے اوجھل ہوجائے، جب ہوائیں مخالف ہوجائیں، دل کا خون آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگے، اپنے پرائے بن جائیں تو انسان جیتے جی مرجاتا ہے۔ ہر سانس اسے دشمن محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ خود دنیا کی لق و دق صحرا میں تنہا بھٹکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔
اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا اس کی سوچیں اُس سطح پر آگئی تھیں کہ وہ کسی بھی لمحے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کرسکتی تھی مگر پھر اچانک حالات پلٹا کھا گئے کچھ نادیدہ ہستیاں اس کی دوست بن گئیں اور پھر کانٹوں بھرے راستے پھولوں کی سیج بنتے چلے گئے۔

ماورائی موضوع پر ایک خوب صورت ناول، جس کی ہر سطر آپ کو چونک جانے پر مجبور کردے گی

خوبصورتی تو شاید اسی پر ختم تھی۔ رنگ ایسا جیسے میدے میں سندور گھلا ہو۔ سنگ مرمر سا تراشا ہوا بدن۔ آنکھیں اور چال ہرنی جیسی۔ آواز کی مٹھاس کے آگے کوئل بھی شرما جائے۔

روی اور وکرال جیسے ہی بابا سکندر کے مہمان خانے سے باہر نکلے تو سامنے سے وچترا آتی دکھائی دی۔ روی کو دیکھتے ہی اس کی پوری بتیسی کھل گئی۔

روی اس وقت اس سے بچ کر نکل جانے کی کوشش میں تھا۔ مگر وہ وچترا تھی۔ روی کی کیا مجال کہ بنا اس سے پنگا لیے بڑھ جائے۔

"اے سندر منش...... بتا کب بارات لے کر آؤں تیرے پاس؟" اس کی مسکراہٹ کی دلکشی تو بڑے بڑے گیانی کی عبادت کو تاراج کر کے رکھ دینے والی تھی۔ مگر روی، جو بچپن سے اس کی توبہ شکن اداؤں کا عادی ہو چکا تھا اب کیا متاثر ہوتا۔

اس کے دل کی دنیا تو آشا سے شروع ہو کر آشا پر ہی ختم ہوتی تھی۔

وچترا کی حرکت پر وکرال کو ہنسی آ گئی۔ اس نے وچترا کو روی کی پریشانی کے بارے میں بتایا۔

"اوہ...... ہو...... میرے مجنوں...... بنا مجھ سے پوچھے کسی اور کے مجنوں کیسے بن گئے...... چھوڑو اسے ...... میں ہوں نا۔"

روی نے اپنی آگ برساتی نگاہوں سے اسے گھورا تو وہ ایک مدھری ہنسی بکھیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

تب ہی روی کے دماغ میں ایک نیا خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے آگے بڑھ چکے وکرال کو روکا۔

"آشا کو غائب کرنے میں اسی چڑیل کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مجھے پورا شک ہو رہا ہے۔" روی نے دور نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی وچترا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا شک ظاہر کیا۔

"یہ وچترا؟ نہیں، یہ ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ ایسی بری نہیں ہے۔"

"پھر بھی وکرال۔" روی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "تم اپنی ٹیلی پیتھی کی مدد سے اسے چیک تو کرو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے برابر کے جنوں کے دماغ میں دوستانہ طور پر ہی پہنچ سکتے ہیں لیکن اس کی مرضی کے بغیر اس کے دماغ سے کوئی جانکاری نہیں چرا سکتے۔ ہم اپنے سے کم شکتیوں والے جن کے دماغ میں بنا اس کی مرضی کے پہنچ سکتے ہیں اور اس کے اندر کی ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ وچترا ایک شکتی شالی جن زادی ہے۔"

"تب کیسے معلوم ہوگا...... کیا تم سردار راج دلیش کے گھر کے سیوکوں کے دماغ میں پہنچ کر کچھ پتہ نہیں کر سکتے؟"

"ہاں...... ان سے پتہ چل سکتا ہے۔ پر اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اسے پہچانتا ہوں۔ جسے ہم ایک بار دیکھ چکے ہوں یا جس کی آواز پہچانتے ہوں اس کے دماغ تک پہنچ سکتا ہیں۔ مگر میں نے ان کے کسی سیوک کو نہیں دیکھا۔ اس لیے اس معاملے میں بابا سکندر یا استاد الوکھ ہی ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔ چلو استاد الوکھ کے پاس۔" وکرال نے روی کو ایک دھکا دیتے ہوئے کہا۔

اگلے پل دونوں استاد الوکھ کے سامنے کھڑے تھے۔

استاد ان دونوں کے گرو تھے مگر دونوں کے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے دونوں کا سواگت کیا۔

"مجھے پتہ ہے تم دونوں میرے پاس کیوں آئے ہو۔ ابھی میں تم دونوں کے من کو پڑھ چکا ہوں۔ میں آشا کے گھر گرزوالوکھ بن کر اس کے چاچا سے مل کر اور تم دونوں کے بھیس میں موجود سیوکوں کو سب سمجھا کر ابھی آیا ہوں...... جب میں وہاں کار سے اتر کر ان کے بیچ پہنچا تو آشا کی سلیکھا موسی تو پھر سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔" استاد الوکھ کی طویل گفتگو روی کی بے چینی کو اور بڑھا رہی تھی۔

"اچھا، غصہ مت کرو میرے شیر، میں ابھی پتہ کرتا ہوں۔ سردار راج دلیش کے یہاں میں کئی بار گیا ہوں سردار سکندر کے ساتھ۔ میں وہاں کے کئی سیوکوں کو جانتا ہوں۔"

اس کے بعد استاد الوکھ کچھ پل آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ جب انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو روی اور وکرال نے ان کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیں تیرتی ہوئی محسوس کی۔

"آشا کچھ لمحے پہلے تک وہیں ان کے محل میں تھی...... لیکن......"

"لیکن کیا استاد؟" جھنجلاہٹ کے مارے روی چیخ پڑا۔

"آشا اب وہاں نہیں ہے...... میں سیوکوں سے اتنا ہی پتہ کر سکا ہوں۔ میں جن سیوکوں کو جانتا ہوں انہیں معلوم نہیں ہے کہ اس وقت آشا کہاں ہے۔"

روی پھٹی پھٹی آنکھوں سے استاد الوکھ اور وکرال کو دیکھے جا رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں اس چڑیل نے ایسا کیا ہوگا۔" روی کو آج ان جنوں سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

"روی میرے بھائی، مجھے اب بھی حیرت ہے...... مگر تم فکر مت کرو...... چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے میں تمہاری آشا کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

روی کا ہاتھ پکڑ کے وکرال نے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ روی تھوڑا سا لڑکھڑایا پھر سیدھا ہوا تو دیکھا کہ دونوں ایک پہاڑی کے نیچے کھڑے تھے۔ ایک طرف دور دور تک گھنا جنگل تھا۔ ایک پہاڑی ندی ان کے قریب سے گزر رہی تھی۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔

بڑا دل کو موہ لینے والا منظر تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو روی یہاں آ کر بہت خوش ہوتا۔ مگر ابھی تو اس کے دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ آگ اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

اچانک ایک دھوئیں کا گولہ چکر لگاتا ہوا ان تک پہنچا۔ دوسرے ہی پل دھواں چھٹ گیا اور اس میں سے وچترا ظاہر ہوئی۔ روی نے وکرال کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وچترا سے تو کہیں بھی رہ کر بات کر سکتا ہوں، پر میں نے سوچا کہ تمہاری موجودگی میں آمنے سامنے بات ہو۔ اس کے گھر تو میں بنا بلائے جا نہیں سکتا۔ اس لیے اسے یہاں بلا لیا۔" وکرال نے روی کی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"ہاں وچترا...... مجھے پتہ چلا ہے کہ آشا کو تمہارے

یہاں قید کر کے رکھا گیا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ اب وہ وہاں نہیں ہے۔ اب بتاؤ' تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں تو ابھی تک تجھے ایک نیک اور سچے دل والی جن زادی سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ تم ایسا کر سکتی ہو؟"

"مجھے یقین نہیں ہوتا۔" وچترا نے وکرال کا جملہ نقل کے انداز میں دہراتے ہوئے کہا۔ "تو پھر کیوں یقین کرنے پر تلے ہو۔" وچترا نے ایسا منہ ٹیڑھا کر کے کہا کہ ان حالات میں بھی روی کو ہنسی آ گئی۔

"وہ تو ٹھیک ہے' مگر یہ سب کیا ہے۔ کچھ تو بتاؤ۔"

"روی۔ جب تھوڑی پہلے میں وکرال کے گھر پر تم سے ملی تھی اس وقت مجھے پتہ چلا کہ آشا کو اس کے گھر سے اٹھا کر لایا گیا ہے۔ تم دونوں میرے بھائی گبرال کو تو جانتے ہو۔ وہ شروع سے ہی غلط عادتوں کا شکار رہا ہے۔ اس کے لیے میرے پتا سردار راج دیش سے کتنی بار سزا بھی پا چکا ہے لیکن اپنی عادتیں نہیں سدھار سکا......"

"مطلب کہ گبرال؟"

"ہاں۔ یہ اسی نے کیا تھا۔ مجھے یہ جان کر بہت دکھ پہنچا کہ آشا جیسی معصوم لڑکی کو قیدی کی طرح میرے ہی گھر میں رکھا گیا ہے۔ میں اپنے سیوکوں کی مدد سے آشا کو چپکے سے نکال کر اسے اس کے گھر چھوڑ آنے کے لیے بھیج چکی ہوں۔ وہ اب تک اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی۔" وچترا کے منہ سے یہ سنتے ہی روی کے دل میں ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا تم آشا کو پہلے سے جانتی تھیں؟" روی نے جلدی سے پوچھا۔

"روی......تم آشا سے پیار کرنے کے بعد ہم جنوں کی دنیا سے دور رہنے لگے۔ مگر میں اپنے بچپن کے دوست کے بارے میں جانکاری کیوں نہ رکھتی۔ مجھے تمہاری ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ میری شرارتوں کی وجہ سے تمہیں مجھ پر شک ہوا۔ مگر ایک بات ہم نے تم سے چھپا کر رکھی' اس کے لیے تم ہمیں معاف کر دو۔"

"کون سی بات؟" روی چونک کر وچترا کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں بتاتا ہوں روی' تم میں اور وچترا ایک ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔ میں اور وچترا شروع سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن ہم دونوں نے اس بات کو اپنے اپنے من میں ہی رکھا تھا۔ کچھ دنوں پہلے جب ہم دونوں کے پتا نے ہمارے رشتے کی بات کی تو ہمیں سمجھو ساری دنیا کی خوشی مل گئی۔ تب ہم دونوں نے اپنی اپنی چاہت کا اظہار ایک دوسرے سے کر دیا۔ اس دوران تم آشا کے گھر پر بہت مصروف ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکا۔"

وکرال جیسا شکتی شالی جن روی کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس حال میں روی کو اپنے دوست پر بہت پیار آیا۔ وہ وکرال کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "ارے خوشی کی بات اتنا منہ بنا کر کیوں سنا رہا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تم دونوں کے پیار کی کامیابی کا سن کر۔ چلو اب آشا کو دیکھتے ہیں۔"

"ہاں چلو۔ میں بھی چلتی ہوں آشا سے ملنے۔" وچترا نے کہا۔ روی اور وکرال کے ڈپلیکیٹ سیوکوں کو کھو جا گیا۔ دونوں جن اس نئی کار کا مزا لوٹ رہے تھے اور سڑکوں پر تیزی سے کار دوڑا دوڑا کر لوگوں کو تنگ کر رہے تھے۔

یہ تینوں سیدھا اسی کار میں پہنچ گئے۔ وکرال نے ان دونوں شرارتی جنوں کو بھگایا اور اگلے ہی پل کار آشا کے گھر کے گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

وہاں پہنچتے ہی ان تینوں کو پتہ چلا کہ ان کی اتنی محنت ابھی تک بیکار ہی ثابت ہوئی تھی۔ آشا گھر پر نہیں تھی۔ وکرال' آشا کے چاچا جی کو تسلی دے رہا تھا۔

"آشا بہت جلد آپ کے سامنے ہوگی۔ ہمارے گرو الوکھا اس جن تک پہنچ گئے ہیں جو آشا کو لے گیا ہے۔ بس کچھ سمے لگے گا۔"

اس کے فوراً بعد تینوں ویسے ہی نکلے جیسے آئے تھے۔

گھر سے کچھ دور آ کر کار پھر انہی سیوکوں کے حوالے کر کے تینوں پھر سے سنسان جگہ پہنچ گئے۔

"اب کیا ہوگا؟" روی کی بے چینی پھر بڑھ چکی تھی۔ وچترا نے اپنے تین سیوکوں سے رابطہ کیا۔ دو کا پتہ نہیں چل رہا تھا' تیسرا کسی جگہ زخمی پڑا تھا۔ یہ کافی سنسنی خیز بات تھی۔ تینوں سوچ میں پڑ گئے آخر ان تینوں سیوکوں کو اس حال میں پہنچانے والا کون ہے۔

اس زخمی جن سے بھی ابھی تک ڈھنگ سے دماغی تار نہیں جڑ پا رہا تھا۔ روی کے لیے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اس کے تصور میں آشا کا ڈرا ڈرا چہرہ آ رہا تھا' کس طرح اس ظالم دشمن کے شکنجے میں ہوگی' کتنا اسے پکار رہی ہوگی۔ قدرت کیوں اپنے نیک بندوں کا اتنا امتحان لیتی ہے۔

دو بڑے جن آشا کے لیے کوشش کر رہے تھے لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وکرال اور وچترا نے اپنے تمام ساتھی جنوں کو اس زخمی جن کی تلاش میں لگا دیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ اب دونوں سردار جنوں کی مدد کے بنا آشا کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔ وکرال' استاد الوکھ کو بھی سب باتیں بتا کر ان سے بھی مدد لے رہا تھا۔

کتنے لمحے ایسے ہی بیت گئے' کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل پا رہا تھا۔ تب سب نے بابا سکندر کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ بابا سکندر کی بیٹھک کے باہر کچھ بھیڑ سی لگی تھی۔ پتہ چلا کہ بابا سکندر کے کچھ خاص ساتھی کہیں سے آ رہے تھے کہ انہیں ایک جن زخمی حالت میں ملا تھا۔ اسی کو سب دیکھنے آ رہے تھے۔ جنوں کا ڈاکٹر اپنے انداز سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ وچترا کی نظر جیسے ہی اس جن پر پڑی وہ بری طرح چونک پڑی۔

روی اسے چونکتا دیکھ چکا تھا۔ سمجھ گیا کہ یہی اس کا زخمی سیوک ہے۔ لیکن اس حالت میں اس کے دماغ سے ٹیلی پیتھی کے ذریعے جانکاری نکالنا ناممکن تھا۔ ایسا کرنے سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔

وکرال نے ساری باتیں بابا سکندر کو بتا دیں۔ وہ بھی فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ اب تو بس انتظار تھا اس جن کے ہوش میں آنے کا۔ روی من ہی من میں اپنے ایشور کو یاد کر رہا تھا۔ ابھی وہ آشا کے لیے نہیں' بلکہ اس زخمی جن کے لیے دعائیں کر رہا تھا۔

زخمی جن کو ہوش میں لانے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ پتہ نہیں اس کی یہ بے ہوشی بھی کسی جادوئی عمل کا نتیجہ ہو۔ روی کے دماغ میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ آشا اس وقت پوری طرح سے کسی شکتی شالی جادوئی گھیرے میں تھی۔ ورنہ سیدھا اس کے دماغ سے اس کی حالت کا پتہ لگ سکتا تھا۔

اب تو آشا کی تلاش میں بابا سکندر اور استاد الوکھ جیسے بڑے جن بھی لگ گئے تھے۔ ہزاروں جنوں کو چاروں سمتوں میں پتہ لگانے کے لیے بھیجا جا چکا تھا۔ ہوا میں' پانی میں' جنگلوں میں' پہاڑوں میں۔ ہر جگہ آشا کو تلاش کیا جا رہا تھا۔

روی کے پورے بدن میں رہ رہ کر بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ دل کا اطمینان تو کب کا کھو چکا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کھڑے وکرال کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑا الگ لے گیا۔ وکرال اس کے جذبات کو سمجھ رہا تھا۔

"بول میرے بھائی..... تو کیا کہنا چاہتا ہے۔"

"وکرال تم برا مت ماننا' تم جنوں کے بیچ میں خود کو بالکل ناکارہ سمجھ رہا ہوں۔ جبکہ میری آشا نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ میں اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے اجازت دو میرے دوست' میں آشا کو اپنے مطابق تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' لیکن میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تم جو کہو گے میں کروں گا۔ بولو کہاں چلنا ہے۔"

"یہاں سے کہیں الگ چلو' میں آشا کی گمشدگی کے بارے میں سکون سے بیٹھ کر سوچنا چاہتا ہوں۔"

"چلو ہم لوگ وہیں اس پہاڑی پر چلتے ہیں جہاں وچترا سے ملے تھے۔" اگلے ہی پل دونوں اسی سنسان

جگہ پر تھے۔

"تم یہاں آرام سے بیٹھ کر سوچو' اور ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا لو۔ اس پریشانی میں تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم انسانوں کو دن میں کئی بار کھانا پڑتا ہے ورنہ تمہاری طاقت گھٹ جاتی ہے۔"

وکرال نے ایک طرف منہ گھما کر اپنے کسی نادیدہ سیوک کو حکم دیا اور فوراً وہاں کھانا حاضر ہو گیا۔

روی کا کھانے کو بالکل دل نہیں کر رہا تھا لیکن وکرال کے دباؤ دینے پر اسے کھانا پڑا۔ کھانا بالکل تازہ اور لذت بھرا تھا۔ روی جانتا تھا کہ اپنی طاقتوں کو بحال رکھنے کے لیے کھانا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے وہ چپ چاپ کھانے لگا۔

اچانک اس نے وکرال کو دیکھا کہ وہ پریشان سا کھڑا ہو کر ہوا میں اپنا ہاتھ ہلا رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وکرال کا وہ ہاتھ لمبا ہونے لگا۔

روی جنوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ابھی تک ان کی طاقتوں کے بارے میں پوری طرح سے نہیں جان پایا تھا۔ نہ ہی اس نے اب تک جنوں کی کوئی لڑائی دیکھی تھی اور نہ ہی کسی جنگی کارنامے کو دیکھا تھا۔

وہ خالی نظروں سے وکرال کا لمبا ہوتا ہوا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ ایک اونچے درخت کی سب سے اونچی ڈال پر اسے کوئی پرندہ سا بیٹھا دکھائی دیا۔ وکرال نے اپنے ہاتھ میں اس پرندے کو پکڑ لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ چھوٹا ہوتا چلا گیا۔

پھر روی نے دیکھا کہ نیچے آتے ہی وہ سفید پرندہ ایک جن کے روپ میں بدل گیا۔ وہ بھی زخمی تھا' لیکن پورے ہوش و حواس میں تھا اور بہت ہی نڈھال سا لگ رہا تھا۔

"کون ہو تم اور تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟" وکرال نے نرم لہجے میں اس زخمی جن سے پوچھا۔

"سرکار میں وچترا جی کا سیوک ہوں۔" وہ بڑی مشکل سے بول پا رہا تھا۔

"وچترا کا سیوک......!!!" روی اور وکرال کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

دونوں کا دھیان پوری طرح سے اس جن کی طرف مبذول ہو چکا تھا۔ اسے مزید نہ بولتے دیکھ کر دونوں بے چین ہو گئے۔

"تم کہاں تھے اور تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟" وکرال نے اس سے پوچھا۔

"مجھے وچترا جی کے پاس جلدی پہنچنا ہوگا۔ آپ کو نہیں پتہ یہ کتنا ضروری ہے۔" وکرال کے سوال کا جواب نہ دے کر وہ اپنی ہی بات کر رہا تھا۔

"تم مجھے پہچانتے ہو؟" اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وکرال نے تھوڑے غصے سے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔ آپ سردار سکندر کے بیٹے وکرال ہیں۔" اس جن نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"تو تم مجھے پوری بات بتاؤ' تم کہاں سے آ رہے ہو اور تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟"

"وچترا جی نے ہم تین جنوں کو ایک بہت ہی خفیہ کام سونپا تھا۔ ایک انسان لڑکی جوان کے گھر میں قید تھی اسے چوری سے نکال کر اس کے گھر پہنچانا تھا۔ ہم تینوں نے مل کر اسے بڑی صفائی سے قید سے نکالا اور اس کے گھر لے جا رہے تھے کہ تبھی....." وہ بولتے بولتے رک گیا اور خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"تبھی کیا ہوا۔ جلدی بتاؤ۔ اور تم ڈر کیوں رہے ہو۔ یہ ہم جنوں کا علاقہ ہے۔ بنا ڈرے تم پوری بات بتاؤ" وکرال اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

"ہم تینوں اس لڑکی کو لے کر ہوا کے راستے بہت تیزی سے جا رہے تھے کہ ہمیں کسی ان دیکھی طاقت کی وجہ سے رکنا پڑا۔ زمین سے آسمان تک ایک نہ نظر آنے والا جال تھا۔ ہم سب اس جال میں پھنس چکے تھے۔ ہم نے اپنی پوری شکتی لگا دی لیکن اس جال سے خود کو الگ نہیں کر سکے۔"

اتنا بول کر وہ تھوڑا رکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے

زیادہ بولنے سے تکلیف ہورہی تھی۔

روی اس کے بار بار رکنے سے بے چین ہورہا تھا مگر اس کی حالت دیکھ کر کچھ کہہ نہیں پارہا تھا۔

''اس کے بعد کیا ہوا' وہ لڑکی کہاں گئی؟''

''تھوڑی دیر میں ہی مجھے شیشے کے ایک گول کمرے میں بند کردیا گیا۔ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف چھت کی طرف ایک سوراخ تھا جسے کسی پتھر سے بند کردیا گیا تھا۔ مجھے اپنے دوسرے جن ساتھیوں اور اس لڑکی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کچھ سمے کے بعد ایک بدشکل لمبا چوڑا انسان وہاں آیا...... اس کے ساتھ اسی کی طرح کے بہت سے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی کالی شکتیوں سے مجھے کشٹ دینا شروع کیا۔ ان کی جادوئی مار سے میں نڈھال ہوگیا۔ تب مجھے جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ میں سفر کے لائق نہیں تھا پھر بھی کچھ دور میں چلا۔ میری شکتی کم ہوتی لگ رہی تھی۔ جب مجھے کچھ نہیں سوجھا تو سفید چڑیا کا روپ لے کر اس پیڑ کے اوپر بیٹھ گیا۔'' اس جن نے اتنا کہہ کر اپنی بات ختم کی۔

''ٹھیک ہے میں ابھی تمہیں وچترا کے پاس بھیج دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وکرال نے ایک طرف منہ کرکے کسی کو پکارا ''شمون'' دوسرے ہی پل ایک بڑا سا جن وہاں نمودار ہوا۔

''حکم مالک۔''

وکرال نے اسے زخمی جن کو لے جانے کا اشارہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس جن کو لے کر غائب ہوگیا۔

''سالا بے وقوف جن...... سمجھتا تھا کہ اسے کسی شیش محل میں قید کیا گیا تھا۔ ابے اسے بوتل میں بند کیا ہوگا۔'' وکرال مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر سنجیدہ ہوکر روی سے مخاطب ہوا۔ ''اب بول روی' کچھ سمجھ میں آیا تجھے۔''

''ہم تو آشا اس بار پھر انسانوں میں ہی جا پھنسی ہے۔'' روی ٹھنڈی آہ بھر کے بولا۔

''کہیں یہ وہی ردے ناتھ تو نہیں جسے ہم دونوں نے خوب تنگ کیا تھا؟''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن وہ تو اکیلا تھا اور اس جن کے مطابق اس کے پاس ایک گروہ سا تھا۔''

''ہاں' ہوسکتا ہے اتنے دنوں میں اس نے اپنی شکتی بڑھا لی ہو۔ کمینے کو اس دن زندہ چھوڑنا ہماری غلطی تھی۔ چلو ہم اسے تلاش کریں۔ وہ انہی جنگلوں اور پہاڑیوں میں ہوگا۔ کیونکہ زخمی جن زیادہ دور نہیں جاپایا تھا۔'' وکرال جوش میں بھرا لگ رہا تھا۔

یار یہی فرق ہے جنوں اور انسانوں میں۔ تم اپنی طاقت کے جوش میں انسانوں کی جانب سے بچھائے گئے جال میں پھنس جاتے ہو۔ انسان جو بھی کرتے ہیں سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔'' روی کی بات سن کر وکرال چڑ گیا' اور غصے میں بولا۔

''ہاں...... تو تم بیٹھے سوچتے رہو اور وہاں ہماری آشا کا جانے کیا حال ہورہا ہوگا۔''

''دوست تم ناراض کیوں ہورہے ہو۔ سوچو کہ اپنے قید خانے میں رکھنے کے بعد وہ جنوں کو چھوڑ کیوں رہا ہے؟ یہ تم جیسے جنوں کے لیے ہی جال بچھایا ہے اس نے۔ وہ اس وقت آشا کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا جب تک کہ وہ تم سب کو اپنا قیدی نہ بنالے۔'' روی اس کے غصے کو ٹھنڈا کرتا ہوا بولا۔

''ہم م م...... بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم جنوں کا یہ دھرم ہے کہ کسی نے اگر ہمیں اپنا غلام بنالیا اور اگر ہم ہار کر اس کی غلامی قبول کرلیں تو سدا کے لیے اس کے وفادار ہوجاتے ہیں۔ ہماری کوئی ایسی چیز وہ اپنے قبضے میں کرکے رکھ لیتا ہے کہ ہم خود کو اس کی غلامی سے الگ نہیں کرسکتے۔ وہ ہم سے جو بھی کام لینا چاہے گا' چاہے اچھا یا برا' ہمیں اسے کرنا پڑے گا...... لیکن جس دن وہ کمزور ہوا اور ہم اس کے پاس سے وہ خاص چیز نکال لینے میں کامیاب ہوگئے' تو اسی دن اسے بھیانک سزا دیتے ہوئے ہم آزاد ہوجاتے ہیں۔''

''چل بے جن کے بچے...... بہت بھاشن دے لیا اب کچھ کام کر۔ سب سے پہلے تو تم بابا سکندر اور استاد

الوکھ کو خبردار کرو لیکن یاد رکھو یہ لڑائی میری لیڈر شپ میں ہوگی' ورنہ تم سب اس کمینے ردے ناتھ کے غلام بن جاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے آقا' آج سے یہ جن تیرا مفت کا غلام۔ جیسا تم کہو گے میں وہی کروں گا۔ جس دن تم مجھے کوئی کام نہ دو گے اس دن میں سالے تجھے مار کر کھا جاؤں گا...... ہی ہی ہی۔''

......☆☆☆......

ردے ناتھ کا اصلی نام تو کچھ اور تھا' شاید بھیرو ناتھ یا گھوری ناتھ جیسا کوئی نام تھا۔ تب وہ بڑا ہی نیک دل سادھو ہوا کرتا تھا۔ شہر کی آبادی سے تھوڑا ہٹ کے بہت ہی پرانا کالی کا مندر تھا جس کا وہ پجاری تھا۔ ہر مہینے وہاں ایک میلہ سا لگتا تھا۔ دور دور سے یاتری وہاں آتے تھے اور اپنی اپنی مرادیں بابا کو بتاتے تھے۔ بابا انہیں کچھ پرساد دیتے تھے اور اتفاق ہے کہ ان میں سے اکثر کی مرادیں پوری ہوجاتی تھیں۔

بابا کو گھڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ ان کے پاس ایک گھوڑا بھی تھا۔ کبھی کبھی لوگ بابا کو بہت تیز گھوڑا دوڑاتے ہوئے بھی دیکھتے تھے۔

بابا ایک اچھا گھڑ سوار تھا۔ دھیرے دھیرے لوگ انہیں رائیڈر بابا کہنے لگے جو بگڑ کر بعد میں ان کے اصلی نام کی بجائے ردے بابا ہوگیا اور پھر ان کا اصلی نام تو شاید ہی کسی کو یاد رہا ہو۔

ایک دن اچانک بابا اس مندر سے کہیں چلے گئے۔ بابا کیا گئے کہ مندر میں یاتریوں کا آنا بھی بند ہوگیا۔ اب نہ تو وہاں کوئی چڑھاوا چڑھاتا تھا اور نہ ہی میلہ لگتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ مندر ویران ہوتا چلا گیا۔ جنگلی' چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیاں اور جنگلی بیلیں اگ آئی تھیں۔ کسی انسان کا اب وہاں آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔

کئی سالوں کے بعد یہ سنا جانے لگا کہ بابا دوبارہ اس مندر میں پدھار چکے ہیں۔ لیکن اب وہ نیک سادھو سے پاکھنڈی سادھو بن چکا تھا۔ اور یہ اس کی طبیعت میں بہت بڑی تبدیلی تھی۔ جس کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہوتا تھا' ایسا اظہار جسے دیکھ کر عام آدمی کو خوف محسوس ہوتا تھا۔ عام لوگوں میں تو اب یہ باتیں ہونے لگی تھیں کہ بابا اب برہمچاری نہیں رہے۔ اپنی مستی میں مست رہنے والا سادھو اب عورتوں سے میل ملاپ کرنے لگا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ردے ناتھ بابا عام لوگوں سے الگ تھلگ ہوتا چلا گیا۔

مگر کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اپنے بارے میں ایسی باتیں پھیلانے میں خود ان کا اپنا ہاتھ تھا۔

بابا نے کئی سال کسی نامعلوم مقام پر ماں کالی کی گھور اور کٹھن تپسیا کی تھی' آخر میں ماں کالی کی جانب سے انہیں بہت سی شکتیاں عطا کی گئی تھیں۔ خود کو شکتی مان بنا لینے کے بعد بابا کے اندر نفسانی جذبات سر اٹھانے لگے تھے۔ لیکن شاید اتنی شکتیاں اس کے لیے کافی نہیں تھیں اس لیے خود کو سب سے زیادہ شکتی شالی بنانا ان کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ اور اپنی تنہائی میں وہ ہر لمحہ تپسیا میں گزار کر خود کو مزید شکتی شالی بنانے کی دھن میں مصروف تھا۔

کچھ دنوں پہلے انہیں آشا کے ساتھ کچھ نئی شکتیاں نظر آئیں' جنہیں اس نے حاصل کرنا چاہا' مگر انسان کے اندر کے فطری خوف کی وجہ سے انہیں ان دو مسخروں (بابا کے مطابق) ہار ماننی پڑی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے اندر موجود کمی اور خامیوں کو دور کر کے خود کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں مگن رکھا۔

جب وہ واپس پرانے مندر میں وارد ہوئے تو اس بار انہوں نے اپنے ساتھ کئی اور تانترک ساتھیوں کو بھی رکھ لیا۔ مندر کے آس پاس کا ایک بڑا علاقہ ان کے کالے جادو اور سفلی منتر اسے بھر چکا تھا۔

اسی منترا جال کے ذریعے انہوں نے آشا کے ساتھ ساتھ کئی جنوں کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ لیکن صرف آشا یا یہ چھوٹے جن ان کی مزید شکتی کی ہوس پوری کرنے کے لیے کافی نہیں تھے۔

روے ناتھ کے لیے آشا ایک خوبصورت چہرہ تھی جس کے ذریعے وہ بڑے بڑے طاقتور جنوں کا شکار کرنا چاہتا تھا۔

اپنے اسی منصوبے کے تحت انہوں نے ایک جن کو زخمی کر کے چھوڑ دیا تھا۔

جب کچھ دن گزرنے کے بعد بھی آشا کو بچانے کے لیے کوئی نہیں آیا تو تو ردے ناتھ نے دوسرے جن کو ہلکا زخمی کر کے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ابھی تک انہیں اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پا رہی تھی۔

مندر کے آس پاس کا پورا علاقہ ان کی نظر میں تھا۔ ہوا میں بو پا کر وہ جنوں کی موجودگی کو جان سکتے تھے۔ منترا جال پوری طرح سے تیار تھا۔ بھی تانترک آنے والے وقت کے لیے خود کو پوری طرح سے لیس کر چکے تھے۔

سمے بیتنے کے ساتھ ساتھ ردے ناتھ بے چین سا دکھائی دینے لگا تھا۔ انسان سوچتا ہے کہ وہ ہوس اور غصے جیسی کمزوریوں پر غالب آ چکا ہے مگر یہ اس کی بھول ہوتی ہے۔ ہوس' غصہ اور نفس پر صرف سچے دل والے ہی قابو پا سکتے ہیں۔

بابا ردے ناتھ کے اندر غصہ پنپنا شروع ہو چکا تھا۔ ایسے میں ان کا ایک ساتھی تانترک ایک غریب' پھٹے حال آدمی کو پکڑ کر اس کے سامنے لایا تو وہ بھڑک اٹھا۔

"میں یہاں شیر کا شکار کرنے بیٹھا ہوں اور تو چوہے پکڑ کر لا رہا ہے......تیری......تو......"

پھر بھی انہوں نے اپنی شکتی سے یہ معلوم کیا کہ انسان کے بھیس میں کہیں کوئی جن تو نہیں۔ مگر وہ سچ مچ انسان ہی ثابت ہوا۔ بابا پوری طرح سے ہوشیار تھے اور کسی معاملے میں کوئی چوک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ حد سے زیادہ ہوشیار رہنے پر بھی کہیں نہ کہیں کوئی چوک رہ ہی جاتی ہے۔

بھیانک بھیانک ننگ دھڑنگے تانترکوں کے بیچ وہ آدمی ڈر سے کانپ رہا تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں پرانی سی کلہاڑی اور ایک ہاتھ میں رسہ تھا۔ ادھیڑ عمر کا وہ دبلا پتلا آدمی پھٹے پرانے لباس میں تھا۔ دیکھنے میں ہی کوئی لکڑہارا لگ رہا تھا جو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر میں بیچتا تھا۔

"لے جاؤ اسے اور گپھا میں ڈال دو' آج سے یہ ہمارے لیے مزدوری کرے گا۔ بابا نے اس پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بنا اس کی طرف دیکھے انہوں نے اسی ساتھی تانترک کو حکم دیا۔

بابا کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس مزدور سے اس طرح صرفِ نظر کرنا ان کے لیے کتنا بھاری پڑنے والا ہے۔

......☆☆☆......

بابا سکندر' استاد الوکھ جیسے بڑے جنوں کے ساتھ روی اور وکرال آگے کی کارروائی پر غور کر رہے تھے۔ روی نے مشورہ دیتے ہوئے تشویش ظاہر کی تھی کہ کسی بھی جن کے لیے براہ راست بابا تک جانا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ ردے ناتھ نے اسی مقصد کے لیے منترا جال بچھا رکھا ہے۔

"تب ہمیں کیا کرنا چاہئے بیٹے؟" بابا سکندر نے روی سے پوچھا۔ آج اتنے مہان جن بھی کتنے مجبور لگ رہے تھے۔

روی نے دھیمی آواز میں اپنا منصوبہ ان کے سامنے رکھا۔ سب کے چہروں پر الگ الگ تاثرات تھے۔ ایک طرف جہاں وکرال جیسا جوشیلا جن سیدھا آشا تک پہنچنے کی سوچ رہا تھا' وہیں بزرگ اور دانا جن روی کی باتوں کو سمجھ رہے تھے۔

"مگر اس میں خطرہ بہت ہے روی بیٹے۔" استاد الوکھ نے اپنی تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اس سے زیادہ جوکھم اور خطرے سے بھرا ہوگا۔ ہمیں یہ خطرہ اٹھانا ہی پڑے گا۔ آپ سب یہیں رہ کر میرے اشارے کا انتظار کریں گے۔ ایشور نے چاہا تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔" روی نے وضاحت کی پھر وکرال سے بولا۔

"میں نے جیسا کہا ہے مجھے اسی روپ میں ردے ناتھ کی گپھا سے تھوڑی دور چھوڑ آؤ۔"

اس کے ساتھ ہی روی اور وکرال اٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں یہ میٹنگ کی تھی۔ مگر انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہاں بھی ان کا دشمن موجود تھا جس نے ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

وہ تھا گبرال۔ ایک برے کردار والا جن۔ وچترا کا بھائی اور سردار راج دیش کا بیٹا۔

آشا پر اس کی بری نظر پڑ چکی تھی۔ ایک دن وہ اسے اٹھا کر اپنے ہی گھر میں خفیہ جگہ پر چھپا چکا تھا۔ لیکن یہ خبر وچترا کے وفادار سیوکوں نے اسے پہنچا دی اور وچترا نے اپنے سیوکوں کی مدد سے چپکے سے آشا کو گبرال کی قید سے نکال کر اس کے گھر روانہ کر دیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہ ردے ناتھ کی قیدی بن گئی۔

گبرال کو جب پتہ چلا تو وہ روی اور آشا کا دشمن بن گیا۔ اور اب اتفاق سے اسے آشا کی موجودہ پریشانی اور روی کی منصوبہ بندی کا پتہ چل گیا تھا۔

آشا کے ضمن میں وہ اپنی ناکامی بھول نہیں پا رہا تھا۔ روی کا منصوبہ سن کر اس کے اندر کا شیطان پوری طرح سے جاگ چکا تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس قیمتی جانکاری کی بدولت وہ کیسے روی اور آشا سے بدلہ لے سکتا ہے۔

تب ہی اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ یہ اطلاع ردے ناتھ تک پہنچا دے۔ اس سے بابا خوش ہو جاتا اور شاید وہ دوبارہ آشا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

اپنی اس سوچ پر عمل کرنے کے لیے وہ تیار تھا۔ ردے ناتھ کے ٹھکانے کے بارے میں وہ ان لوگوں کی گفتگو کے دوران سن ہی چکا تھا۔ اس کے مطابق وہ قیدی کی حیثیت میں بھی روی کے بارے میں ردے ناتھ سے سودے بازی کر سکتا تھا۔ پھر وہ آزاد بھی ہو جاتا اور وہ حور پری آشا بھی اس کی ہو جاتی۔

اپنی اسی سوچ کی بنا پر وہ بے دھڑک بابا ردے ناتھ کے ٹھکانے تک پہنچ گیا اور توقع کے مطابق قید بھی کر لیا گیا۔ لیکن جیسے ہی اس نے بابا ردے ناتھ کو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

"پنڈت کاشی ناتھ"۔ وہ من ہی من میں بڑبڑایا۔

اب وہ پنڈت کاشی ناتھ عرف بابا ردے ناتھ کا قیدی تھا۔ وہ بابا کی جانب سے منہ پھیر چکا تھا اور اب اسے اپنا مستقبل پوری طرح سے مخدوش لگ رہا تھا۔ اس کشمکش میں وہ ردے ناتھ سے ایک لفظ بھی نہ بول پایا۔ لیکن اس جیسے گیانی پنڈت سے وہ اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ اس کی بھلائی اسی میں تھی کہ وہ خاموشی سے قید میں رہے اور ایشور سے اپنے پاپوں کی شما مانگتا رہے۔

کچھ ہی سال پہلے بابا ردے ناتھ یعنی پنڈت کاشی ناتھ کا ایک گھر تھا اور خوشیوں بھرا ایک چھوٹا سا خاندان' جس میں اس کی خوبصورت بہن اور اور ایک پیاری سی بہن تھی۔

اسی پاپی جن گبرال کی وجہ سے ردے ناتھ کو اس کی بیوی اور پھولوں سے نازک پیاری سی بہن سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ گبرال اس پنڈت پریوار سے کسی بھی طرح کی شکتی میں آگے تھا۔ مگر حالات ایسے بن گئے تھے کہ اس کی بیوی سرلا اور بہن دیپا کو اپنی جان گنوانا پڑی۔

پنڈت کاشی ناتھ نے اس حادثے سے پہلے موقع ملنے پر کئی بار الگ الگ بھیس میں گبرال کو پکڑا تھا مگر گبرال ہر بار رو رو کر ان سے معافی مانگتا رہا اور اپنی رحم دل طبیعت کی بنا انہوں نے ہر بار گبرال کو تنبیہہ کرتے ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ بابا کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ بات کر کے یا اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی صحیح پہچان جان جاتے تھے۔

جب کاشی ناتھ کی بیوی اور بہن کے ساتھ وہ حادثہ ہوا تب پنڈت کاشی ناتھ کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے۔ اور اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گبرال وہاں سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ پنڈت کاشی کس حال میں ہے۔

پنڈت کاشی ناتھ گیانی انسان تھے اور ان کے گیان سے ہزاروں لوگوں کو فائدہ پہنچ چکا تھا۔

اپنے سر پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے کے بعد کتنے ہی وقت تک وہ دیوانوں جیسی حالت میں رہے۔ جب انہیں تھوڑا ہوش آیا تب وہ پوری جن برادری کا دشمن بن چکا تھا۔

لوگوں نے محسوس کیا تھا کہ بابا کی شخصیت کی نرمی ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ اب کرختگی آ چکی تھی۔

کئی جنوں کو انہوں نے بھیانک موت سے دوچار کر دیا تھا۔ اس بار ان کا مقصد بڑے بڑے جنوں کو اپنے قبضے میں کر کے خود کو دنیا کا سب سے شکتی شالی آدمی بنا لینا تھا۔ اس مقصد کے پیچھے ان کی جنوں سے نفرت بھی شامل تھی۔

گبرال اب سوچ رہا تھا کہ وہ کبھی بابا سے مخاطب نہیں ہو گا اور نہ ہی روی اور آشا سے دشمنی کرے گا۔

حالات بڑے بڑے کٹھور اور ظالم انسانوں کو نیک بنا دیتے ہیں۔ یہ گبرال کس کھیت کی مولی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیسے ہی پنڈت کاشی ناتھ اسے پہچان گیا' اسے تڑپا تڑپا کر مار دے گا۔

اس لیے اب اس کا پہلا مقصد تھا روی کو اپنے اعتماد میں لینا اور اس کا وشواس جیتنا۔ کیونکہ یہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر اس کو آزادی مل سکتی تھی۔ حالانکہ وہ دل سے ابھی بھی بدلا نہیں تھا۔ مگر مصلحت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

فی الحال تو اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ روی پکڑا گیا یا نہیں۔ آشا کو ردے ناتھ نے کہاں رکھا ہوا تھا۔ اسے اب تک صرف وہ بڑا سا ہون کنڈ دکھائی دیا تھا جو کسی گپھا کے باہر تھا۔ اس میں سے لگاتار دھواں اٹھ رہا تھا اور کئی تانترک اس کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔

اسے بھی ویسے ہی شیشے کے گھر میں بند کر دیا گیا اور ردے ناتھ کے حکم پر ایک سادھو اسے اس شیشے کے گھر سمیت گپھا کے مرکزی دروازے کی طرف لے چلا۔

اس طرح سے وہ پہلی مرتبہ قیدی بنا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس بند کمرے میں سے باہر دیکھنے پر اسے سب بڑے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔

گپھا کے اندر اندھیرا تھا۔ ایک طرف دیوار پر لگی مشعل جل رہی تھی' اس کے باوجود اسے کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ اس کانچ کے گھر کو ایک بڑی سی چٹان پر رکھ کر وہ سادھو واپس جا رہا تھا۔

گپھا میں کافی الم غلم سامان جہاں تہاں بکھرا ہوا تھا۔ اس کے شیش محل سے بالکل قریب ویسے ہی کانچ کے زندان میں ایک اور قیدی بند تھا۔ غور کرنے پر وہ سمجھ گیا کہ وہ اسی کے قبیلے کا ایک سیوک جن تھا جو اس کی بہن وچترا کی سیوا میں رہتا تھا۔

"لگتا ہے اس بار چھٹکارا مشکل ہی ہو گا۔" اس نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے سوچا۔

پھر گپھا میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ "ارے یہ کون ہے؟" اس چٹان سے تھوڑا ہٹ کر زمین پر پھٹیل مزدور قسم کا آدمی سوکھی گھاس پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کلہاڑی اور ایک رسہ پڑا تھا۔

"روی...... کہیں یہ روی تو نہیں۔" ایک دشمن کو دیکھ کر آج اسے اپنا پن محسوس ہو رہا تھا۔

گبرال کو لے کر آنے والا تانترک گپھا سے ہون میں استعمال ہونے والا کچھ سامان لے کر باہر جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ گپھا کے دروازے سے باہر نکلا' اس اونگھتے ہوئے مزدور کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا' اور چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر تیز قدموں سے اس چٹان تک پہنچا جہاں دو شیشے کی بوتلوں میں دو جن قید دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے بعد میں لائی گئی بوتل کا ڈھکن کھول دیا۔ اس میں بند گبرال دھوئیں کی لکیر کے روپ میں باہر آ گیا اور اس پھٹیل مزدور کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس بوتل کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"او...... تیری...... میں اس میں بند تھا...... ہی ہی ہی...... میں سمجھا تھا کہ کسی شیشے کے کمرے میں بند ہوں۔ تم روی ہو؟"

"ہاں...... اور تم وہ جن ہو جس کی وجہ سے یہ مصیبت ہم پر آئی ہے۔" روی ناراضگی دکھاتا ہوا بولا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو دوست۔ لیکن میں شرمندہ ہوں۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

"تب پھر جیسا میں کہوں' تم وہی کرو گے' تبھی اس مصیبت سے نکل سکتے ہو۔ بہت ہوشیاری سے گھیرا بندی کی ہے ردے ناتھ نے' جس کا توڑ کوئی خرافاتی دماغ ہی سوچ سکتا ہے۔ یہ نصیحت میرے استاد الوکھ نے مجھے کی تھی۔"

"پھر اے خرافاتی انسان' جلدی بتاؤ' مجھے کیا کرنا ہے؟"

"سب سے پہلے تو اس بوتل میں تمہیں دکھائی دینا چاہئے۔ بوتل خالی نظر نہ آئے۔"

"تو کیا میں پھر بوتل میں گھس جاؤں؟"

"تم جنوں میں عقل تو ہوتی نہیں اور دوڑ پڑتے ہو انسانوں سے ٹکرانے۔ تم یہاں کسی مکھی' مچھر یا چیونٹی کو پکڑ لو' اسے اپنی شکل دو اور بوتل میں ڈال دو۔"

"اوہ...... او...... یار ہم سچ مچ اتنا نہیں سوچ پاتے۔"

روی کے کہنے کے مطابق فوراً ہی بوتل میں گبرال جیسی شکل کی مخلوق دکھائی دینے لگی۔ روی نے بوتل کو ڈھک دیا۔

دوسری بوتل میں وچترا کا ایک غلام شمون تھا۔ اسے بھی آزاد کیا گیا۔ دونوں جن بوتل سے باہر تھے اور بوتل میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔

"اب تم دونوں ہوشیار ہو جاؤ' شمون تم یہیں پر رہو اور گبرال تم میرے ساتھ۔"

روی پھر اسی گھاس پر جا کر بیٹھ گیا اور گبرال اس کے

نزدیک ہی نادیدہ حالت میں تھا۔

یہ گپھا کافی گہری تھی۔ چاروں طرف پتھروں کی سپاٹ دیواریں تھیں۔ آشا کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ گپھا کا پورا فرش تو ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ روی بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ابھی تک اسے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔

تب ایک تانترک اندر آیا اور چاروں طرف دیکھ کر مطمئن ہو کے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ روی نے اپنے من میں ہی گبرال سے کچھ کہا۔ پھر اس تانترک کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"بابا مجھے بھوک لگی ہے اور پھر گھر بھی جانا ہے۔" روی نے روہانسے لہجے میں کہا۔

"چپ چاپ پڑے رہو' تمہیں کہیں نہیں جانا۔"

"کیوں نہیں جانا' میں تو جاؤں گا ہی' تم پاپی اور ڈھونگی بابا ہو۔"

تانترک غصے سے روی کی طرف لپکا مگر دوسرے ہی لمحے روی اس تانترک کو بے بس کر چکا تھا۔

فکر کی بات یہ تھی کہ ردے ناتھ کا ایک تانترک کم ہو گیا تھا۔ مگر اب رسک تو لینا ہی تھا۔ جب تک بابا کو کچھ پتہ چلتا تب تک روی کو کچھ کر لینا چاہتا تھا۔ اور اس نے یہ کیا کہ گبرال کی مدد سے تانترک کو اپنا روپ دے کر خود اس کا روپ دھارن کر لیا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وہیں پر بیٹھا وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گپھا کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اور وہ چونک پڑا۔ چھت نظر نہیں آرہی تھی۔ اوپر کی طرف صرف اندھیرا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ گپھا کی بناوٹ کیسی ہے؟

روی نے گبرال سے بات کی اور گبرال چل پڑا اندھیروں کا راز ڈھونڈنے۔

کچھ ہی دیر میں وہ واپس آیا اور روی کا ہاتھ پکڑ کے ہوا میں اوپر اڑنے لگا۔ اس گپھا کی چھت سرنگ نما تھی۔ کافی اوپر جا کر سرنگ کا راستہ بند ہوتا چلا گیا۔ اوپر سپاٹ چھت تھی۔ چھت کے کنارے پر بڑے بڑے سوراخ تھے۔ یہ سوراخ اتنے بڑے تھے کہ کوئی آدمی جھک کر ان میں سے گزر سکتا تھا۔

گبرال اسے لیتا ہوا ان میں سے ایک سوراخ میں گھس گیا۔ وہ سوراخ بھی ایک سرنگ نما راستہ تھا۔ کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ اتنی اونچائی پر بنی اس سرنگ تک آسانی سے پہنچ جاتا۔

کبھی چڑھائی تو کبھی ڈھلوان نما وہ سرنگ شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

گبرال کا ساتھ ہونے کی وجہ سے روی بہت تیزی سے سرنگ کا راستہ پار کر رہا تھا۔

اور پھر انہیں اس سرنگ کا سرا مل ہی گیا۔ لیکن اتنی پریشانی کا کچھ اچھا انعام نہیں ملا تھا۔ وہ سرنگ اس طرف ایک دوسری پہاڑی کے پاس کھلی ہوئی تھی۔ سامنے دور دور تک جنگل دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی بھی وہ کافی اونچائی پر تھے۔

"ابے تُو نے پہلے خود کیوں نہیں دیکھ لیا تھا' اب کیا کرو گے۔" روی وہیں سرنگ کے دہانے کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم بس دو منٹ یہیں بیٹھو' میں سبھی سرنگوں کو دیکھ کے آتا ہوں۔ اگر کچھ نہیں ملا تو ہم اس پہاڑ سے باہر نکل کے دیکھیں گے۔"

"پہاڑ سے باہر نکلتے ہی بابا ردے ناتھ تمہیں دبوچ لے گا۔ کیونکہ وہ اپنی جادوئی شکتی سے نادیدہ جن کی موجودگی بھی جان سکتا ہے۔" روی نے اپنی فکر ظاہر کی۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پہلے میں پہاڑ کے اندر کی سرنگوں کو دیکھتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گیا۔

روی اس وقت پہاڑ کی چوٹی پر بنے جس سوراخ میں بیٹھا تھا وہاں کوئی پرندہ یا کیڑے ہی پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سے باہر دور تک پھیلی چھوٹی بڑی گھاٹیوں اور ہرے بھرے جنگل کو دیکھتا ہوا روی آشا کے بارے میں سوچ

رہا تھا۔ نہ جانے کس حالت میں ہوگی۔ کتنے گھنٹے گزر گئے' کتنی پریشان ہو رہی ہوگی۔ کتنا انتظار کر رہی ہوگی۔

جنوں کی وجہ سے جہاں ایک طرف وہ اس دنیا میں زندہ تھا' وہیں دوسری طرف انہی جنوں کی وجہ سے آشا کو کئی بار پریشان ہونا پڑا تھا۔

اس کی سوچوں کا سلسلہ جاری تھا کہ گبرال آ گیا۔ بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ روی کو حیرت ہوئی۔ گبرال اسے حیرت زدہ دیکھ کر بولا۔

"کچھ مت بولو' بڑی اچھی خبر ہے' بس چلو میرے ساتھ۔" اس نے روی کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ روی کو غصہ آ گیا لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر حیرت بھری خوشی سے اچھل پڑا۔

اس پہاڑ کے اندر سرنگوں کا جال بنا ہوا تھا' ٹھیک ویسے ہی جیسے زمین کے اندر چوہوں کے بل ہوتے ہیں۔

دونوں اس وقت ویسی ہی ایک سرنگ کے منہ پر کھڑے تھے۔ سامنے نیچے ایک گپھا دکھائی دے رہی تھی۔ مشعل کی دھیمی روشنی پوری گپھا میں پھیلی ہوئی تھی۔

اب بھی وہ دونوں گپھا سے کافی اونچائی پر تھے۔ پہلے والی گپھا سے نہ جانے کس طرف تھی یہ گپھا۔

روی نے دیکھا کہ گپھا میں پڑے ایک بڑے سے پتھر پر آشا بیٹھی ہوئی تھی۔ سر جھکائے' بالکل نڈھال سی۔ اسے دیکھ کر ایک طرف تو روی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' وہیں دوسری طرف حالات دیکھ کر اس کا منہ دکھ اور غم سے بھر اٹھا تھا۔

"چلو ہم نیچے گپھا میں چلتے ہیں۔" گبرال اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"نہیں...... تم نیچے جاؤ اور فوراً آشا کو لے کر یہیں آ جاؤ۔ لیکن سنو...... آشا کو یہاں چھوڑ کر تم فوراً پہلے والی گپھا میں چلے جاؤ گے۔ میرا پیغام ملتے ہی یہاں آ جانا۔ اگر مجھ سے چھپ کر یہاں موجود رہے تو میں تمہیں جلا کر بھسم کر دوں گا۔"

روی ابھی جنوں کے ساتھ رہ کر بڑا ہوا تھا۔ اس لیے وہ ان جنوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ روی کے پاس بھی وہ شکتی تھی کہ وہ کسی نادیدہ جن کو دیکھ سکتا تھا۔

جنوں کو دنیا میں سب سے زیادہ ڈر انسانوں سے لگتا ہے۔ بہت سے ایسے انسان تھے جو انہیں اپنے قبضے میں رکھ سکتے تھے۔ جنوں کو انسانوں کی طرف سے ملنے والی سب سے بڑی سزا ہوتی ہے انہیں جلا دینا۔

کچھ ہی پل میں آشا' روی کے سامنے کھڑی تھی۔

گبرال روی کو اپنی بتیسی دکھاتا ہوا بھاگ گیا۔

اب روی اور آشا ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ روی نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور آشا کسی بیل کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں سے بہتے آنسو روی کے شانوں کو بھگو رہے تھے۔

روی کے ہاتھ اس کے سر اور پیٹھ کو سہلا رہے تھے۔ آشا کا بدن رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ جب آشا کچھ سکون سے ہوئی تو روی نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کیا اور سرخ گالوں پر بہتے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی سے صاف کیا۔

"روی چلو...... جلدی مجھے گھر لے چلو۔" آشا سسکتی ہوئی بولی۔

"جان...... میں آ گیا ہوں نا' ہم چلیں گے' جلدی نہیں' چاروں طرف ردے بابا کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے نمٹے بنا ہم نہیں نکل سکتے۔"

"تو...... تم ان سے مقابلہ کرو گے؟"

"ہاں...... اور اس بابا کو اس بار اچھی طرح سبق سکھاؤں گا تاکہ وہ پھر ایسی حرکت نہ کر سکے۔"

"اور کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"ابھی تو بس یہ گبرال ہے' یہی وہ جن ہے جو تمہیں گھر سے اٹھا کر لے گیا تھا۔" پھر روی نے اسے گبرال کے بارے میں بتایا کہ کس طرح وہ ایک دشمن سے دوست بن چکا ہے۔

روی نے گبرال کو آواز دی اور وہ حاضر ہوگیا۔

روی کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ آشا کو کہاں چھوڑے۔ اس کی حفاظت سب سے ضروری تھی۔

جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے گبرال سے وچترا کے سیوک کو بلا کے لانے کو کہا۔ اب بنا کوئی خطرہ اٹھائے کام بننے والا نہیں تھا۔

گبرال تو اس طرح روی کا ساتھ دے رہا تھا جیسے وہ جنم جنم سے روی کا دوست ہو۔ جب بھی خود پہ خطرہ منڈلاتا ہے تو دوستی اور دشمنی کا انداز بدل جاتا ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

اس وقت روی اور گبرال کا ایک ہی دشمن تھا' بابا ردے ناتھ۔ یہی وجہ تھی کہ گبرال بلا چوں چرا روی کا ساتھ دے رہا تھا۔

بابا ردے ناتھ سے جتنا خطرہ روی اور آشا کو تھا اس کہیں زیادہ گبرال کو تھا۔ ردے بابا کو تھوڑا بھی شک ہوجاتا کہ وہی وہ جن ہے جس کی وجہ سے اس کا پورا خاندان تباہ ہوگیا تو وہ اسے قید کرنے کی بجائے سیدھا جلا ڈالتا۔

لیکن انسان کتنا بھی عقلمند ہو' اس کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ ردے بابا کی آنکھوں پر مہا شکتی مان بن جانے کے سپنے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ورنہ جب اس نے گبرال کو قید کیا تھا تو تھوڑی بھی چھان بین کرنے پر وہ جان جاتا کہ یہی اس کا سب سے بڑا دشمن جن ہے۔

گبرال تو روی اور آشا سے اپنا بدلہ چکانے آیا تھا مگر ردے بابا کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔

گبرال نے روی سے کہا کہ آشا کو وچترا کے سیوک کے ساتھ پہاڑ کے پیچھے والے راستے سے نکال دیا جائے۔ لیکن روی آشا کے معاملے میں ایسا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ دوبارہ آشا کے پکڑے جانے پر ردے بابا پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔

دونوں آشا کو وچترا کے سیوک کے ساتھ چھوڑ کر نکل پڑے۔

روی نے گبرال سے پہاڑ کی پچھلی سرنگ کے دہانے پر جاکر بابا سکندر اور وکرال سے رابطہ کرنے کو کہا۔ اس سے پتہ بھی چل جاتا کہ بابا ردے ناتھ نے اس طرف بھی اپنا منترا جال پھیلا رکھا ہے یا نہیں۔

گبرال' روی کے ساتھ اسی جگہ پہنچ گیا جہاں کچھ دیر پہلے روی کو اکیلا چھوڑا تھا۔ تبھی روی کے دماغ میں ایک نیا خیال آیا۔

اگر ردے بابا نے ٹیلی پیتھی کی لہروں کو اپنے منترا کے ذریعے ٹریس کرلیا تو بڑے آرام سے گبرال کا پتہ لگا کے اسے اپنی قید میں آنے پر مجبور کردیتا۔

لیکن اگر وہ خود ٹیلی پیتھی کے ذریعے پیغام بھیجتا ہے تو ردے بابا اس کا پتہ نہیں کر پائے گا' کیونکہ وہ جن نہیں انسان ہے۔

یہی سوچ کر شاید استاد الوکھ نے اس مہم کے لیے روی کے دماغ میں ٹیلی پیتھی کی شکتی ڈال دی تھی۔

روی نے وکرال سے رابطہ کیا اور بڑی آسانی سے وہ وکرال کے دماغ تک پہنچ گیا۔ اس نے وکرال کو یہاں کی صورت حال کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور وکرال کو آگے کا منصوبہ بھی بتا دیا۔

اس کے بعد دونوں تھوڑی دیر وہیں رک کر اپنی اس حرکت کے نتیجے میں کسی ہلچل کے انتظار میں بیٹھے رہے لیکن جب کچھ دیر گزر جانے کے بعد بھی ردے بابا کی منترا شکتی کا کوئی نمونہ دیکھنے کو نہیں ملا تب دونوں بہت خوش ہوگئے۔ ردے بابا کے خلاف اٹھائے گئے پہلے قدم پر یہ ان کی کامیابی تھی۔

دونوں واپس وہاں آئے جہاں آشا تھی۔ آشا اور سیوک کو کچھ ضروری باتیں سمجھا کر وہ گبرال کے ساتھ پہلے والی گپھا میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک تانترک ادھر ادھر دیکھتا ہوا کچھ کھوج رہا تھا۔

تب وہ تانترک اس مزدور کی شکل میں موجود اپنے ساتھی کے پاس گیا۔

''اے...... کیا تھوڑی دیر پہلے یہاں میرے جیسا کوئی آدمی آیا تھا۔''

''م...... میں کچھ نہیں جانتا...... مجھے کچھ پتہ نہیں۔''

روی سمجھ گیا کہ وہ اپنے غائب ہونے والے ساتھی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر واہ ری قسمت...... اپنے ساتھی سے ہی اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ لیکن وہ تو گبرال جیسے جن کے زیر اثر تھا' وہ کیا بتاتا۔

''عجیب بے وقوف آدمی ہے۔'' وہ تانترک بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

''اب ہم کیا کریں' کیا ردے بابا کے ان چھوٹے چھوٹے تانترکوں پر ایک ایک کرکے حملہ کریں؟'' گبرال نے پوچھا۔

''ہاں...... کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ٹھیک ہے تم مجھے پہلے کی طرح مزدور کا روپ دے دو' اور اس تانترک کو غائب کردو۔''

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تانترک غائب ہوگیا اور روی نے اس کی جگہ لے لی' گبرال روی کے ساتھ ہی تھا۔

کچھ ہی دیر بعد تین تانترک ایک ساتھ گپھا میں آئے۔ روی انہیں دیکھ کر چلانے لگا۔ تینوں تیزی سے اس کی طرف آئے۔

''کیا بات ہے۔ کیوں شور مچا رہے ہو؟''

''مجھے جانا ہے' میں اپنے گھر جاؤں گا۔ تم سب چور ہو' میں دیکھ لوں گا تم سب کو۔ تم ڈھونگی پنڈت مجھ سے جیت نہیں سکتے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک تانترک سے بھڑ گیا۔ اور باقی دو تانترک بھی بنا سوچے سمجھے روی سے بھڑ گئے۔ گبرال کو تو ایسا ہی موقع چاہئے تھا۔ دو تانترکوں کو تو اس نے بے ہوش کرکے غائب کردیا۔ تیسرا تانترک ہوشیار ہوگیا۔ اپنے دو ساتھیوں کو غائب پاکر وہ جلدی جلدی کوئی منتر پڑھنے لگا۔ لیکن اس کا منتر کسی غیبی شکتی پر حملہ کرنے والا نہیں بلکہ خود کی حفاظت کرنے والا تھا۔ یہ اس کے بہت زیادہ ڈر جانے کا ثبوت تھا' اگر وہ تانترک چاہتا تو اپنی منترا شکتی سے اسی وقت گبرال کو اپنے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا کرسکتا تھا۔ مگر روی ایک انسان ہونے کے ناتے انسانی فطرت کو جانتا تھا۔

وہ تانترک سوچ بھی نہیں سکتا تھے کہ ایک پھٹیل مزدور کے روپ میں روی جیسا عقلمند اور شکتی مان انسان ہوگا۔ یہی دھوکہ انہیں لے ڈوبا۔

وہ تانترک اپنے بچاؤ کا منتر پڑھتا ہوا گپھا سے باہر بھاگا۔ اتنی دیر میں روی کی جگہ ایک تانترک کو اس کی یادداشت بھلا کر رکھ دیا گیا اور روی غائبانہ حالت میں آگیا۔ روی نے اپنی ٹیلی پیتھی کو استعمال کرکے جلدی سے اپنا منصوبہ وکرال کو بتایا اور خاموشی سے آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔

......☆☆☆......

روی سوچ رہا تھا کہ اگر اس بار بابا ردے ناتھ خود آگیا تو وہ اس کا مقابلہ کیسے کرے گا۔ اسے آشا کی فکر بھی لگی ہوئی تھی اور وہ گبرال کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ ردے بابا تو فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے گا۔ تب گبرال کا کیا ہوگا۔ روی گبرال کو ایک معمولی شرارتی جن سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں گبرال کسی طرح ردے بابا کے جال میں پھنس گیا ہوگا اور اپنے بچاؤ کے لیے روی کا ساتھ دے رہا ہے۔

اسے پتہ نہیں تھا کہ اگر ردے بابا نے گبرال کو پہچان لیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

کچھ ہی وقت گزرا ہوگا کہ گپھا کے دروازے سے ردے بابا اپنے پانچ چھ ساتھیوں کے ساتھ تیزی سے آتا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا روی کا مزدور والا روپ لیے اپنے ساتھی تانترک کے پاس پہنچا۔ بابا نے اس آدمی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کردیا۔

''اے دشٹ انسان...... کون ہے تُو...... جلدی بتا۔ تُو جو کوئی بھی ہے مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکے گا...... جلدی بتا۔''

روی نے دیکھا کہ یہ سب کہتے ہوئے بھی بابا کے

انداز میں مکمل اطمینان تھا۔ اس کی آواز میں کرختگی ضرور تھی، مگر فکر مندی کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔

"گبرال تو گیا۔ بابا اسے ضرور پکڑ لے گا۔" روی سوچ رہا تھا کہ ابھی بھلے ہی بابا اسے پکڑ لے گا مگر بعد میں وہ اسے ضرور چھڑا لے گا۔

اس کاٹھ کے الو مزدور کا روپ لیے تانترک سے انہیں کیا جواب ملنا تھا۔ وہ کچھ کچھ بے سر پیر کی آوازیں نکال رہا تھا۔

"خاموش کیوں کھڑا ہے، کچھ تو بول۔" لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ردے بابا نے کوئی منتر پڑھ کر اس آدمی کی طرف پھونک ماری۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے اصلی روپ میں آ گیا۔ بابا اور اس کے ساتھی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بابا نے اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ پلٹا اور تیزی سے چٹان کی طرف گیا جہاں دو بند بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔

بابا نے زیر لب کچھ منتر بڑبڑاتے ہوئے بوتل کے ڈھکن کھول دیے۔ کچھ پل گزرنے کے بعد بھی کوئی نئی بات نہ ہونے پر بابا کو تشویش ہوئی۔ دونوں بوتلوں کو ہاتھ میں لے کر کچھ منتر پڑھے پھر دونوں بوتلوں کو پلٹ دیا۔ بوتلوں میں سے دو مکھیاں اڑ کر باہر نکلیں اور بابا کی ناک پر بیٹھ گئیں۔ اب بابا کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ ان مکھیوں کو مارنے کے لیے انہوں نے تیزی سے اپنا ہاتھ چلایا۔ مکھیاں تو اڑ گئیں لیکن بابا اپنی ناک کو چوٹ پہنچا چکے تھے۔

بابا نے اپنے آپ پر قابو پایا اور دوبارہ سے ان کی حالت میں اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ پھر کسی منتر کا جاپ کرنے لگے۔ روی نے دیکھا کہ گبرال کانپتا ہوا ہاتھ جوڑے بابا کے سامنے حاضر ہو گیا۔ بابا کا منترا جاپ جاری تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گبرال دھوئیں کی لکیر میں بدل گیا اور وہ دھواں ایک بوتل میں گھس گیا۔

بابا نے وہ بوتل ایک تانترک کو پکڑائی اور اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے گپھا کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ بابا کے لیے یہ ایک عام سی صورت حال نہیں تھی۔ عام حالات میں وہ پہلے دوسرے جن کو کھوجتا، اس کے ساتھ ہی وہ اس مزدور کے بارے میں بھی پتہ لگاتا کہ وہ کہاں گیا۔ اب شاید وہ اس گپھا میں جا رہا تھا جہاں انہوں نے آشا کو قید کر رکھا تھا۔

روی بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اسی پہاڑی کی دوسری طرف کی گپھا میں سب داخل ہو گئے۔ روی نے دیکھا کہ یہ وہی گپھا تھی جہاں کچھ دیر پہلے تک آشا ایک چٹان پر بیٹھی تھی۔

اب آشا تو وہاں تھی نہیں۔ ردے بابا کی شکل دیکھنے لائق ہو رہی تھی۔ اتنی محنت پر پانی پھر رہا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے شکار اس کے آس پاس ہی موجود ہیں۔ بابا کو صرف یہی فکر لگی ہوئی تھی کہ جنوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے ہاتھ آیا ہوا سب سے قیمتی مہرہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

بابا اور اس کے ساتھی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ تبھی بابا کو کچھ یاد آیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے وہ بوتل لی جس میں گبرال بند تھا۔ کچھ منتر پڑھتے ہوئے بابا نے بوتل کھول دی۔ گبرال بابا کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

جنوں کی اپنی کوئی مستقل شکل نہیں ہوتی۔ وہ پل پل اپنی شکل بدل سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ردے ناتھ گبرال کو پہچان نہیں رہا تھا۔

"کون ہو تم...... نام کیا ہے؟" بابا نے کڑکتے لہجے میں گبرال سے پوچھا۔

"گبرال۔" بابا کی منترا شکتی کے سامنے گبرال جھوٹ نہیں بول سکا تھا۔

"گبرال......" بابا چیخا۔ "کیا وہی گبرال جس کی وجہ سے میری معصوم بہن اور میری پتنی کی جان گئی؟" اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"ہاں بابا...... وہی گبرال...... لیکن اپنے پریوار کو برباد کرنے میں خود تمہارا بھی ہاتھ تھا۔"

"ہاہاہا...... بہت دنوں سے میں تمہاری کھوج میں تھا۔ آج تو میرے ہاتھوں بھسم ہوگا۔" اس کی آواز کی کٹھورتا سے روی کے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

روی اس بات پر دیر سے غور کر رہا تھا کہ ردے بابا کے پاس غیبی انسان کو کھوج نکالنے کا منترا نہیں ہے کیا؟ یا حالات کی وجہ سے وہ اس طرف دھیان نہیں دے پایا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وچترا کا وہ سیوک جو آشا کے پاس تھا۔ وہ بھی ردے بابا کے پاس نہیں آیا تھا۔

روی ان باتوں کو سوچتے ہوئے آگے کے حالات کے بارے میں بھی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

گبرال کی حالت خراب تھی۔ وہ خود کو چاروں طرف سے ان دیکھی دیواروں میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ردے بابا نے منتر پڑھ کر اپنے ہاتھ اس کی طرف اٹھائے۔

گبرال کو شدید بے چینی ہو رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے ہر طرف سے آگ کے شعلوں میں قید ہو گیا ہو۔ جلن اور تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

"مجھے معاف کردو بابا...... مجھے معاف کر دو۔" جب جلن برداشت نہ ہو پائی تو وہ شدت سے چلا اٹھا۔ بابا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "میں اپنے سب گناہ قبول کرتا ہوں...... اب آئندہ کبھی کسی انسان کو نہیں ستاؤں گا۔"

"تم اب کبھی کسی انسان کو ستانے کے لائق رہو گے ہی نہیں۔ میں تجھے ماروں گا نہیں۔ لیکن اب تم کسی انسان کے سامنے چھپ کر یا روپ بدل کر نہیں جا سکو گے۔"

روی سمجھ گیا کہ گبرال نے بابا کو کوئی بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اسے خود ایسے کاموں سے نفرت تھی۔ گبرال کو بچانے کا کام اب اس کی فہرست میں نہیں تھا۔

"دوسرا جن اور وہ مزدور کہاں ہے؟" آخر کار بابا نے گبرال سے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔

"میں سب بتا دوں گا...... آشا کہاں ہے یہ بھی بتا دوں گا...... بابا...... لیکن مجھے معاف کر دو۔" خود کو خطرے میں دیکھ کر اور اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ کمینہ پن دکھا رہا تھا۔ روی کو اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اسے اب آشا کی فکر ہونے لگی تھی۔ نہ جانے یہ کمینہ جن کب آشا کو ردے بابا کے حوالے کر دے۔

"ٹھیک ہے میں تمہاری معافی کے بارے میں سوچوں گا۔ لیکن تو بتا پہلے۔"

"دوسرا جن اور آشا ایک ہی جگہ پر ہیں۔" ابھی وہ اتنا ہی بول پایا تھا کہ ردے بابا بے چینی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر دوڑتا ہوا گپھا سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے باہر جا چکے تھے۔

روی بھی ان کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔ باہر ایک بڑا سا ہون کنڈ تھا۔ بابا اور اس کے ساتھی تانترک اس ہون کنڈ کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے اونچی آواز میں منتر پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ہون کنڈ میں کچھ ڈالتے بھی جا رہے تھے۔ ہون کنڈ سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا جو آس پاس پھیلتا جا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں روی نے دیکھا کہ کئی جن آ آ کر گرتے جا رہے ہیں۔

ہر طرف زخمی جن بکھرے پڑے تھے۔ ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں اتنے جن کہاں سے آ رہے تھے۔ تب ایک لمبا چوڑا جن تیزی سے بابا کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ بابا سر اٹھا کر بھیانک آواز میں چلایا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

چاروں طرف اتنا دھواں تھا کہ کسی کی شکل صاف صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جن آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔

ردے بابا کی آنکھوں میں بے پناہ چمک آ گئی تھی۔

"آؤ بڑے جن...... آج سے تو ہمارے سیوک جنوں کا سردار ہوگا۔" بابا قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

اب روی کو اس بڑے جن کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔

"استاد الوکھ۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ اور بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب

ہوسکا۔

استادالوکھ روی کا گرو تھا۔ بچپن سے وہ اور وکرال ان کے ساتھ رہے تھے۔ اس نے استاد سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ استادالوکھ ان دونوں کے ساتھ دوستوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ اور روی سے تو انہیں بہت پیار تھا۔ اور وہ تھا بھی بہت خوش مزاج جن۔ روی ان کی شکتیوں کو جانتا تھا۔ اس قبیلے میں سب سے شکتی شالی بابا سکندر تھے اور ان کے بعد استادالوکھ کا نمبر آتا تھا۔

نہ صرف اس قبیلے کے جن بلکہ دوسرے قبیلوں کے جن بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور وہ ہر وقت دوسروں کے کام آنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

استادالوکھ آگے بڑھنا چاہ رہے تھے لیکن روی کو لگا جیسے کسی نادیدہ شکتی نے انہیں جکڑ رکھا ہو۔ وہ اس جال سے نکلنے کی پوری کوشش کر رہے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔

"کیسے بے وقوف ہو تم۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ کتنے جن یہاں بکھرے پڑے ہیں۔ تم اپنی شکتی کے بل پر کھڑے ہو یہی بہت ہے۔ زیادہ ہاتھ پیر مت ہلا اور شانت رہو۔"

"ردے ناتھ، تُو ایک پاپی پنڈت ہے..... تُو نے اپنے گیان کا غلط استعمال کیا ہے۔ ایشور تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ معصوم جن ہیں۔ تمہارا کیا بگاڑا ہے انہوں نے جو تُو نے ان کا یہ حال کیا ہے۔ تیرا برا حشر ہوگا۔" استادالوکھ کو جنوں کی حالت پر بہت دکھ ہو رہا تھا۔ انہوں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"شانت رہ جنات کی اولاد۔ تُو اب اپنی خیر منا۔ اتنے جنوں کی مجھے بھی ضرورت نہیں۔ میں انہیں جلا دوں گا۔ انہوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی ہے۔" بابا کے لہجے میں غرور تھا۔

"پہلے تُو اپنی خیر منا دشٹ پاپی۔ تیرے پاپ کا گھڑا بھر چکا ہے۔ تیرا انت بہت قریب ہے۔" استادالوکھ نے نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تُو..... جن کی اولاد..... بہت بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے۔ یہ لے اپنا انعام۔" بابا نے منتر پڑھ کر استادالوکھ کی طرف کچھ مٹی پھینکی۔ روی نے دیکھا استادالوکھ کے چہرے پر تکلیف کا تاثر تھا۔ اسے ردے بابا پر بہت غصہ آ گیا۔

روی کے لیے اب برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ استادالوکھ کی توہین ہوتے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اب تک ردے بابا کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ پھر بھی انسانی فطرت کی بنا پر وہ چھپ کے بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے فوراً وچترا کے سیوک سے اپنا ذہنی رابطہ جوڑا۔ "مجھے جلدی سے ایک تانترک کا روپ دے دو لیکن میں نادیدہ ہی رہوں گا۔ جب ضرورت پڑے گی تب میں سب کے سامنے آ جاؤں گا۔"

اب روی ہون کنڈ کے پیچھے کھڑے تانترکوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ایک تانترک کو دوسرے تانترک کی طرف زور سے دھکا دیا۔ وہ تانترک دوسرے کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ ابھی وہ تانترک سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے منہ پر روی کا زوردار گھونسا پڑا۔

اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ اپنا خون دیکھ کر وہ تانترک پاگلوں کی طرح اپنے ساتھی پر جھپٹا اور اس پر گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دوسرے تانترک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر اپنی حفاظت کے لیے اسے بھی اپنے ساتھی سے بھڑنا پڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہو کر لڑ رہے تھے۔

انہیں لڑتا دیکھ کر دوسرے تانترک انہیں چھڑانے کے لیے دوڑے۔ اب تھوڑی دوری پر روی نے کسی دوسرے تانترک پر اس طرح سے اپنا گھونسا آزمایا کہ اس تانترک کو لگا کہ اسی کا کوئی ساتھی اسے مار رہا ہو۔

اب حالت یہ تھی کہ ردے بابا کے سارے تانترک ساتھی ایک دوسرے پر لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں کا بے دھڑک اور بے حساب استعمال کر رہے تھے۔ ردے بابا

چلا چلا کر تھک گئے مگر وہ سب کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔

مجبوراً ردے بابا کو ان کے جھنڈ میں گھسنا پڑا۔ روی تو اسی موقعے کی تلاش میں تھا۔ اب اس کا مرکزی ہدف بابا تھا۔ تھوڑی دیر میں بابا سمیت سارے تانترک بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ سب بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔ بابا کا منترا جال ٹوٹ چکا تھا۔ استادالوکھ اور روی ایک ساتھ ردے بابا کے دماغ کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔

ردے بابا کو دو چار دماغی جھٹکے دے کر وہ دونوں کافی دیر کے لیے مطمئن ہو چکے تھے۔

تب روی دوڑ کر اپنے استاد سے لپٹ گیا۔ جذبات کے بہاؤ میں آ کر وہ استاد کا منہ چومنے لگا۔

استاد بس بس کی رٹ لگاتے رہ گئے اور روی تو بس کسی بچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح استاد کے پورے چہرے کو گیلا کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"میرا بچہ..... میرا بچہ۔" کوئی چارہ نہ دیکھ کر استاد الوکھ نے روی کو زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

استاد کی جناتی طاقت کا نمونہ دیکھتے ہی روی ہوش میں آ گیا اور استاد سے الگ ہو کر شرمندہ سا کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے روی..... بڑے جذباتی ہو رہے ہو..... آشا بٹیا ابھی تک نہیں ملی کیا؟" استاد نے مسکراتے ہوئے روی سے پوچھا۔

"مل چکی ہے استاد..... مگر۔" روی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر منہ لٹکا کر کھڑا رہا۔

"مگر..... مگر کیا..... آشا مل گئی ہے تو پھر کہاں گئی؟" استادالوکھ نے پریشانی سے پوچھا۔

"وہ اب اتنی اونچائی پر ہے..... جہاں میں نہیں پہنچ سکتا۔" روی نے ویسے ہی سر جھکائے جواب دیا۔ اب تو استاد چونک پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں کوئی انہونی تو نہیں ہو گئی۔

انہوں نے روی کو جھنجوڑ کر پوچھا۔ "کیا بک رہے ہو، جلدی بتاؤ کہاں ہے آشا؟"

تب روی، استادالوکھ کو گپھا میں لایا اور اوپر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "آشا، ادھر اوپر ہے۔" استادالوکھ جلدی سے روی کا بازو پکڑ کر اوپر پہنچے۔ وہاں اس خاص سرنگ میں روی انہیں لے گیا جہاں آشا بیٹھی تھی اور وہ سیوک جن چوکنا کھڑا تھا۔

استاد نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے ایک زوردار ہاتھ روی کی پیٹھ پر جمایا۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو استاد کے اس دھپ سے بے ہوش ہو جاتا۔ روی جھوٹ موٹ منہ بسورنے لگا۔ یہ دیکھ کر آشا بھی ہنس پڑی۔ کتنے وقت کے بعد آشا کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ ابھری تھی۔

"جاؤ..... آشا کو لے کر تم سیدھا گھر جاؤ..... ہم یہاں کے باقی کام نمٹا لیں گے۔"

"استاد ان سب نے آپ کی توہین کی ہے..... میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" روی کو اچانک ردے بابا کی شیطانی حرکت یاد آئی اور وہ طیش میں آ کر بولا۔

"ردے بابا..... وہ آگے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تمہیں کچھ نہیں پتہ..... گبرال بے ہوش ہو چکا تھا اور تم نادیدہ نہیں رہے تھے۔..... پھر سوچو کہ تمہیں تانترکوں اور ردے ناتھ نے کیوں نہیں دیکھا؟"

اب روی کے حیران ہونے کی باری تھی۔ گبرال نے اسے نادیدہ بنایا تھا۔ پھر گبرال کو ردے بابا نے سزا دی تھی اس وقت اس کی حالت بہت خراب تھی۔ روی جانتا تھا کہ کسی کا بھی طلسم اس کے ہوش و حواس میں رہنے تک ہی قائم رہتا ہے۔

"پھر کیا ہوا تھا استاد؟"

تمہارے بھی اپنے یہاں موجود ہیں۔ بابا سکندر، وکرال، وچترا اور ان کے سبھی ساتھی۔"

استادالوکھ نے روی اور آشا کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں کو ایک ہلکا جھٹکا سا لگا اور دونوں وکرال اور بابا سکندر کے سامنے کھڑے تھے۔ بابا سکندر کو دیکھ کر روی کی آنکھوں

میں آنسو آ گئے۔

وہ جانتا تھا کہ بابا سکندر کسی معمولی کام کے لیے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے لیکن روی اور آشا کی وجہ سے انہیں یہاں آنا پڑا تھا۔ بابا سکندر نے روی کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ وکرال نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

جب جذبات کی تیزی میں کچھ کمی آئی تو استاد الوکھ نے کہا۔ ''ہم ردے ناتھ کے پھیلائے ہوئے منترا جال پر قابو پا چکے تھے۔ لیکن اس کا اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا...... ہمارے جن، جنہیں تم نے زخمی ہو کر گرتے دیکھا تھا وہ سب بالکل ٹھیک ہیں۔ ہم اس کے منترا کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن تم نے اپنا خرافاتی دماغ استعمال کر کے ردے ناتھ کو پہلے ہی پٹخ دیا۔''

استاد الوکھ کی بات پر سب ہنسنے لگے۔

......☆☆☆......

آشا کے گھر میں صبح سے ہی سناٹا پڑا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک ہوتے حادثات نے پورے گھر کو وحشت زدہ کر دیا تھا۔

اب نہ موسی کا غرور بھرا انداز دکھائی دے رہا تھا۔ نہ چاچی جی کا بے وجہ نوکروں پر چیخنا چلانا۔ حد تو یہ ہے کہ سیما اور نکیتا بھی بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔

مگر سب کے بدلنے کی وجوہات الگ الگ تھیں۔ چاچا جی کو اپنی بھتیجی کی فکر تھی۔ صبح سے آشا غائب تھی۔ روی اپنے بھائی اور اپنے استاد کے ساتھ اس کی کھوج میں گیا تھا لیکن ان میں سے کسی کا اب تک کوئی پتہ نہیں تھا۔

شام ہونے کو آ رہی تھی۔ گرمی کا وہی حال تھا۔ گھر کے حادثات کی وجہ سے ایئر کنڈیشن میں بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔

چاچا جی کو روی کے بھائی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ شادی کے ڈر سے گھر سے بھاگا تھا۔ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پھر کافی دنوں سے وہ ان کے پاس ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ''تو کیا روی آشا کو پسند کرتا ہے؟''

انہیں آشا کے لیے روی کا پریشان ہونا یاد آیا۔ کیسی دیوانوں جیسی حالت ہو گئی تھی اس کی۔

کتنی اچھی جوڑی ہو گی ان کی۔ چاچا جی کو روی کی حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ کتنی قیمتی کار تھی اس کی۔

چاچا جی کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر دوسرے ہی پل آشا کی موجودہ گمشدگی یاد آجانے پر ان کا چہرہ پھر سے فکرات میں ڈوب گیا۔

یہ انسانی فطرت کا کمال ہے کہ بری سے بری گھڑی میں بھی کوئی اچھی بات یاد آ جانے پر انسان مسکرانے لگتا ہے۔

آشا کی فکر تو گھر میں سب کو تھی لیکن گھر میں پھیلے اس سناٹے کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔

چاچی جی کی نظروں سے روی کی قیمتی گاڑی نہیں ہٹ رہی تھی۔ روی اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ سیما اور نکیتا کو کتنی بار کار میں کالج اور بازار لے جا چکا تھا۔ کچھ تو پسند ہو گی اس کی۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کسی کو پسند کر لے تو کیا بات ہے۔

چاچی جی کو ایک بار بھی دماغ میں نہیں آیا تھا کہ روی کی شادی آشا سے ہو جائے۔ انہیں تو بس اپنی بیٹیوں کی فکر ستا رہی تھی۔

سلیکھا موسی کے دماغ پر آشا کم اور استاد الوکھ زیادہ قبضہ کیے ہوئے تھے۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ دھوتی والا زیادہ اچھا تھا یا سوٹ والا۔ بیچاری چکرائی ہوئی تھیں۔ اسی چکر میں ان کا فطری سلوک بدل گیا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگی تھیں۔ اس سوٹ والے کی باتوں کو یاد کر کے تو کسی کنواری لڑکی کی طرح شرما بھی جاتی تھیں۔

''ہے رام...... یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے اب اس عمر میں...... نہیں نہیں......'' اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتیں۔ دروازے پر ہونے والی ہر آہٹ پر انہیں لگتا کہ دونوں میں سے کوئی ایک آ گیا ہو۔ انہیں لگتا کہ

دھوتی والا شاید ان سے ناراض ہو گیا ہو۔ لیکن تھا کتنا سوہنا۔

ٹھیک ہے...... دونوں سے ایک ساتھ...... چھی چھی...... یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ وہ اپنی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آنکھیں بند کرتی ہیں لیکن آنکھیں بند کرتے ہی دونوں ایک ساتھ ان کے خیالوں میں آ دھمکے۔

سیما اور نکیتا کی اپنی اپنی سوچیں تھیں۔ روی ان کے بیچ وجہ نزاع بنا ہوا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ روی کو پانے کی دوڑ میں ان کی ایک تیسری حریف بھی تھی۔

اور وہ آشا تھی۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ آشا کے مارکس ان دونوں سے زیادہ ہیں۔ مگر یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ ہر لڑکی جانتے بوجھتے اندھے کنویں میں گرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اسی وقت کمپاؤنڈ میں ایک کار تیزی سے داخل ہوئی اور اس کی آواز سن کر سب اپنے اپنے کمروں سے نکل پڑے۔ سلیکھا موسی بھی اپنے کپڑوں کو سنبھالتی دروازے سے باہر نکلیں۔

''ہائے...... دیا۔'' ان کے منہ سے ایک ہلکی آواز نکلی اور ان کا گورا چہرہ گلابی ہو گیا۔

روی کی چمچماتی نئی کار پورچ میں آ کر کھڑی تھی۔ دروازہ کھول کر سب سے پہلے اترنے والا استاد الوکھ تھا۔ ان کی نظر برآمدے میں کھڑے سب لوگوں سے ہوتی ہوئی سلیکھا موسی پر پڑی تو ان کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

ڈرائیونگ سائیڈ والے دروازے سے وکرال نکلا۔ ایک جن اور کار کی ڈرائیونگ...... پتہ نہیں کہاں سے اور کیسے اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ ڈرائیونگ سیکھی بھی تھی یا یونہی جناتی انداز میں اڑا کر لے آیا تھا۔

کار سے اتر کر اس نے ایک پیشہ ور ڈرائیور کی طرح پیچھے کا دروازہ کھولا جہاں سے روی اپنی سدابہار مسکراہٹ کا جادو اور نیلی آنکھوں کا جلوہ بکھیرتا ہوا باہر آیا۔

''شوفر...... مالکن کو باہر آنے میں مدد کرو۔'' دھیرے سے بول کر اس نے وکرال کو چڑایا۔

''سالے...... خرافاتی آدم زاد...... تجھ سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔'' وکرال نے بھی اتنی ہی دھیمی آواز میں دانت پیس کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

روی نے آشا کی طرف کا دروازہ کھولا اور بولا۔ ''باہر آجائیے مادام...... یہ شاید آپ ہی کا گھر ہے۔''

سیما اور نکیتا آشا کی طرف دوڑیں۔ یہ آشا کی بڑھی ہوئی پوزیشن کا ثبوت تھا۔ مگر آشا جیسی لڑکی کو اس سے کیا فرق پڑتا۔ وہ تو ویسے ہی دن بھر کی پریشانی سے نڈھال تھی۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ مگر اس سے چہرے کی خوبصورتی ماند پڑنے کی بجائے اور بڑھ گئی تھی۔

ردے بابا کی قید سے آزاد ہوتے وقت تو آشا کی حالت اور بھی خراب تھی۔ مگر تب اسے جنوں کا دیا گیا خاص شربت پلایا گیا۔ شربت نے اس پر جادو سا اثر دکھایا تھا اور اس کی تھکن اور کمزوری دور ہو چکی تھی۔ آشا پہلے بھی اس شربت کا مزا لے چکی تھی۔

ہر طرح کے جناتی کھیل وہ دیکھ چکی تھی۔ اب آشا انسانوں کی بہ نسبت جنوں کے بیچ خود کو زیادہ مطمئن محسوس کرتی تھی۔

وکرال نے روی کی نقل کرتے ہوئے پہلے چاچا جی کے پیر چھوئے، پھر چاچی جی کے، پھر جب سلیکھا موسی کی طرف بڑھا تو اسے استاد الوکھ کو دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ استاد الوکھ کا ایک پیر زینے پر دوسرا نیچے تھا۔ وہ کسی مجسمے کی طرح بے حرکت کھڑے تھے۔ ان کی نگاہوں کا پیچھا کیا تو موسی

اپنی انگلیوں میں اپنے آنچل کو بار بار لپیٹتی دکھائی دیں۔ سر جھکائے کھڑی موسی کبھی کبھی کن اکھیوں سے استاد الوکھ کو دیکھ لیتی تھیں۔

وکرال نے اونچی آواز سے کھنکار کر اپنا گلا صاف

کیا۔ تب استاد الوکھ کا دھیان بٹا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر آگے بڑھا اور چاچا جی سے باتیں کرنے لگا۔

تب وہاں ایک اور کار آ کر رکی۔ اس میں سے نکلنے والے تھے بابا سکندر، سردار راج دلیش اور ان کی بیٹی وچترا۔ تینوں شاندار شخصیت کے مالک تھے۔

آج تو چاچا جی کے گھر جناتوں کا میلہ سا لگ گیا تھا۔ چاچا جی سے بابا سکندر، اور سردار راج دلیش کا تعارف روی کے چاچا کے روپ میں کرایا گیا۔

گھر کے سارے افراد اتنی شاندار ہستیوں کو گھر آیا دیکھ کر بہت خوش تھے۔

چاچا جی نے سب لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چاچا جی اور گھر کے باقی افراد کو آشا کے مل جانے کی کہانی اس طرح سنائی گئی کہ انہیں جنوں کی موجودگی کا پتہ نہ چلے۔ بعد میں ردے بابا کی کہانی بھی کچھ سچی کچھ بناوٹی سنادی گئی۔

روی چاچا جی کے خاندان کے ایک ایک فرد کا تعارف بابا سکندر سے کروا رہا تھا۔

''یہ ہیں پرکاش چندر جی، آشا کے چاچا جی اور اس گھر کے مالک۔ پلاسٹک کے کھلونوں اور کچھ دوسری چھوٹی چھوٹی چیزوں کی فیکٹری ہے ان کی...... یہ ہیں آشا کی چاچی جی، یہ گھریلو خاتون ہیں۔ آشا ان کی دیکھ ریکھ میں پلی بڑھی ہیں...... یہ دونوں ہیں سیما اور نکیتا۔ چاچا جی کی بیٹیاں اور آشا کی نٹ کھٹ بہنیں۔ یہ دونوں آشا پر اپنی جان نچھاور کرتی ہیں...... اور یہ ہیں سلیکھا موسی...... گھر بھر میں سب کی پیاری۔ آشا کی میٹھی آواز میں موسی کی آواز کا ہی تاثر ہے۔''

آشا کے لیے تو ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اپنا منہ دباتے ہوئے باہر نکلنے کا سوچ رہی تھی کہ روی کی آگے کی بات سن کر رک گئی۔

''سلیکھا موسی جتنی سندر دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے بھی سندر ہے ان کا دل۔ یہ کسی کو تھوڑا سا بھی دکھ میں نہیں دیکھ سکتیں۔ آشا میں تو ان کی جان اٹکی ہوئی ہے۔''

گھر کے سبھی لوگ اس تعارفی دورانیے کا پورا مزا لے رہے تھے۔ موسی، استاد الوکھ اور دوسرے پرکشش مہمانوں کے بیچ اپنی تعریف سن کر پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ ایک دم ''قربان جاؤں'' والی نظروں سے روی کو دیکھ رہی تھیں۔

گھر کے لوگ روی کی جانب سے آشا کے حوالے سے سب کا تعارف کراتے دیکھ کر تھوڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ آشا سے ان کا تعارف پہلے سے ہو چکا ہوگا اس لیے اس کے حوالے سے سب کو متعارف کروایا جا رہا ہے۔

تب بابا سکندر نے چاچا جی سے کہا ''پرکاش جی...... آپ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی فیکٹری کی جگہ کوئی بڑی فیکٹری لگائیں۔ پیسوں کی کوئی فکر نہ کریں۔ ایشور کا دیا بہت کچھ ہے۔ میں آپ کو آپ کی شرطوں پر فنانس کر دوں گا۔ کبھی ہماری طرف آیئے نا آپ سب لوگ۔''

پھر موسی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''آپ بھی آیئے کبھی موقع نکال کر، ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ میں اپنے باغات آپ کو دکھاؤں گا۔''

اسی وقت استاد الوکھ کو زوروں کی کھانسی چڑھ گئی۔ بابا سکندر نے انہیں تیز نظروں سے گھورا اور استاد کھانستے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے ہی آشا اور وچترا بھی نکل گئیں۔ وچترا کے حسن اور رکھ رکھاؤ سے سب اتنے متاثر تھے کہ کسی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔

جب سیما اور نکیتا نے آشا اور وچترا کو ایک ساتھ نکلتے دیکھا تو ان کی ہمت بڑھی اور وہ دونوں بھی ان کے پیچھے نکلیں۔

آشا اور وچترا ایک دوسرے سے پہلے ہی مل چکی تھیں اور ایک دوسرے سے خود کو رشتے میں بھی جڑا سمجھ رہی تھیں۔ دونوں ہی سندرتا کا نمونہ تھیں اور دونوں دو دوستوں اور دو بھائیوں کی محبوبائیں اور ہونے والی بیویاں تھیں۔ یہ سب دونوں ہی کو پتہ تھا۔ اس لیے

دونوں ایک دوسرے کو ایک ہی گھر کی دو افراد مان رہی تھیں۔

''دیدی...... دیدی......'' سیما اور نکیتا آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھیں۔

''ہا...... اا۔ دیدی۔'' آشا کو حیرت ہو رہی تھی۔ آج پہلی بار سیما اور نکیتا کے منہ سے اس کے لیے دیدی کا لفظ ادا ہوا تھا۔

لیکن وہ آشا تھی، آج تک کوئی اس کے دکھ کو نہیں سمجھ پایا تھا تو آج کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ ''آؤ سیما...... آؤ نکیتا...... تمہیں ان سے ملواتی ہوں۔ وہ اپنا ڈرائیور ہے نا روی...... یہ اس کی ہونے والی بھابھی ہے۔'' اس نے بڑے پیار سے ان دونوں کو بتایا۔

ادھر ڈرائنگ روم میں استاد الوکھ پھر تشریف لا چکے تھے۔ انہوں نے موسی پر ایک گہری نظر ڈالی اور کہا۔ ''اس گھر میں سب سے بزرگ کون ہیں؟''

''سلیکھا دیدی۔ گھر میں سب سے بزرگ یہی ہیں۔'' چاچی جی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ استاد الوکھ کے مزاحیہ انداز کو وہ سمجھ چکی تھیں۔

اب ایک بار پھر سے استاد الوکھ، سلیکھا موسی کی طرف گھوم چکے تھے۔ سب کے سامنے خود کو اس طرح گھورتے دیکھ کر موسی کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور ماتھا پسینے سے تر ہو گیا تھا۔

''تو میں شادی کی بات آپ سے کروں؟''

''کیا؟'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے استاد الوکھ کو دیکھ رہی تھیں۔

''ارے کیا ہوا؟ آپ اتنا گھبرا کیوں گئیں؟'' استاد الوکھ نے موسی سے پوچھا۔ پوچھنے کے انداز میں معصومیت بھری ہوئی تھی۔

موسی بھی گھاٹ گھاٹ کا تجربہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے تھے؟'' پوچھنے کو تو انہوں نے پوچھ لیا لیکن ایک بار پھر ان کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ جانے کیا پوچھ بیٹھے یہ بے دھڑک بندہ۔ ان کی آنکھوں میں اس دن کی باتیں گھومنے لگیں جب استاد الوکھ پہلی بار موسی کو اپنی قابلیت کا ثبوت دے رہے تھے۔ کیسے یہ پہلے دھوتی میں آئے تھے۔ پھر پلک جھپکتے سوٹ بوٹ میں سامنے آئے تھے۔ موسی کی ابھی تک یہ پریشانی دور نہیں ہو پائی تھی کہ دونوں ایک ہی تھے یا سچ مچ جڑواں بھائی۔

''میں اپنے بڑے بھائی سکندر صاحب کے حکم پر آپ سے آپ کی بیٹی آشا کے رشتے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس بار استاد الوکھ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

سلیکھا موسی کے سینے میں پھنسی ہوئی سانسیں ایک لمبی سانس کے روپ میں باہر آئیں۔ ایک پل کے لیے ان کے چہرے پر شرمندگی کا تاثر ابھرا لیکن پھر اطمینان سے بولیں۔ ''ہاں۔ آشا کی شادی کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

اب استاد نے ایک نظر سب کے چہروں پر ڈالی اور پھر مخاطب ہوئے۔ ''میرے خاندان کا سب سے ہونہار نوجوان روی کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے آپ کے یہاں رہ رہا تھا۔ جو خود پچاسوں ڈرائیور رکھ سکتا ہے وہ خود ایک ڈرائیور کی حیثیت سے یہاں کام کرتا رہا۔ اتنے دن آپ سب کے سامنے رہا۔ ایک اپنی پہچان چھپانے کے علاوہ اس کی اور کوئی غلطی آپ کی نظر میں ہے کیا؟''

''نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روی نے اس گھر کے ہر فرد کے ساتھ اچھا سلوک رکھا، سب کے کام آیا اور اس گھر میں ایک بیٹے کی کمی کو اس نے دور کر دیا تھا۔'' اس بار چاچا جی نے جواب دیا۔

''تو کیا میں آپ سے اپنے روی کے لیے آپ کی بیٹی آشا کا رشتہ مانگ سکتا ہوں؟'' استاد الوکھ اپنے خاص انداز میں بولے۔

جنوں کے لیے کسی آدمی سے ہاں یا نا کہلوانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ بڑی آسانی سے کسی کو بھی ٹرانس میں لے کر اس سے جو چاہتے کہلوا سکتے تھے۔ لیکن بابا سکندر

روی کے معاملے میں ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ان کا اپنے بیٹے جیسا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بالکل روایتی طریقے سے رشتہ طے ہو جائے۔

چاچا جی اور ان کا خاندان تو انسانوں کا بھیس لیے ان جنوں سے اتنا متاثر ہو چکے تھے کہ ان کے لیے انکار کرنا ناممکن تھا۔

آشا کے لیے جس کے من میں جور ہا ہوا اس وقت تو ان سب کے لیے دماغ سے وہ باتیں غائب تھیں۔

"ہمارے لیے تو یہ خوش قسمتی کی بات ہوگی کہ روی جیسے لڑکے سے ہماری آشا کی شادی ہو۔" چاچا جی گلوگیر لہجے میں بولے۔

آشا کے تینوں سیوک جواب انسانوں کے روپ میں تھے استاد الوکھ اور بابا سکندر کے پیچھے کھڑے تھے۔ اس وقت روی، وکرال، آشا، وچترا، سیما اور نکیتا ڈرائنگ روم سے باہر کہیں تھے۔ اور یہاں دونوں طرف کے صرف بڑے موجود تھے۔

بابا سکندر اطمینان سے بیٹھے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی نظر موسی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے اپنے اندر سلیکھا موسی کے لیے ایک خاص احساس محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اپنے من کی اس بے کلی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنے قبیلے کا سردار ایک شکتی شالی جن۔ جنوں کے سارے قبیلوں کے سرداران کی عزت کرتے تھے۔ سردار راج دلیش تو انہیں اپنا بڑا بھائی مانتے تھے۔

ایسی صورت حال میں ان کے من کا چور ان کو بے چین کر رہا تھا۔ خود کو کتنی بار وہ لعنت ملامت کر چکے تھے۔ جب اپنا دل بغاوت کرنے پر آ جائے تو عقل کہیں کچھ نہ کچھ چرنے چلی جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اپنے دل سے مجبور ہو کر کتنے راجے مہاراجوں نے اپنے تخت و تاج ٹھکرا دیئے تھے۔

انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ یہ گھران کے لیے جان سے پیارے روی کی ہونے والی سسرال تھا۔

خود کے لیے نہیں تو روی کے لیے انہیں سوچنا تھا۔ کیا ہوا جو ان کا دل بے چین ہوا تھا۔ ابھی بات ان کے دل تک ہی سمٹی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دل کا خون کر دیں گے مگر کسی کو دل کا حال نہیں دکھائیں گے۔

یہ سب باتیں سوچ کر موسی کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ آشا کے سیوکوں کی طرف گھوم گئے اور اشارے سے ان کو نزدیک بلا کر بولے۔ "دروازے کے باہر جاؤ، باہر ہماری ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اسے کمپاؤنڈ میں لاؤ اور اس میں رکھے سامان کو طریقے سے لے کر آؤ۔"

تینوں سیوک باہر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر میں تینوں سیوک کچھ اور لوگوں کے ساتھ اندر آئے۔ سب کے ہاتھوں میں خوبصورت کپڑوں سے ڈھکے بڑے بڑے طشت تھے۔ ڈرائنگ روم میں سبھی طشت طریقے سے رکھ دیئے گئے۔

"ہمارے بیٹے روی کا رشتہ آشا سے طے ہو جانے کی خوشی میں ہماری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اسے قبول کریں۔" بابا سکندر روی کے رشتے پر سچ مچ خوشی سے جھوم رہے تھے۔

استاد الوکھ نے ہر طشت پر ڈھکے کپڑے ہٹا دیئے۔ چاچا جی، چاچی جی اور سلیکھا موسی ان میں رکھے سامان کو دیکھ کر حیرت کے سمندر میں ڈوبے جا رہے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی کپڑا، گہنے، ہیروں اور سونے چاندی کے کتنے ہی زیورات اور دوسرے سامان سے طشت بھرے پڑے تھے۔ ان ہیروں کی چمک سے پورا کمرا جگمگ کرنے لگا تھا۔

"پرکاش جی اب ہم آپ سب کو اپنے غریب خانے پر پدھارنے کی دعوت دیتے ہیں۔" بابا سکندر نے چاچا جی سے نہایت پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"ہم بہت جلد آپ کے ہاں آئیں گے۔ آپ ٹھیک ٹھیک اپنا پتہ بتا دیں۔ چاچا جی نے بھی اسی پیار بھرے

لہجے میں کہا۔

"آپ جب آنا چاہیں۔ ہمیں خبر کر دیں۔ اس شہر میں بھی ہمارا آفس ہے۔ ہمارے اس دفتر کا اسٹاف فوراً ہمیں خبر کر دے گا، ساتھ ہی آپ سب کے سفر کا بندوبست بھی کر دیں گے۔" استاد الوکھ نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ادھر بزرگ لوگ اپنی باتوں میں لگے تھے اور دوسری طرف نوجوان پیڑھی پورے گھر میں ہر طرف گھوم رہی تھی اور ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔

سیما اور نکیتا کی موجودگی میں آشا اور وچترا کھل کر بات نہیں کر پا رہی تھیں۔ سیما اور نکیتا کے بھی عجیب احساسات تھے۔ یہ وہی آشا تھی جس سے کبھی دونوں سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھیں اور اب یہی آشا تھی جس کے قریب رہنا اس وقت ان کے لیے باعث فخر بات تھی۔ آشا پر زیادہ سے زیادہ حکم چلانے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر وہ آشا کا کوئی لحاظ نہیں کرتی تھیں اور اس پر تیکھے لفظوں کے تیر اور توہین آمیز جملے کسے جاتے تھے۔ اسی آشا سے دو باتیں کرنے کے لیے دونوں ترس رہی تھیں۔

ابھی یہ سب چل رہا تھا کہ ایک نوکر نے سیما اور نکیتا کو چاچی جی کی جانب سے بلاوا دیا۔ چاچی جی اپنی بیٹیوں کو آئے ہوئے تحفے دکھانا چاہتی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد آشا اور وچترا بالکل آزاد محسوس کر رہی تھیں۔ اب کھل کر ان کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

دوسری طرف سے روی اور وکرال بھی آ گئے۔ اب پھر آشا اور وچترا جس موضوع پر بات کر رہی تھیں وہ رک گیا۔

چاروں برگد کے پیڑ کے پاس پہنچے۔ وکرال سے روی کو پتہ چلا کہ بابا ردے ناتھ کی منتر اشکتی سے گبرال کی جناتی شکتیاں نشٹ ہو چکی تھیں۔ اور اب وہ کبھی کسی انسان کے سامنے نادیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

ردے بابا نہایت دھرمی انسان تھے۔ اس لیے انہیں کوئی سزا دینا کسی جن کے بس میں نہیں تھا۔ اسے کوئی انسان ہی سزا دے سکتا تھا۔ پھر بھی جنوں کی طرف سے ردے بابا کو کافی حد تک نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

"تم دونوں اپنے بڈھے برگد سے باتیں کرو ہم دونوں کہیں اور چلے۔" وکرال نے روی اور آشا سے کہا۔

"تمہارے جیسا بے شرم میں نے آج تک نہیں دیکھا، دونوں کے باپ اندر بیٹھے ہیں اور بچے چلے نالائقی کرنے۔"

وکرال اپنی بتیسی دکھاتا ہوا وچترا کو لے کر چلا گیا۔

اب وہاں ان دو پریمیوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ دیکھ لیے جانے کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اس وقت جن شکتی سے دونوں نادیدہ ہو چکے تھے۔ کوئی عام آدمی انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رہ گئے جن، وہ تو ان کے اپنے تھے۔ ان کے دیکھ لینے کا بھی ڈر نہیں تھا۔

روی کی پھیلی بانہوں میں آشا کسی بیل کی طرح لپٹ چکی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں یونہی ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو گنتے رہے۔ روی کے ہاتھ آشا کی پیٹھ پر رینگ رہے تھے۔ آشا بس اس کے سینے سے چپکی اس کے ہاتھوں کی حرکت سے ہو رہی سنسنی پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر روی نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور اس نے آشا کے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ آشا اس کی بے باک نگاہوں کا سامنا نہیں کر پائی اور شرما کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

روی لگاتار اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس کے گالوں کی لالی بڑھنا پھر آنکھوں میں حیا کا رنگ آنا اور نظریں جھک جانا۔ یہ سب ادائیں روی کے دل کو گدگدا رہی تھیں۔

جذبات کے بہاؤ میں اس کے ہونٹ آشا کے رس بھرے ہونٹوں کی طرف بڑھے۔ آشا کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن چہرے پر گرم سانسوں کا احساس ہوتے ہی اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ روی کا ارادہ سمجھ کر

جب تک وہ اپنا منہ دوسری طرف گھماتی تب تک دونوں کے لب ایک دوسرے سے جڑ چکے تھے۔ اب تک دونوں کے پیار کی یہ آخری حد تھی۔

آشا تو اپنا تن من روی کو سونپ چکی تھی۔ اسے روی کے کسی بھی بڑھتے قدم پر کبھی کوئی پریشانی نہیں تھی، جو کچھ بھی تھا وہ عورت کی فطری شرم تھی۔

آشا پوری طرح مدہوش ہو چکی تھی۔ اس کے حواس اس کے قابو میں نہیں رہے تھے اور روی شاید اس کی اسی غائب دماغی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اور اس میں قصور روی کا بھی نہیں تھا۔ ان جذباتی لمحوں میں خود وہ بھی بے قابو ہو چکا تھا۔

دونوں کے جذبات اپنی انتہا کو چھو رہے تھے۔ مگر پتہ نہیں لڑکیاں ایسے وقت میں بھی کیسے کوئی آواز سن لیتی ہیں۔ گھر میں کچھ گرنے کی آواز آئی۔ آشا کا دھیان ہٹا اور اس کے ہوش میں آ جانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

اس نے جھٹ سے خود کو روی سے دور کر لیا۔ آنکھوں میں لال ڈورے لیے اس نے اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اپنے محبوب کی آنکھوں میں اب بھی ایک پل سے زیادہ دیکھ پانے کی طاقت نہیں تھی اس میں۔ اس بار بھی اس کی نظریں جھک گئیں۔ ہونٹوں پر شرمیلی جان لیوا مسکراہٹ آئی اور حوروں سا سندر چہرہ روی کے سینے میں چھپ چکا تھا۔

آج تو روی مر مر کے جی رہا تھا۔ آشا کو دونوں شانوں سے پکڑ کر خود سے الگ کیا۔ اب اس کا پورا سراپا روی کی نظروں کے سامنے تھا۔ حیا کے بوجھ سے جھکی جھکی لمبی پلکیں، تیز سانسوں کی وجہ سے سینے کی لرزش دیکھ کر روی کے لیے خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

آشا کی پلکوں کے بیچ ہلکی سی جھری پیدا ہوئی اور اس نے اپنے محبوب کی طرف دیکھا۔ آشا کو روی کی تڑپ کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ پھر فوراً ہی وہ دوسری طرف گھوم گئی۔

روی بھی اب ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے آشا کا ہاتھ پکڑا اور بہت آرام سے اسے وہیں پڑی کھاٹ پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آج صبح سے ہونے والے سنسنی خیز واقعات نے آشا پر کئی طرح سے اثرات مرتب کیے تھے۔ لگاتار خوف میں بیتتے لمحوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا مگر جنوں کے پلائے گئے شربت نے اسے زیادہ دیر تک نڈھال نہیں رہنے دیا تھا۔

بابا سکندر اور وکرال جیسے بڑے جنوں کی وجہ سے روی اور اس کی شادی تقریباً طے ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں اپنے لیے سب کے بدلے ہوئے رویوں کو بھی دیکھ چکی تھی۔

ہمیشہ اس کے خلاف آگ اگلنے والی سلیکھا موسی کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔ چہرے پر ہمیشہ پایا جانے والا تناؤ بھی غائب ہو چکا تھا۔ کانوں کی طرح چبھتی آواز شہد کی طرح میٹھی ہو چکی تھی۔ مکاری تو ابھی بھی تھی مگر پتہ نہیں کیوں ان کا روپ ہی بدل گیا تھا۔

چاچی جی تو دو دھاری تلوار تھیں۔ کب اس کے لیے میٹھی ہو جاتیں اور کب تیکھی یہ جان پانا مشکل تھا۔ ابھی تو وہ بھی آشا کو میٹھی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔

سیما اور نکیتا...... یہ دو تازے خربوزے تھے جو دوسرے خربوزوں کو دیکھ کر رنگ بدل رہے تھے۔ وہ تو آشا کو سدا سے غریب اور یتیم لڑکی سمجھتی تھیں، جسے ان کے ماں باپ نے رحم کھا کر اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی تھی۔

لیکن اب انہیں بھی پتہ چل گیا تھا کہ جس دولت پر وہ لوگ اب تک عیش کر رہے تھے وہ دراصل آشا کے پتا کی تھی اور اب تو چمچماتی کار رکھنے والا اور قیمتی تحفے بانٹنے والا اس کا منگیتر تھا۔

اتنا مضبوط مقام ملنے کے بعد بھی آشا گھبراہٹ میں ڈوبی رہتی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر بالکل بھروسہ نہیں تھا۔

جب وہ اپنے ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ اس کی ہنسی سے اس کے ماں باپ ہنستے تھے اور اس کے اداس ہو جانے پر وہ بھی اداس ہو جاتے تھے۔

دنیا کی ہر اچھی چیز اس کے لیے گھر میں موجود تھی۔ شہر کے سب سے مہنگے اسکول میں وہ پڑھتی تھی۔ پھر

کیوں پل بھر میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ یہ اس کی بری قسمت ہی تو تھی۔

جب دادی جی اسے اپنے کلیجے سے لگا کر چاچا جی کے گھر لے آئیں تو دھیرے دھیرے وہ اپنا غم بھولنے لگی تھی۔ پہلے جیسی نہیں تو بھی اس کا وقت اچھا گزر رہا تھا۔ لیکن ہائے ری قسمت۔ دادی جی کا سایہ بھی جلد ہی چھن گیا۔ اور دھیرے دھیرے وہ گھر کی نوکرانی بنتی چلی گئی۔ یہ سب اس کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا۔

پھر وہ کیسے اپنی قسمت کے بدل جانے پر یقین کرتی۔ اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کب اس کی قسمت اسے دغا دے جائے۔

وہ اپنی اس پریشانی کو روی پر ظاہر نہیں کرتی تھی۔ روی تو اس کا دیوتا تھا۔ اس کی نس نس میں خون کی طرح وہ سمایا ہوا تھا۔ ایسے میں اپنی الجھنوں کو اس کے آگے رکھ کر وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اندر ہی اندر وہ گھٹتی رہتی تھی۔

شام ڈھل چکی تھی۔ لیکن ابھی تک لو کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی۔ دھوپ کی تیزی اور گرم ہوائیں ابھی بھی لوگوں کو اپنے کمروں سے باہر نہیں نکلنے دے رہی تھیں۔

ایسے میں بوڑھے برگد کے نیچے مالی کی کھاٹ پر بیٹھے دو پریمی دنیا جہان سے بے خبر اپنے میں گم تھے۔ ان کی پیار میں ڈوبی باتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

آشا کا سر روی کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کی پیاری پیاری باتیں سن رہی تھی۔ کبھی کسی بات پر وہ مسکرا دیتی اور روی اس کی اس شرمیلی مسکراہٹ کو اپنے من میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رہا تھا۔

اب دونوں دیدہ حالت میں آ چکے تھے۔ آشا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے روی نہ جانے کہاں کہاں کی ہانک رہا تھا۔ لمبی لمبی باتیں کر رہا تھا۔ لیکن آشا کو اس کی ساری باتیں پیاری لگتی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ روی عام لڑکوں سے الگ ہے۔ انسان کے درمیان بہت کم رہنے کی وجہ سے وہ چھل کپٹ سے دور تھا۔ آشا اگر معصومیت کا نمونہ تھی تو روی بھی اس سے کم نہیں تھا۔

دونوں کی خوب صورتی تو یوں سمجھیں کہ قدرت نے انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو۔

دونوں ابھی نہ جانے اور کتنی دیر وہاں رہتے کہ گھر کے پچھلے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی اور وہاں نکیتا کھڑی دکھائی دی۔

"آؤ نکیتا....." آشا نے اسے اپنے قریب بلایا۔

"چلیے...... اندر چائے پر آپ کو بلایا جا رہا ہے۔" نکیتا ہنستے ہوئے بولی۔

ایک بار تو آشا کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ پانچ بجے..... شام کی چائے..... اس کا خون سوکھتا رہا تھا کل تک۔ کوئی کمی نہ رہ جائے اس کا ڈر لگا رہتا تھا۔

"کیا وقت ہو رہا ہے نکیتا؟" آشا نے پوچھا۔

"دیدی چھ بج رہے ہیں۔"

چھ..... یہ کیسے ہوا..... کل تک تو کبھی پانچ سے آگے نہیں ہوتا تھا۔ دو چار منٹ دیر ہونے پر آشا کو کتنا جھیلنا پڑتا تھا۔

ادھر روی ایک سیوک کو وکرال کی تلاش میں بھیج چکا تھا۔ جلد ہی وہ اپنی بتیسی کی نمائش کرتا ہوا آ گیا۔ سب اندر آئے۔ آج چائے کا انتظام ڈرائنگ روم میں ہی تھا۔

چائے کے بعد انسانی بہروپ میں سارے جن چاچا جی سے جانے کی اجازت لے رہے تھے۔ اسی وقت باہر کمپاؤنڈ میں کچھ شور سا سنائی دیا۔ سبھی چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔

"میری..... بری قسمت..... آہ" آشا کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے اور سب کے ساتھ وہ بھی تیزی سے باہر آ گئی۔

باہر کمپاؤنڈ میں بابا ردے ناتھ اپنے کچھ ساتھیوں

کے ساتھ کھڑے تھے اور بار بار "الکھ نرنجن" کا نعرہ لگا رہے تھے۔ وہ سب روایتی سادھوؤں والے لباس میں تھے۔ تانترکوں کے سروں پر بھگوا رنگ کی پگڑیاں تھیں۔ بائیں ہاتھ میں کرمنڈل اور دائیں ہاتھ میں ترشول لیے ہوئے تھے۔

ردے بابا کو دیکھ کر روی کا خون کھول اٹھا۔ لیکن چاچا جی اور ان کے پریوار کے سامنے کچھ بھی سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ ویسے بھی گھر آئے سادھوؤں کا اپمان کرنا بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ مگر کچھ انہونی ہونے کا ڈر اسے ستا رہا تھا۔ کہیں احترام برتنے کے چکر میں ردے بابا کچھ کر نہ جائے۔

دوسری طرف آشا تو پہلے سے ہی وسوسوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کوئی بھی خوشی زیادہ دیر اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ اس نے ردے بابا کی منتر اشکتیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور جنوں کو اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے بھی دیکھا تھا۔

"ہے بھگوان...... کس جنم کی دشمنی کا بدلہ لے رہا ہے یہ بابا مجھ سے۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور آنسوؤں کی کئی بوندیں ٹپک پڑیں۔ اسے دھرمی طور طریقوں کی زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ بس اکثر اسی طرح آنکھیں بند کر کے اپنے ایشور کو یاد کر لیتی تھی۔

چاچی جی اور سلیکھا موسی بھی ردے بابا کو پہچان چکی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ بابا ضرور آشا کے چکر میں آیا ہوگا لیکن انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات سے وہ خوش ہوں یا دکھی۔

آشا سے ان دونوں بہنوں کا سدا سے بیر تھا لیکن روی کا راز کھلنے اور آشا سے رشتہ ہونے کے بعد انہیں قیمتی تحفوں کا لالچ بھی ہو چکا تھا۔ ویسے دونوں کو ردے بابا سے خوف بھی ہو رہا تھا۔

استاد الوکھ بابا سکندر اور وکرال جیسے جن، انسان کے بھیس میں مطمئن کھڑے تھے۔ حالات پر نگاہ رکھے بالکل چوکنے تھے۔ جلد بازی میں خود کو جن کے روپ میں سامنے لانا نہیں چاہتے تھے۔ اتنے اچھے ڈھنگ سے روی اور آشا کا رشتہ کروایا تھا۔ مگر ردے بابا آشا کو کچھ نقصان پہنچائے یہ بھی ہونے نہیں دے سکتے تھے۔ عجیب کشمکش میں پڑ گئے تھے سب۔

لگتا ہے ردے بابا سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہے۔ شاید اپنی شکست کا بدلہ لینے۔ اس کی مہاشکتی کو سب جانتے تھے۔ جنوں کو بس میں کر کے وہ خود کو مہاشکتی مان بنانا چاہتا تھا اور اس کام کے لیے اس نے آشا کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

ایک چاچا جی تھے جو ان سب معاملات سے انجان تھے۔ سورج غروب ہونے کے وقت انہیں دروازے پر سادھوؤں کا آنا عجیب لگ رہا تھا۔

"الکھ نرنجن۔" تھوڑی تھوڑی دیر بعد سادھوؤں کی نعرے بازی جاری تھی۔

چاچا جی ہاتھ جوڑے ردے بابا کے قریب پہنچے۔
"آ گیا ہو مہاراج۔" چاچا جی نے نہایت ادب اور احترام سے پوچھا۔

"آپ کے گھر سے ہمیں کچھ وچترا (غیر مرئی) مخلوق کی بو آ رہی ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ پریتوں جیسی یہ مخلوق اس گھر کے رہنے والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

وچترا اپنا نام سن کر گھبرا گئی۔ "یہ سادھو میرا نام کیسے جانتا ہے؟" اس کا چہرہ دیکھ کر روی کو ہنسی آ گئی۔

"تم مت گھبراؤ۔ یہ کسی اور وچترا کے بارے میں بول رہا ہے۔" روی اسے تسلی دے رہا تھا۔

"پریتوں جیسی غیر مرئی مخلوق؟ مہاراج...... ان سے بچنے کا کوئی اپائے بتائیے۔" چاچا جی فوراً بول پڑے۔

ردے بابا نے ایک سرسری نظر سامنے کھڑے سارے لوگوں پر ڈالی۔ پھر ان کی نظر آشا پر ٹھہر گئی۔ آشا ان کی تیز نظروں سے کانپ کر رہ گئی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسی پل اس کی ساری خوشیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی۔

''یہ کنیا کون ہے شریمان؟'' آشا پر اپنی نگاہ ٹکائے ہوئے ردے بابا نے چاچا جی سے پوچھا۔

''یہ...... یہ میرے سورگیہ بھائی آکاش لال کی بیٹی ہے مہاراج۔'' چاچا جی ہاتھ جوڑے بولے۔

''کیا؟ کون آکاش لال...... وہی تو نہیں جن کی کھلونوں کی فیکٹری ہے؟'' ردے بابا کی نظریں اب بھی آشا پر تھیں۔ مگر اب ان نظروں کا تاثر بدل چکا تھا۔

''ہاں...... وہی آکاش لال...... میرا بھائی تھا۔ لیکن اب وہ نہیں رہا۔ یہ بچی میرے اسی بھائی کی اکلوتی نشانی ہے۔ لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں مہاراج؟''

تھوڑی دیر تک ردے بابا کچھ نہیں بولے۔ بس ایک ایک کی شکل دیکھتے رہے۔ روی' آشا اور اس کے سبھی جن ساتھی اپنی اپنی سانسیں روکے ردے بابا کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ردے بابا کے آنے سے سب تناؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ اس بار بابا بہت چالاکی سے کام لے رہا ہے۔ اس لیے وہ سیدھا آشا کے گھر آ دھمکا تھا' وہ بھی ایسے وقت...... وہ اب تک مکاری بھری چالیں چلتا آیا تھا۔ روی کو بھی اس کے ساتھ ویسی چال چلنی پڑی تھی۔

بابا سکندر' سردار راج دلیش اور استاد الوکھا اتنے شکتی شالی جن تھے جو بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی ایک پل میں ادھر سے ادھر کر سکتے تھے۔ لیکن سادھو مہاتما کے منترا کے سامنے انہیں بھی کچھ پریشانی ہوتی تھی۔

پھر بھی اس وقت سب کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

''مجھ سے بڑی بھول ہو گئی' آپ سب مجھے شما کر دیں۔'' اچانک ردے بابا کی آواز پر سب چونک گئے۔ اب ردے بابا اور چاچا جی دونوں اپنے اپنے ہاتھ جوڑے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

روی کو یہ بھی ردے بابا کی کوئی نئی چال لگ رہی تھی۔ اس کے مطابق بابا کب کون سی چال چلے گا یہ کہنا مشکل تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج...... آپ نے کون سی غلطی کی ہے جس کے لیے ایک سادھو کو معافی مانگنا پڑ رہی ہے۔'' چاچا جی نے حیرت سے پوچھا۔ باقی سارے خاموش کھڑے بابا کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔

''بتاتا ہوں شریمان...... بتاتا ہوں۔'' ردے بابا ایک پل کے لیے رکے اور پھر جو انہوں نے کہنا شروع کیا تو سن کر ہر کوئی حیرت میں پڑ گیا۔

''آج سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ میں آکاش لال جی کے پڑوس میں رہتا تھا۔ میں وہیں پر ایک شیو مندر کا پجاری تھا۔ آکاش جی سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ ان کی ایک بچی اس سمے دس گیارہ برس کی تھی۔ بہت ہی پیاری بچی تھی۔ میرے پریوار میں میری ایک پتنی اور ایک پیاری گڑیا سی بہن تھی۔ میرا جیون بڑے ہی سکھ میں بیت رہا تھا۔ تب ایک شیطان جن کی بری نظر میری بہن پر پڑ گئی۔''

ردے بابا کی اس بات پر خاص طور پر جنوں کے دونوں سردار چونک پڑے تھے۔

''میرے پاس اس وقت بھی تھوڑا منترا گیان تھا۔ ویسے تو کوئی جن میرے گھر پر کچھ غلط نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ جن مجھے دھوکے میں رکھ کر میرے گھر میں گھس آیا۔ پھر میری اس جن سے ایسی لڑائی ہوئی کہ جس کے نتیجے میں میری پتنی اور بہن کی جان چلی گئی......''

ظاہر ہے اس بات پر جن برادری کے بڑے خود کو شرمندہ محسوس کر رہے تھے۔

''میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ زندہ رہنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ میں آتما ہتیا کر لیتا لیکن آکاش لال جی نے مجھے سنبھال لیا۔ کئی دنوں تک انہوں نے رات دن مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ میں زندگی کی طرف لوٹا تو نہیں لیکن میرے من میں جن جاتی کے خلاف جذبات پیدا ہو چلے تھے۔ اور یہی سوچ کر میں نے آتما ہتیا کرنے کی

سوچ ختم کر دی۔''

سب کچھ کچھ افسردہ بھی لگ رہے تھے یہ بات سن کر۔

''کچھ دنوں بعد میں آکاش جی سے زندہ رہنے کا وعدہ کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتا رہا۔ کچھ گیانی سادھوؤں سے میری ملاقات ہوئی اور میں ان سب سے کچھ نہ کچھ گیان لیتا رہا...... اس دوران میں نے شہر سے ہٹ کر ایک پرانے کالی مندر کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ وہاں آشا بٹیا کو لے کر آپ کے گھر کی دو خواتین آئیں اور انہوں نے اس پر کسی طرح کے جادو ٹونے کا شک ظاہر کیا...... میں نے آشا کو دیکھا۔ میرے منترا گیان نے بتایا کہ آشا بٹیا کے ساتھ ہر سمے کچھ جن رہتے ہیں۔ یہیں پر سے میں آشا بٹیا کا دشمن بن گیا۔ مجھے اپنے انتقام کی تکمیل کے لیے جنوں پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ پرنتو اس نوجوان کے کارن......'' ردے بابا نے روی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''میری یہ کوشش ناکام ہو گئی۔''

یہ سن کر روی اور چوکنا ہو گیا۔ اب اسے لگا جیسے ردے بابا یہاں پر موجود جنوں کے بارے میں بھی بتا دے گا۔ وہ فوراً حرکت میں آیا۔

''بابا...... یہاں پر کھڑے ہو کر آپ کتنی دیر باتیں کریں گے...... چلیے بابا۔ ہم سب بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' روی نے بابا اور چاچا جی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''چاچا جی...... کیوں نہ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔''

''ہاں...... ہاں...... روی تم انہیں لے کے آؤ۔ میں ان کے لیے کچھ انتظام کرتا ہوں۔'' چاچا جی نے روی سے کہا اور تیزی سے اندر کی طرف چلے گئے۔

روی کے لیے اتنا ہی وقت کافی تھا۔ اس نے ردے بابا کو سمجھا دیا کہ یہاں موجود سبھی جن آشا کے دوست ہیں اور چاچا جی کو اس بارے میں بتانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے گھر کے دوسرے لوگوں کے دلوں میں ڈر بیٹھ جائے گا۔

ردے بابا بھی اس کی بات سمجھ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ آئے سادھوؤں کو واپس جانے کے لیے کہا اور روی کے ساتھ اندر کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

سب ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ردے بابا کو چائے وغیرہ کے لیے پوچھا گیا لیکن انہوں نے ایک گلاس پانی سے زیادہ کچھ لینے سے انکار کر دیا۔

ایک بار پھر چاچا جی نے ردے بابا سے آگے کی کتھا سنانے کے لیے درخواست کی۔

''آکاش لال کی بٹیا آشا کو میں اپنی بیٹی سے بڑھ کر مانتا تھا۔ مجھے بھگوان نے اولاد نہیں دی تھی۔ میرے گھر میں میری پتنی اور میری بہن بھی آشا بٹیا پر جان چھڑکتی تھیں۔ سب کی لاڈلی تھی وہ۔ اسکول سے آ کر کم از کم ایک بار میرے گھر آنا اس کا روزانہ کا معمول تھا...... لیکن بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے میں اندھا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی بٹیا کو بہت پریشان کیا۔ اس کے لیے میں ایک بار پھر آپ سب سے شما مانگتا ہوں۔ آپ شما کریں گے تبھی بھگوان بھی مجھے معاف کریں گے۔''

اب آشا کو یاد آیا۔ وہ انہیں پنڈت چاچا کہتی تھی۔ بابا کے حلیے میں آئی تبدیلی کی وجہ سے وہ اب تک نہیں پہچان نہیں پائی تھی۔ ان کی پتنی اور بہن کی موت پر وہ کتنے دنوں تک روتی رہی تھی۔

''پنڈت چاچا......'' اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور وہ دوڑ کر ان کی بانہوں میں جھول گئی۔

''مجھے یاد ہے پنڈت چاچا...... میں دیدی اور چاچی کے ساتھ کتنا کھیلتی تھی۔'' وہ ان کے کندھے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ ردے بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سہلا رہے تھے۔ سب نے دیکھا اس پتھر دل بابا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

شام کا دھندلکا اب اندھیرے میں بدل چکا تھا۔ لیکن آشا کے جیون کی بہت بڑی الجھن دور ہو رہی تھی اور اس کے دل میں سکون کی روشنی پھیل رہی تھی اور گھر میں بجلی

کی روشنی۔

''پنڈت چاچا...... آپ میرے کمرے میں چلیے...... مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' آشا ردے بابا کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ سبھی اس کی بات سن کر ہنسنے لگے۔ گھر میں اب کون تھا جو آشا کی کسی بات کی مخالفت کرتا۔

''چلتا ہوں بٹیا...... تھوڑا رکو تو۔'' بابا نے آشا کو پچکارتے ہوئے کہا۔ پھر روی سے مخاطب ہوئے۔ ''تم کون ہو نوجوان۔ آشا بٹیا کے لیے میں نے تمہیں بہت پریشان دیکھا ہے۔''

اب چاچا جی نے روی کا تعارف بابا سے کروایا۔ ''یہ روی ہے بابا...... بہت بڑے لوگ ہیں۔ میں نے آشا کی شادی روی سے طے کر دی ہے۔ آپ بھی آشیرواد دیجیے۔''

روی نے آگے بڑھ کر بابا کے چرن چھوئے۔ ردے بابا نے روی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشیرواد دیا۔ تب آشا کے پھر سے ضد کرنے پر بابا اس کے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہوئے۔ لیکن گزرے ہوئے واقعات کی بے اعتمادی کو نظر میں رکھتے ہوئے بابا نے روی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

اپنے کمرے میں آشا نے ردے بابا کو نہایت احترام سے بٹھایا اور خود ان کے قدموں کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ روی دوسری کرسی پر بیٹھا تھا۔

''پنڈت چاچا...... کیا آپ جنوں سے اپنی دشمنی اور لڑائی ختم نہیں کر سکتے؟'' آشا نے معصومیت کے ساتھ بابا سے پوچھا۔

''بٹیا...... اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں...... آکاش جی میرے بہت اچھے متر تھے' وہ بھی نہیں رہے۔ اب ایک تم ہو بٹیا۔ جسے میں اپنا کہہ سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی تمہیں اتنا کشٹ دے کر پاپ کا بھاگیدار بن چکا ہوں۔ اب میرے پاس کیول پرائشچت کا سمے ہے۔ تُو جیسے کہے گی میں ویسا ہی کروں گا۔'' ردے بابا کے لہجے میں پچھتاوا صاف جھلک رہا تھا جس سے روی بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔

''پنڈت چاچا۔ یہ جن میرے دوست ہیں۔ مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مگر چاچا جی اور گھر کے کسی فرد کو اس بارے میں پتہ نہیں ہے۔ آپ سے بھی بنتی کرتی ہوں کہ انہیں ان جنوں کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔''

آشا کی باتیں سن کر بابا مسکرانے لگے۔ انہوں نے ایک نظر آشا اور روی پر ڈالی اور بولے۔ ''مجھے اپنی منتر شکتی سے یہاں جنوں کی موجودگی کا پتہ چل گیا تھا۔ میں نے دور سے ہی بابا سکندر اور الوکھ کو اپنے منتروں سے اپنے بس میں کر لیا تھا۔ پر میں اس گھر میں ان سب کو بے عزت ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے منتروں کے اثر سے بابا سکندر تمہاری موسی کے سامنے بے عزت ہوتے' ایسا ہی کچھ منصوبہ تھا میرا...... لیکن اب میں نے اس جادوئی عمل کو واپس لے لیا ہے۔ میں ایشور کی سوگندھ لیتا ہوں کہ آج سے اپنی منتر شکتی کا استعمال صرف لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کروں گا۔''

روی جو پہلے ہی بابا سکندر کا سلیکھا موسی کی طرف محبت بھری نظروں کو محسوس کر کے حیران تھا۔ ردے بابا کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

اس نے ردے بابا سے کہا۔ ''بابا آپ نے اب برے کاموں کو چھوڑ کر بھلائی کا راستہ اپنا لیا ہے۔ اب ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ خود کو اکیلا مت سمجھیں۔''

کچھ دیر اسی طرح کی باتوں کے بعد سب ایک بار پھر سے ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ ردے بابا نے چاچا جی سے واپسی کی اجازت چاہی۔ چاچا جی نے ان سے آشا اور روی کی شادی ان کے ہاتھوں کروانے کا وعدہ لیا جسے ردے بابا نے قبول کر لیا۔

ردے بابا کے جانے کے بعد بابا سکندر اور چاچا جی کے درمیان روی اور آشا کی شادی سے متعلق تمام

معاملات اور باتیں طے پا گئیں۔

رات ہو چکی تھی۔ بابا سکندر نے جب جانے کے لیے اجازت مانگی تب چاچا جی انہیں رخصت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن بابا سکندر نے انہیں اطمینان دلایا کہ اتنے لوگ ہیں۔ کئی گاڑیاں ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم آرام سے چلے جائیں گے۔

وکرال اور وچترا مل کر روی کو گھسیٹ لے گئے۔

''اب کیوں رہے گا یہاں؟ ہم دولہا کے بغیر بارات سجا کر لائیں گے کیا؟''

آشا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ روی کا برا حال تھا۔ وچترا نے آگے بڑھ کر آشا کو گلے سے لگا لیا۔ اس نے دھیرے سے اس کے کان میں کہا۔ ''اب ہے جدائی کا موسم...... دو پل کا مہمان...... کیسے نہ جائے گا اندھیرا' کیوں نہ تھمے گا طوفان۔''

پھر سب آشا کو دلاسہ دیتے ہوئے نکل گئے۔

☆......☆☆☆......☆

شہر کا سب سے بڑا ہوٹل شادی کے فنکشن کے لیے سج کر تیار تھا۔ ہوٹل کے ایک حصے میں دولہا والوں کا قبضہ تھا تو دوسری طرف دلہن والوں کا۔

ہوٹل کی سجاوٹ جناتی ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ پوری دنیا سے جمع کیے گئے خوبصورت اور تازہ پھول اپنی خوشبو بکھیر رہے تھے۔ سجاوٹ تو ایسی تھی کہ جس نے دیکھا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ دولہا والے حصے میں انسانوں اور جنوں کی ملی جلی بھیڑ تھی لیکن دولہن والے حصے میں آشا کے سیوکوں کے علاوہ باقی سب انسان ہی تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ سیوک بھی کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔

چاچا جی تو اسی شہر کے تھے۔ ان کے ذاتی اور کاروباری دوستوں اور ساتھیوں کی بڑی تعداد یہاں موجود تھی۔

یہاں کا سارا انتظام دولہا والوں کی طرف کیا گیا تھا۔ حالانکہ چاچا جی خود اپنی بھتیجی کے لیے سارا انتظام کرنے کے لیے تیار تھے لیکن استاد الوکھ نے اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا کر چاچا جی کو منا لیا تھا۔

پورے انتظام میں کہیں ایک چھوٹی سی بھی کمی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور کمی ہوتی بھی کیسے۔ ظاہری اور غیبی روپ میں ہزاروں جن کام پر لگے ہوئے تھے۔

وچترا ایک سندری لڑکی کے ساتھ دلہن والے حصے کی طرف آئی۔ ایک بہت ہی شاندار کمرے میں آشا بیٹھی تھی۔ اس کے آس پاس سیما اور نکیتا اور ان کی سہیلیاں تھیں۔

وچترا نے سیما' نکیتا اور ان کی سہیلیوں کو باہر جانے کے لیے اور ان کے جانے کے بعد وہ آشا کی طرف بڑھی۔

''آشا...... آشو جان...... کیسی ہے؟'' وچترا ہنستی ہوئی بولی۔

آشا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کھینچ لیا۔

''اوہو...... خوب طاقت بنا لی ہے...... لیکن یہ طاقت کسی اور پر آزمانا۔'' بولتی ہوئی وچترا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آشا کو پتہ تھا کہ جن زادی کتنی شکتی شالی ہے۔ اسے وچترا اور وکرال کی جوڑی بہت پسند تھی۔ دونوں خوش مزاج' ہر دم ہنستے مسکراتے رہنے والے۔ آشا کے لیے تو اب وہی اس کے اپنے تھے۔

''ان سے ملو یہ ہیں مس ٹینا جی۔'' وچترا کے بتانے پر آشا نے ٹینا کو دیکھا۔ خوش لباس اور سندری ٹینا اپنے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شولڈر بیگ ٹانگے ہوئے تھی۔ آشا نے تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

''یہ دیش کی سب سے اچھی بیوٹیشنز میں سے ایک ہیں۔ روی اور وکرال کے ایک دوست آدتیہ کی دلہن سجنا کو انہوں نے سجایا تھا۔ اور سجنا کو انہوں نے بالکل پری بنا دیا تھا۔ آج یہ ہی تم کو دلہن بنائے گی۔'' وچترا نے تفصیل سے بتایا اور اٹھ کر جانے لگی۔

"نہیں بیٹھو نا وچترا' کہاں جا رہی ہو؟" آشا کے کہنے پر وچترا لمبی لمبی سانسیں لے کر منہ ٹیڑھا کر کے بولی۔ "میرے دیور کی شادی ہے..... مجھے تو ڈھیر سارے کام کرنے ہیں۔ میں نہیں بیٹھ سکتی۔" وچترا کی بات پر آشا ہنس پڑی۔

"بس ایسے ہی ہنستی رہو میری جان...... اور گھبراؤ مت اب تو میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔" کہتی ہوئی وہ باہر نکل گئی۔

آشا بچپن میں انگلش اسکول میں پڑھتی تھی۔ مگر پھر اتنی لمبی مدت وہ اپنوں کی قید میں رہی کہ باہر کی دنیا کو بھول ہی چکی تھی۔ آج اسے میک اپ اور سنگھار کا نہ تو کوئی شوق تھا اور نہ ہی زیادہ معلومات۔ سجنے کے نام پر اکثر رات میں سب کام سے نمٹنے کے بعد وہ اپنی ماں کے جھلملاتے لباس پہن کر اور آئینے سے باتیں کر کے خوش ہو لیتی تھی۔

اسے تو اب صرف روی کی خوشی عزیز تھی۔ اور روی آج اسے سجانا چاہتا تھا تو وہ سجنے کے لیے تیار تھی۔

ٹینا اپنی پیاری باتوں کے ساتھ ساتھ اسے سجانے میں لگ گئی۔ دو گھنٹے کیسے گزرے اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ اب جب اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو دنگ رہ گئی اور خود اپنا عکس دیکھ کر شرما گئی۔

☆☆☆

ہوٹل کے ایک بڑے سے ہال کے درمیان میں اسٹیج بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے صوفے لگے ہوئے تھے۔ روی کے کچھ انسان دوست تھے جو وہاں موجود تھے۔ جب وہ اسکول اور کالج میں پڑھتا تھا تب بھی اس کے گنے چنے ہی دوست تھے۔ ان میں سارو جو کلکتہ کا رہنے والا تھا۔ ہال میں آتے ہی وہ اسٹیج کی طرف بڑھا جہاں روی اور آشا کو بٹھایا گیا تھا۔ روی تو بس آشا کی قاتلانہ خوبصورتی کو دیکھنے میں ہی مگن تھا تبھی اسے سارو کی آواز سنائی دی۔

"روی دادا..... کوئیسا ہے؟ موجے میں تو ہے؟"

"آؤ آؤ دادا..... اور سناؤ...... دیدی کیسی ہے؟ اور تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ میں موجے میں نہیں جوتے میں ہوں۔"

"اوئے...... روی بھائی...... آپ بھی نا۔" اس نوک جھوک کو سن کر آشا کو ہنسی آ رہی تھی۔

"ان سے ملو دادا...... یہ آشا ہیں......"

"آشا؟" سارو نے روی کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "کہیں یہ وہ آشا تو نہیں ہیں۔ مگر یہ اتنی سج دھج کر یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟"

اسی وقت استاد الوکھ بھی وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے سارو کی بات سن لی تھی۔ سارو کی طرف ہمدردی سے نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔ "سارو...... یہ وہ آشا نہیں ہے۔ یہ روی کی آشا ہے...... اس کی دلہن۔"

"ارے گرو دیو! کیسا ہے آپ؟" سارو مڑا اور استاد الوکھ کو دیکھ کر بولا۔

"اچھا ہوں دادا۔" بول کر استاد الوکھ نے اسٹیج کے آگے کی قطار میں لگے ایک صوفے پر اسے بٹھا دیا۔ استاد الوکھ کو سارو ایک سیدھا سادا سا آدمی لگتا تھا۔

سارو نے جیسے ہی اپنی دائیں اور دیکھا تو ٹھیک سے بولا۔ "ارے...... سومیر بھائی۔"

سمیر اپنے خراب موبائل کو وہیں درست کرنے میں لگا ہوا تھا۔ چڑ کر بولا۔ "ارے دادا...... دیکھتے نہیں میرا موبائل خراب ہوا پڑا ہے۔"

اب سارو تھوڑی دیر کے لیے کنفیوز ہو گیا کہ وہ شادی کے فنکشن میں بیٹھا ہے یا موبائل ریپئرنگ شاپ میں۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سارو کو بابا سکندر دکھائی دیئے جو اونچی سی پگڑی سر پر باندھے کسی سے بات کر رہے تھے۔

"سور کار...... ارے سومیر دادا یہ سور کار بھی آیا کیا۔"

سارو کے چیخنے پر سمیر نے ویسے ہی موبائل کو جیب میں رکھا اور بولا۔ "ہاں یہی سکندر سرکار ہیں۔"

"ارے وہ...... سور کار جس سے بات کر رہا ہے......

وہ اس کی سوتالی بھابھی ہے کیا؟"

"ہے...... دادا...... خبردار میرے سامنے کسی سوتالی کا نام مت لینا۔" سمیر کو ہتھے سے اکھڑتے دیکھ کر سارو حیرت میں پڑ گیا۔ "سومیر دادا کو آج پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔" سوچتے ہوئے سارو خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

ایک نوکر ٹرے میں کئی طرح کی ڈرنکس لے کر سارو کے سامنے پہنچا۔ سارو نے اس کی شکل غور سے دیکھی اور کہا۔ "اوئے تو انکیت ہے کیا؟"

"ہاں دادا...... میں انکیت ہی ہوں۔" وہ نوکر بڑی ہی درد بھری آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں...... تو مارا یہی حال ہونا تھا۔ اسکول میں جب تو نہیں کچھ لکھنے کو دیا جاتا تھا...... تو کبھی پورا نہیں کرتا تھا۔" سارو غصے سے بولا۔

"ارے تو تم کب پورا لکھتے تھے؟" انکیت بھول گیا کہ وہ وہاں ایک نوکر ہے۔

"میں نہیں لکھا تو کیا ہوا...... میرے پاس دماغ ہے۔ تو دیکھا آج میں ایم سی ہوں۔"

"ایم سی؟ چھی چھی ی ی۔"

"پان...... پان ملے گا؟" سارو اچانک پوچھنے پر انکیت ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ "پان تو نہیں...... اس سے کام چلے گا؟" اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکال کر دکھاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

سارو نے جھٹ اس کے ہاتھ سے پڑیا جھپٹ لی۔

"ہاں...... ہاں۔ چولے گا...... چولے۔"

سارو اس پڑیا کو اپنے منہ میں ڈال رہا تھا کہ چونک پڑا۔ مکیش اور مہیش باتیں کرتے گزر رہے تھے۔

"مکیش بھائی...... آخر...... روبی بھائی لے اڑا نا...... اس کو۔" سارو پھر چلا کر بولا۔

"چلیے ادھر چل کر بیٹھتے ہیں مہیش بھائی' دادا کو لگتا ہے تھوڑی چڑھ گئی ہے۔"

مکیش سارو کو ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

بیاہ کا مہورت ہو چکا تھا۔ اسٹیج پر ہی اگنی کنڈ بنا ہوا تھا۔ پنڈت کاشی ناتھ عرف بابا ردے ناتھ کے منتروں کے بیچ آشا اور روی نے اگنی کے سات پھیرے لیے اور نہایت شاندار انداز سے دونوں کی شادی انجام پائی۔

لوگ مبارک بادیں دے رہے تھے۔ روی اپنے دوستوں کا تعارف آشا سے کروا رہا تھا۔

"یہ میرے بھارت...... اوہ...... سوری مسٹر انڈیا ہیں...... اپنے جادو سے چوروں بدمعاشوں کو پکڑتے ہیں۔ پیار کرنے والوں کا بیڑہ پار بھی کرتے ہیں۔"

"یہ بھی جن ہے کیا؟" آشا نے روی کی طرف جھک کر دھیرے سے پوچھا۔

"نہیں...... میں جتنے لوگوں کا تعارف کروا رہا ہوں وہ سب ہم جیسے انسان ہی ہیں...... یہ مسٹر جانو ہیں۔ گجرات میں ان کا بڑا کاروبار ہے۔ یہ سمیر بھائی ہیں۔ سب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ سارو سے تم مل ہی چکی ہو۔ یہ سکندر سرکار ہیں۔ باتوں کے دھنی۔" اسے دیکھ کر آشا چونک پڑی۔ سکندر سرکار اور بابا سکندر کی شکل بھی ملتی جلتی تھی۔ بس عمر کا فرق تھا۔

"یہ مہیش اور مکیش بھائی ہیں۔ دوستوں پر جان لٹانے والے۔ وہ دیکھو شرارتی سی منی۔ اسے ہم چٹکی کہتے ہیں۔ مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔ یہ منیش بھائی ہیں۔ یہ راج صاحب بہاری ہیں' یہ ہیں کمل ہنس' یہ کے کے سونی' یہ انش نرائن' یہ جندل' یہ تو انمول ہیں' یہ شوبھت ہیں' یہ کول ڈڈ' یہ خاموش پریمی مطلب سائلنٹ لور ہیں۔ یہ ہیں پرنس لیکن بولتے بہت کم ہیں۔

یہ پولیس فورس کے بے نام بادشاہ ہیں۔ یہ دونوں راشی اور نہا روشن ہیں' یہ جو چھپ رہے ہیں یہ مسٹر بونڈ ہیں۔ پکے جاسوس۔ یہ عزیز صاحب ہیں۔ یہ سریش مینڈس ہیں۔

یہ اس منڈلی کے گرو گھنٹال روشن بھائی اور روہت بھائی ہیں' بہت کم کہیں آتے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں جاتے ہیں دھوم مچا دیتے ہیں۔ اور بھی کئی دوست ہیں جو

شاید ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔"
اس کے بعد کھانے پینے کا دور چلا۔ سارو ہاتھ دھو کر انکیت کے پیچھے پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے مہمانوں کی بھیڑ کم ہوتی گئی۔ بابا ردے ناتھ بھی اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے۔
روی اور آشا کو ایک سجی ہوئی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اس کے پیچھے اور آگے کتنی ہی گاڑیاں تھیں۔ پتہ نہیں جنوں نے کہاں سے اتنی گاڑیاں جمع کر لی تھیں۔ ہوٹل سے روانہ ہو کر یہ قافلہ روی کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ اس شہر میں روی کی ایک شاندار کوٹھی تھی جو بابا سکندر نے بہت پہلے روی کے لیے تیار کروائی تھی۔
......☆☆☆......
خوبصورت ڈھنگ سے سجے بڑے سے کمرے میں آشا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ وچترا اور کچھ جن زادیاں وہاں موجود تھیں۔ دلہن پر روپ بھرپور انداز سے نکھر کر آیا تھا۔ ایک تو وہ پہلے سے ہی خوبصورت تھی پھر بیوٹیشن کا کمال اور پھر دلہن پر قدرت کا فطری نکھار۔
آج وہ ہر فکر سے آزاد تھی۔ آج وہ خود کو خوش قسمت مان رہی تھی۔
اس پر سے منحوس کا لیبل ہٹ چکا تھا۔ وچترا وہاں سے اٹھ کر باہر گئی اور روی کی بانہہ پکڑ کر اندر لے آئی۔ پھر باقی لڑکیوں کے ساتھ باہر جانے لگی۔
روی تو اپنی آشا کو پا کر ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس کا دلہن والا روپ روی کو شرارت کرنے پر اکسا رہا تھا۔ لیکن اس کے من میں ایک الجھن تھی۔ اس نے آشا سے پوچھا۔ "تمہارے پاپا کا کیا نام تھا؟"
"پرتاب کمار۔" آشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"پھر...... یہ آکاش لال؟" بات روی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"یہ ہمارے سیوکوں کا کمال تھا۔ وہ اپنے طور پر ردے بابا کا پورا ماضی پہلے ہی پتہ کر چکے تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک آکاش لال تھے۔ ان کی ایک بچی بھی تھی۔ ردے بابا اس بچی کا نام بھول چکا تھا۔ میرے جن سیوک ٹیلی پیتھی کے ذریعے اسی پل یہ پتہ کر چکے تھے۔ جب چاچا جی میرے بارے میں ردے بابا کو بتانے لگے تو اس وقت ان کے دماغ پر ایک سیوک کا قبضہ تھا۔ پھر چاچا جی میرے پاپا کا صحیح نام کیسے بتا سکتے تھے۔ وہ سیوک ہر وقت مستعد تھے۔"
روی کا حیرت سے برا حال تھا۔ لیکن ابھی بھی اس کی چنتا پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی۔
"اگر کبھی ردے بابا کی ملاقات آکاش لال سے ہو گئی...... تب؟"
"نہیں ہو سکتی نا...... ملاقات...... آکاش لال پر ایک کاروباری الزام لگ گیا تھا۔ وہ کئی سال پہلے اپنا سب کچھ سمیٹ کر دور کے ایک شہر میں بس گئے ہیں اور وہاں وہ دوسرے نام سے رہ رہے ہیں۔" آشا مسکراتے ہوئے بولی۔
اب روی کی الجھن دور ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ ردے بابا جیسے اڑیل بھینسے کو آشا کے سیوکوں کی چالاکی نے کتنی آسانی سے میمنہ بنا دیا تھا۔
"تمہیں سب پتہ تھا؟" روی نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔
"ہاں...... سیوک مجھے سب بتا رہے تھے۔ جس سمے چاچا جی میرے پاپا کے بارے میں بتا رہے تھے اس سمے ایک سیوک میرے کانوں میں سب کچھ بتا رہا تھا۔ تمہیں کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں مل پایا۔"
"آشا کے سیوک...... زندہ باد!!!!" کہتے ہوئے روی نے اپنی دلہن کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔
ختم شد
⌘

امتحان

راحیلہ تاج

زندگی ہر قدم پر امتحان لیتی ہے اور اس امتحان میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دل کے بجائے دماغ سے کام لے کر فیصلے کرتے ہیں۔
اک دوشیزہ کا احوال واقعی اس کی زندگی دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کا دل و دماغ کسی ایک فیصلے پر متفق نہیں ہو رہے تھے۔

"جب سے کیروں اور فلپ کارڈف شفٹ ہوئے ہیں نہ ہم جا سکے ہیں اور نہ وہ ادھر آئے ہیں۔ میں تو کیرول کی بچی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ اس ویک اینڈ پر وہ آ رہے ہیں۔ تو میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ضرور آؤ۔ مدتیں گزر گئی ہیں سب کو اکٹھے ہوئے۔" ممی نے مجھ سے کہا۔
"اچھی بات ہے مما میں بھی آ جاؤں گی۔ مگر صرف دو روز کے لیے۔" میں مما کی بات نہ ٹال سکی۔
"نہیں سینڈرا! تمہیں بھی تو یارک شائر آئے عرصہ دراز گزر گیا ہے۔ میری اور ڈیڈی کی خاطر کیا تم ایک ہفتے کی چھٹی بھی نہیں کر سکتیں۔"
"اچھا مما میں ایک ہفتے کے لیے آ جاؤں گی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ میری والدہ کو اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں نے لندن میں اپنا مکان لے لیا ہے اور مستقل طور پر وہاں رہنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے اب میرا یارک شائر آنا جانا مشکل ہے۔
"تمہیں یہاں آ کر دہری خوشی ملے گی سینڈرا کیونکہ گیری بھی واپس آ گیا ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ کام کر رہا ہے اور بیوی سے اس کی علیحدگی ہو چکی ہے اس لیے......!"
"اب مجھے گیری سے کوئی لگاؤ، کوئی دلچسپی نہیں مما۔" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ حالانکہ یہ بات جھوٹ تھی لیکن میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مجھے اب تک گیری سے پیار ہے۔
"اگر واقعی ایسا ہے تو بھی تمہیں اس میں دلچسپی لینی چاہیے سینڈرا! کبھی تم لوگ ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ جب بھی ملتا ہے تمہارے بارے میں مجھ سے ضرور پوچھتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت اچھی جاب کر رہی ہو اور آج کل کی لڑکیوں کو کیریئر عزیز ہوتا ہے لیکن ایک نہ ایک روز تو تمہیں شادی کرنا اور اپنا گھر بسانا ہے۔ پھر کب تک ٹال مٹول کرتی رہو گی ذرا سوچو تم تیس برس کی ہونے والی ہو۔" مما نے فون پر تقریر کر ڈالی۔
"ابھی پچھلے مہینے ہی تو اٹھائیسویں برس میں داخل ہوئی ہوں مما۔" میں نے یوں احتجاج کیا جیسے دو سال کوئی بہت بڑا فرق رکھتے ہوں۔ "اچھا تو پھر میں آ رہی ہوں۔ ڈیڈی کو بتا دیجیے گا۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا لیکن ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے میرا ہاتھ لرز گیا۔
میں ٹھنڈی سانس لے کر سوچنے لگی کہ ممی کو

گیری کے بارے میں بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے اس کی یاد دلائے اور اس کا تذکرہ کر کے میرے دل کے زخم کھرچے، ہم صرف دوست ہی نہیں ایک دوسرے کے محبوب تھے۔ وہ عرصہ جو ہم نے ایک دوسرے کی چاہت میں، پیار کی چھاؤں تلے گزارا ان مٹ نقوش ہی نہیں میرے دل پر گہرے زخم بھی چھوڑ گیا تھا۔



وہ ہماری چڑھتی جوانیوں کے دن تھے ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ ہماری دوستی محبت کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ ہم نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ تعلیم مکمل کرنے تک اپنے والدین کو یہ نہیں بتائیں گے کہ ہم شادی کرنے والے ہیں۔ جب ہمارے امتحان کا نتیجہ آ گیا تو میں نے گیری سے کہا تھا۔ ''اب ہمیں اپنے اپنے والدین کو بتا دینا چاہیے۔''

''کیا؟'' وہ یوں بولا جیسے اسے کچھ بھی یاد نہ ہو۔

میں ہنس پڑی۔ ''ارے بھلکڑ! اپنی شادی کے بارے میں۔'' گیری، میری اس بات پر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ ''لیکن...... لیکن ہم لوگ ابھی کم عمر ہیں سینڈرا!''

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شادی نہیں کرنی چاہیے۔''

''نہیں شادی تو ضرور کروں گا مگر ابھی نہیں۔'' وہ بولا۔

''پال اور نگل نے مل کر ایک کار خریدی ہے۔ وہ یورپ کی سیاحت پر جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے جو میں نے قبول کر لی ہے ہم بہت جلد روانہ ہونے والے ہیں۔''

''تم جا رہے ہو تو میں کیا کروں۔''

''تم سیکریٹری کی تربیت دینے والے کالج میں داخلہ لے لو۔ تم خود یہ کہتی بھی رہی ہو اگر ہم شادی کر بھی لیں تو ڈیڈی کے ساتھ کام کرنے سے مجھے اتنی آمدنی نہیں ہو گی کہ ہمارا گزارا ہو سکے اس صورت میں تمہیں بھی کہیں نہ کہیں ملازمت کرنا ہی پڑے گی۔''

''اگر یہ صورت حال ہے تو تمہارے پاس رقم نہیں ہو گی پھر تم پال اور نگل کے ساتھ سیاحت پر کیسے جا رہے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''ہم تینوں راستے میں محنت مزدوری کریں گے۔ اس طرح اپنا خرچا بھی نکالیں گے اور تجربہ بھی حاصل کریں گے۔''

مجھے گیری کی بات اچھی نہ لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پال اور نگل کے ساتھ جا رہا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ میں تو اپنے تئیں یہ سوچ کر مطمئن ہو چکی تھی کہ اسکول کی تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔ گیری کے اس طرح اچانک سیاحت پر جانے کے فیصلے سے ایک طرف تو میرے یقین کو دھچکا لگا تھا۔ دوسرے میں ڈر رہی تھی کہ فاصلے کہیں گیری کو ہمیشہ کے لیے مجھ سے نہ چھین لیں۔ پھر ایک مشکل یہ بھی تھی کہ میں گیری کے انتظار میں وقت کیسے کاٹوں گی۔ کیا اس کی جدائی میرے لیے عذاب نہیں بن جائے گی۔

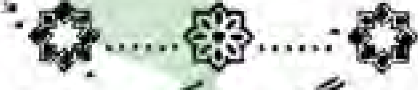
یہ ٹھیک ہے میں نے گیری سے کہا تھا کہ میں سیکریٹری کی تربیت لے کر کہیں ملازمت کروں گی لیکن یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ شادی کے بعد میں اور گیری مل کر رقم جوڑیں گے تا کہ اپنا مکان خرید سکیں۔

گیری کی باتوں سے مجھے دکھ پہنچا مگر میں نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے گیری میں سوچوں گی۔ ہم اس سلسلے میں بعد میں بات کریں گے۔''

یہ آخری موقع تھا جب گیری سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دو روز بعد گیری اور اس کے دوست سیاحت پر روانہ ہو گئے تھے۔ تیسری صبح مجھے گھر کے دروازے میں لگے لیٹر بکس سے گیری کا خط ملا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ ان کی تیاری اچانک ہو گئی ہے اور وہ آدھی رات کو روانہ ہو رہے ہیں۔ اس لیے اس نے مجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

کچھ عرصے بعد پیرس، وینس اور سوئٹزر لینڈ سے اس کے تصویری پوسٹ کارڈ ملے تھے پھر اس نے خط بھیجنا بند کر دیے تو میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور آفس سیکرٹری کی تربیت حاصل کرنے لگی۔ کورس مکمل کرنے کے بعد پہلے میں نے ایک مقامی فرم میں اور اس کے بعد بریڈ فورڈ کی ایک کمپنی میں ملازمت کر لی۔ اس دوران پال اور نگل لوٹ آئے اور انہوں نے بتایا کہ گیری نے جرمنی کے شہر اسٹٹ گارمٹ میں ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے اور وہ واپس نہیں آنا چاہتا۔

میں اس عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی گیری کو نہیں بھولی تھی۔ سب جانتے تھے کہ میں نے اس کی خاطر جوگ لے رکھا ہے میں نے کسی نوجوان کی طرف سے دوستی کے لیے بڑھنے والا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ اس خبر نے میرے دل میں درد اور آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ لوگ مجھے ترحم نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ مما ہر وقت مجھے نصیحتیں کرنے لگیں کہ میں یہ جوگ چھوڑ دوں۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتی تھیں کہ میں گیری کو بھول جاؤں اور کسی دوسرے آدمی سے شادی کر لوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ سو میں نے گھر اور اپنا شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ اپنی محبت کا ماتم کرنے سے اپنا کیریئر بنانا زیادہ اچھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس طرح میں مسرور رہ سکوں۔



میں لندن آ گئی چار کمپنیوں میں ملازمت کرنے کے بعد پانچویں جاب مجھے ایسی ملی جو میرے مزاج سے مطابقت رکھتی تھی اور ہر صبح دفتر جاتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہوتی۔ میں مسٹر جیسن میرڈتھ کی سیکریٹری بن گئی تھی جو ایک بیرسٹر تھا۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایسے مقدمات لڑتا تھا جن میں کوئی دم نہیں ہوتا تھا لیکن ہمیشہ جیت جاتا تھا۔ یہ بڑا دلچسپ کام تھا اور جیسن کی شخصیت بھی بڑی پرکشش تھی۔ میں اس وقت پچیس برس کی تھی اور جیسن چونتیس سال کا وہ ایک شادی کر چکا تھا جو طلاق پر منتج ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ اسے کسی کی طرف توجہ دینے کا وقت ملتا تھا نہ تفریح کے لیے۔ پھر وہ میرا باس تھا۔ اس لیے میں نے کبھی بھول کر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ رومانس کا امکان ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ میں خوش تھی کہ اسے میرا کام پسند ہے۔

جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایک ہفتے کی چھٹی چاہتی ہوں تو اس نے کہا۔ ''اگر تم صرف چھٹی چاہتی ہو تو جا سکتی ہو۔''

''دراصل میں خود تو چھٹی کی خواہش مند نہیں

لیکن میری والدہ کا اصرار ہے ورنہ ہرگز نہ جاتی۔“ میں نے بتایا۔

”کیوں! تم خود کیوں نہیں جانا چاہتیں۔“

”میرا پرانا بوائے فرینڈ جرمنی سے واپس آ گیا ہے اور میری والدہ یہ ضرور چاہے گی کہ ہم ایک دوسرے سے ملیں جب کہ میں یہ نہیں چاہتی۔“

”ڈرتی ہو کہ جس طرح اس نے تمہیں پہلے دکھ پہنچایا تھا کہیں اسی طرح اب بھی دکھ نہ پہنچائے۔“

”آپ...... آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”چونکہ میں تمہیں اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہوں۔ اس لیے جان گیا ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں چہرہ شناس بھی ہوں۔ مجھے اپنے پیشے میں اس سے خاص مدد ملتی ہے۔“

جب جیسن سمجھ ہی گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے تو میں نے بھی کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور گیری کے بارے میں سب کچھ اسے بتا دیا۔ تب اس نے کہا۔

”میں شروع ہی میں سمجھ گیا تھا کہ تم کسی چیز سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہو۔ تمہارے ماضی میں کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور رونما ہوا ہوگا جس نے تمہارے حال پر بھی اپنی غیر مرئی چھاپ لگا رکھی ہے۔ تمہاری عمر کی عورتیں مردوں سے اجتناب نہیں کرتیں۔ مگر تم مردوں سے گریزاں ہو تو اس کا باعث بھی کوئی مرد ہوگا۔ خیر، تمہاری والدہ اگر تمہیں تمہارے پرانے بوائے فرینڈ سے ملانا چاہتی ہے تو یہ اچھا ہی ہے تاکہ اس سے ملنے کے بعد یہ جان سکو کہ اس کے لیے کیا محسوس کرتی ہو۔ یہ کام تو تمہیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ سینڈرا!“ پھر اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”لنچ کے بعد دفتر مت آنا اور اپنے لیے کچھ نئے کپڑے خرید لینا۔ ایسے کہ جنہیں پہننے کے بعد لوگ بے اختیار کہہ اٹھیں۔ دیکھو یہ ہے وہ حسین و جمیل عورت جو ہمارا شہر چھوڑ کر لندن چلی گئی۔ یہ ہے وہ زہرہ جمال جس سے ہر نوجوان شادی کا آرزومند ہے۔“

میں ہنس پڑی۔ ”خواہش تو میری بھی یہی ہے کہ لوگ میرے بارے میں ایسا ہی سوچیں اور کہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے سینڈرا! اس سلسلے میں پھر کسی وقت بات کریں گے۔“

میں سمجھ نہ سکی کہ جیسن کی ان باتوں کا مقصد کیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی لنچ کیا اور شاپنگ کرنے چلی گئی۔



سنیچر کو جب میں ممی کے ہاں پہنچی تو کیرول اپنی دو ماہ کی بیٹی فلی اور شوہر کے ساتھ موجود تھی۔ فلی بہت پیاری لگ رہی تھی لیکن مجھے یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ میری بیس سالہ بہن ایک بچی کی ماں بھی بن گئی ہے۔ میری دوسری بہن سارہ نے بھی سات سال پہلے اٹھارہ برس کی عمر میں شادی کر لی تھی اور اب وہ چھ سالہ بیٹے روبن اور تین سالہ بیٹی للی کی ماں تھی۔ وہ اور اس کا شوہر ہاورڈ مما کے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔

علیک سلیک اور بچوں کو پیار کرنے کے بعد جب میں آرام سے بیٹھ گئی تو سارہ نے کہا۔ ”تم تو اس لباس میں واقعی بہت اسمارٹ سیکریٹری نظر آ رہی ہو سینڈرا!“

مجھے اس کی بات پر قدرے شرمندگی محسوس

ہوئی کہ اس کے لہجے میں حسرت تھی میں نے کہا۔

”ایسا لباس پہننا میرے پیشے کا تقاضا ہے سارہ۔ بالکل اسی طرح جیسے نرسوں کو سفید براق یونیفارم پہننا پڑتی ہے۔“

”تم خوش قسمت ہو سینڈرا کہ تمہیں اچھی جاب ملی ہے اور تنخواہ بھی بہت اچھی ملتی ہوگی۔“

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مما بول اٹھیں۔

”خوش قسمت تو تم ہو سارہ کہ شادی کے بعد خدا نے تمہارے آنگن میں دو پھول بھی کھلا دیے ہیں۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ”میں نے گیری کو بلایا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ایک کپ کافی ہی پی لے وہ آتا ہی ہوگا۔“

”آپ نے ایسا کیوں کیا مما؟“ میں نے برہمی سے پوچھا۔

”گیری صرف تمہارا ہی نہیں پوری فیملی کا دوست ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس کی وہ حرکت بھول جانا چاہیے۔ تب وہ نادان سا لڑکا تھا اور پھر وہ اپنے کیے پر نادم ہے۔“

”آپ یہ سب کیسے جانتی ہیں۔“ میں نے سوال کیا۔

میرے والد جو عام طور پر خاموش رہتے ہیں۔ بول پڑے۔

”یہ کیسے جانتی ہیں ارے بھئی یہ اس سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اب وہ وہی کہے گا جو یہ سننا چاہتی ہیں۔“

”آپ کا خیال ہے کہ میں نے اسے سکھایا پڑھایا ہے۔“ مما نے احتجاج کیا۔ ”میں اس سے بات چیت ضرور کرتی ہوں۔ مگر پٹیاں نہیں پڑھاتی۔ وہ خود سینڈرا سے ملنے کا آرزومند ہے۔ اس لیے آنے میں دیر نہیں کرے گا۔“

میرے آنے سے پہلے سب لوگ کھانا کھا چکے تھے مگر مما نے میرے لیے کچھ الگ سے رکھ دیا تھا۔ وہ کھا ہی رہی تھی کہ اطلاعی گھنٹی چیخ اٹھی۔ آنے والا گیری تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل نے سرگوشی کی۔ ”گیری آج بھی اتنا ہی وجیہہ و شکیل ہے جتنا پہلے تھا۔“

گیری مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی عیار تبسم تھا جو ہمیشہ مجھے موم بنا دیا کرتا تھا۔ لیکن میں دل کی سازش کے باوجود نہ پگھلی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے ابھی تک اپنی والدہ پر غصہ آ رہا تھا۔

گیری میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ونڈر فل! تم بہت اسمارٹ اور خوب صورت ہو گئی ہو سینڈرا۔“

ادھر ادھر کی باتوں اور کافی پینے کے بعد گیری نے مجھے لانگ ڈرائیو پر چلنے کی دعوت دی۔ میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی لیکن مجھے جیسن کی بات یاد آ گئی کہ مجھے اس سے ملنے اور باتیں کرنے کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ اب اس کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہوں۔ حالانکہ میں یہ بات پہلے سے جانتی تھی کہ وقت اور فاصلے کی آندھیوں نے میرے دل میں روشن اس کی محبت کے چراغ کو گل نہیں کیا۔

میں اکثر اسی کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ آج میں اسے اپنے قریب پا کر اس طرح جذباتی نہیں ہوئی تھی جیسے کہ ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ میرا خیال یہی تھا کہ جس طرح مما نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملوایا تھا مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود میں

یہ جاننے کی متمنی تھی کہ میرے بارے میں گیری کے محسوسات کیا ہیں؟ کیا وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟ ممکن ہے کہ ہم پچھلی باتیں بھول کر عہد محبت کی تجدید کریں اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے گیری کو اپنے خوابوں اور خیالوں سے نکال دینا پڑے گا۔ یہ سوچ کر میں اس کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر چلی گئی۔

وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ میں بھی خاموش رہی۔ بلکہ مجھے سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ کیا بات کروں حالانکہ وہ دس برسوں کے طویل عرصے کے بعد ملا تھا۔ آخر اسی نے مہر خاموشی توڑی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم ایک کامیاب کیریئر وومن بن چکی ہو۔''

''تم نے ٹھیک ہی سنا ہے اور اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے سیکریٹری کی تربیت حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جس پر میں نے عمل کیا۔''

''یہ بڑا غلط مشورہ تھا۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ مجھے یورپ کی سیاحت پر نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہیں رہنا چاہیے تھا' تمہارے ساتھ' مگر ان دنوں ہم کم عمر تھے اور تم مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں۔''

میں نے اس کی ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ بولا۔ ''تم نے سنا میں نے کیا کہا۔''

''ہاں' تم نے جو کچھ کہا ہے وہ میں نے سنا ہے لیکن جب تم شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے تو پھر تمہارے یہاں رہنے کا کیا فائدہ ہوتا تم نے اچھا ہی کیا جو یہاں سے چلے گئے۔''

''تم غلط سمجھی تھیں سینڈرا!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''تم جانتی تھیں کہ مجھے تم سے شدید محبت تھی۔ میں فوری طور پر نہیں' کچھ عرصے بعد شادی کرنا چاہتا تھا۔''

''جو تم نے ایک سال بعد جرمنی میں کرلی۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''بس میں پھنس گیا تھا۔ وہ لڑکی تم سے بھی کہیں زیادہ.....ضدی تھی۔''

یہ موقع تھا کہ میں اس سے وہ حالات معلوم کروں جن کے تحت اس نے شادی کی جو طلاق پر ختم ہوئی لیکن میں نے اس سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کیا۔ ان باتوں کا فائدہ ہی کیا تھا۔

''مجھ سے دو غلطیاں ہوئیں۔'' گیری پھر بولنے لگا۔ ''پہلی تمہیں چھوڑ کر جانے کی اور دوسری جرمنی میں اس سے شادی کرنے کی'' یہ کہہ کر اس نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ ''میں اپنے کیے پر نادم ہوں سینڈرا! کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں۔''

''معافی کی تو کوئی بات ہی نہیں گیری! میں نہیں جانتی تھی کہ شادی کا جتنا اشتیاق مجھے تھا' اتنا تمہیں نہیں تھا۔ اس لیے تمہارے یہاں سے چلے جانے کا الزام بھی میں اپنے سر لیتی ہوں۔ تمہارے جانے سے مجھے شدید دکھ اور صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اب میں خود پر قابو پاچکی ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا کیریئر بنالیا ہے۔ اگر تم یہاں سے نہ جاتے تو میں آج بھی یہاں وہی ملازمت کررہی ہوتی۔ جس سے میں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔''

''نہیں سینڈرا! میں نہ جاتا تو ہم ایک ساتھ رہتے۔ ہماری زندگیوں کے دس بہترین سال ضائع نہ ہوتے۔''

مگر یہ عجیب بات ہے کہ مجھے اس کے لہجے میں شدت محسوس نہ ہوئی یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سارے جذبے برف تلے دب گئے ہوں۔ وہ پہلے جیسا پرجوش گیری نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔'' گیری نے کہا۔ ''یا تم مجھے سزا دینا چاہتی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا۔ اس کی مجھے سزا ملنی چاہیے اور بڑی حد تک سزا مجھے مل بھی چکی ہے۔''

''دیکھو گیری!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب انسان اپنے آپ سے جنگ لڑتے لڑتے تھک جاتا ہے۔ تب اس کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ وہ صرف پیچھے ہٹ سکتا ہے میری زندگی میں بھی وہ وقت آچکا ہے گیری! اب میں تمہاری طرف نہیں بڑھ سکتی۔'' یہ کہنے کے بعد میں خود حیران تھی کہ یہ سب میں نے کیسے کہہ دیا۔

''تم میں یہ تبدیلی اس لیے آئی ہے کہ تم نے اپنا کیریئر بنالیا ہے لیکن کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ ہم مل کر اسے حل نہ کرسکیں۔''

''نہیں گیری!'' اب ہم ایک نہیں ہوسکتے۔''

''لیکن کیوں۔''

''اس لیے کہ اب میں کسی اور کو چاہنے لگی ہوں۔'' میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

''مجھے یقین نہیں آتا سینڈرا! تمہاری مما نے مجھے بتایا ہے کہ میرے جانے کے بعد تو تم نے جوگ سا لے لیا تھا اور اگر تم کسی سے محبت کرتیں تو شادی نہ کرچکی ہوتیں۔''

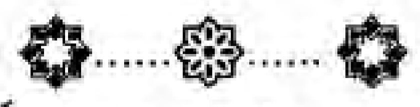
''تم مانو یا نہ مانو۔ تمہاری مرضی گزشتہ دس برسوں میں تم کبھی مجھ سے ملے نہ کوئی رابطہ رکھا۔ پھر تم کیسے جان سکتے ہو کہ میرے بارے میں تمہارے محسوسات کیا ہیں؟''

''ان محسوسات کا اظہار کرنا تو بہت مشکل ہے سینڈرا! بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ تم سے محبت رہی ہے۔ تم نے جب شادی کے لیے اصرار کیا تھا تو میں ڈر گیا تھا۔ اب تم گریز کررہی ہو تو میں تمہیں جیتنا تمہیں پانا چاہتا ہوں۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''اب میں اس کے محسوسات جان گئی تھی۔ اس نے مجھے حاصل کرنا گویا اپنی آن اور انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ میں نے کہا۔

''میں بہت تھکی ہوئی ہوں گیری! مجھے گھر پہنچا دو اور اب محبت یا شادی کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ یہ بتاؤ آج کل کرکیا رہے ہو؟''

گیری کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنے بارے میں بتانے لگا۔



اس رات جب میں اپنے پرانے کمرے میں سونے کے لیے لیٹی تو مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ میں سوچتی رہی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اپنا تجزیہ کیا تو دل کے ایک گوشے میں جیسن کو بھی جاگزیں پایا۔ گیری سے ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں اس سے صرف مرعوب ہی نہیں تھی بلکہ محبت بھی کرتی تھی۔ میرا دل اس بات کی گواہی اس لیے نہیں دیتا تھا کہ میں اس کی سیکریٹری اور وہ میرا باس تھا۔ دوسرے اس نے کبھی رومانٹک باتیں تو کجا میری طرف پیار کی نگاہوں سے بھی

نہیں دیکھا تھا۔ آج جب مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مجھے گیری سے محبت نہیں رہی بلکہ میں لاشعوری طور پر جیسن کو چاہتی رہی ہوں تو میں عجیب کشمکش و پنج میں پڑ گئی کہ آیا مجھے جیسن کو گیری کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں اور یہ بھی کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے، لیکن نہیں۔ میں اسے نہیں بتاؤں گی کہ وہ چور دروازے سے میرے دل میں داخل ہو چکا ہے۔

میرا اشتیاق اور بے صبری دیکھ کر گیری بھی ڈر گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسن بھی ڈر جائے اور ملازمت سے جواب دے دے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہ ہونے پائے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اس طرح میری ملازمت برقرار رہے گی اور میں اس کے قریب رہ سکوں گی۔

اس فیصلے کے بعد میں بھرپور اطمینان کے ساتھ گہری نیند سو گئی۔

دوسری صبح ہم سب ناشتے میں مصروف تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مما نے فون اٹینڈ کیا اور مجھے آواز دی۔ ''سینڈرا! یہ تمہارے لیے ہے تمہارا باس تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے جلدی سے جا کر مما کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور انتظار کرتی رہی کہ وہ جائیں تو دروازہ بھیڑ کر جیسن سے بات کروں۔

''شاید آپ کو ٹیلر کی فائل تلاش کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہو گی۔'' میں نے ماؤتھ پیس پر کہا۔ ''میں آنے سے پہلے اسی پر کام کر رہی تھی اور اسے الماری میں رکھنے کے بجائے میز پر رکھ کر چلی آئی۔''

مجھے جیسن کا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر بولا۔ ''آج اتوار ہے اور میں دفتر میں نہیں گھر سے بول رہا ہوں سینڈرا! میں نے یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ گیری سے ملاقات کا نتیجہ کیا رہا؟'' جیسن کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''گیری سے ملاقات کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا ہے کہ میرا یہ خیال یکسر غلط تھا کہ میں اب تک اس سے شدید محبت کرتی ہوں۔ مجھے اس سے بالکل محبت نہیں رہی۔''

''چلو اچھا ہوا کہ تمہیں ایک طویل عذاب سے نجات مل گئی۔ اب تم یقیناً کسی ایسے آدمی کا انتخاب کرو گی جو ہر طرح تمہارے لیے موزوں ہو اور محبت کے میزان میں بھی اس کا پلڑا ہلکا نہ نکلے۔''

''آپ کو تو بیرسٹر نہیں ماہر نفسیات ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہیں یقین ہے نا کہ اب تم گیری سے محبت نہیں کرتیں۔''

''ہاں'' ہاں صد فیصد یقین ہے باس۔'' میں نے جواب دیا۔

''بس میں یہی جاننا چاہتا تھا اب چھٹیاں انجوائے کرو۔''

''کوشش کروں گی۔'' میں نے بے ساختہ کہا کیونکہ میرا جی چاہتا تھا کہ فوراً واپس چلی جاؤں اور اس کے قریب رہوں۔

اسی شام ہم سب رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈیڈی نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ 'نجانے کون آیا ہے مگر ڈیلر کار میں آیا ہے۔''

یہ سنتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

''جیسن آیا ہے ڈیڈی! ڈیلر اسی کے پاس ہے۔'' یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف دوڑی۔

''صبر سے کام لو اتنے اشتیاق سے کام نہ لو۔ وہ چہرے پڑھنا جانتا ہے۔'' دماغ نے سرگوشی کی۔

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی'' میں نے دلیل دی اور اتنے میں دروازے پر پہنچ گئی۔ میری حالت اس بچے جیسی تھی جسے مٹھائی کی دکان پر چھوڑ دیا گیا ہو جو چاہے اور جتنی چاہے مٹھائی کھا لے۔

میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے جیسن کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔'' میں نے دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم قیاس نہیں کر سکتیں!'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اب میں خود بھی اعتراف کر سکتا ہوں میں دو روز سے تمہیں دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ آج فون پر تم سے بات کرنے کے بعد دل کا تقاضا نہ ٹال سکا تو چلا آیا اور دل ایسا تقاضا کیوں کرتا ہے یہ تو تم جانتی ہی ہو۔''

''اوہ جیسن! میرا خیال ہے کہ میں بھی کئی سالوں سے تم سے محبت کرتی ہوں۔'' میں نے بے ساختہ اعتراف کیا۔

''لیکن اس دوران بھی تم گیری کے خواب دیکھتی رہیں۔ اس لیے میں پس پردہ دبکا رہا۔ یہ میرا امتحان تھا اور گیری سے ملنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا تمہارا امتحان تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں سینڈرا!''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی مما نے پکارا۔ ''کیا تم مسٹر جیسن میرڈتھ سے ساری باتیں دروازے پر کھڑے کھڑے ہی کرو گی انہیں اندر لے آؤ نا؟''

''میں انہیں کھانا کھلانے جا رہی ہوں مما واپسی پر کافی یہیں پئیں گے۔'' میں نے جواب دیا اور جیسن کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

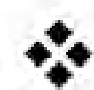
ہم کسی ریسٹوران کے بجائے کرلی ہلز کی چوٹی پر چھتنار درختوں کے جھنڈ میں آ بیٹھے۔ ہر طرف پھیلی خاموشی میں صرف درختوں سے گزرتی ہوا کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اندھیرا ابھی خاصا اتر آیا تھا اور آسمان پر ستارے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی جیسن نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم لندن میں دلہن بننا چاہتی ہو یا یہاں یارک شائر میں میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ یارک شائر کو ترجیح دیں گی۔''

''شادی ہماری ہو گی' ان کی نہیں۔'' میں نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میری والدہ کی خوشی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بالآخر میں نے بھی نارمل زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تمہارے گھر والوں کو یہ اعتراض تو نہیں ہو گا کہ میں بوڑھا ہونے والا ہوں۔'' جیسن مسکرایا۔ ''میری عمر اڑتیس برس کی ہے تم سے دس سال بڑا ہوں میں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم دونوں دیر سے کھلنے والے پھولوں کی طرح ہیں......!''

اس سے آگے جیسن نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت نہ دی اور اپنے بازوؤں پر اٹھا کر پہاڑی سے اترنے لگا تا کہ ہم گھر جا کر شادی کی تاریخ طے کر سکیں۔



ترجمان

احمد ضعیر صدیقی

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم
ایک ایسے ہی نوجوان کا قضیہ' وہ یار کی زبان نہ جاننے کے سبب اپنے محبوب کے دیس میں مصیبت کا شکار ہو گیا تھا۔

تاک جھانک پسند قارئین کے لیے بطور خاص ایک دلچسپ کہانی

وہاں ایک قتل ہو رہا تھا۔

پہاڑی کے اس تودے سے' جہاں وہ موجود تھا' نیچے کی جانب برٹین نامی وادی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اور اب اس کی نگاہیں ایک قتل ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

پہلے پہل وہ بات کو ٹھیک طرح سمجھا ہی نہیں۔ سمجھتا بھی کیسے۔ اس نے تو صرف ایک مرد اور ایک عورت کو سیاہ دیہاتی لباس میں ملبوس' اس راستے پر بڑھتے دیکھا جو اوپر کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے کوئی خصوصی توجہ بھی نہیں دی تھی۔

پال سلاٹر' اپنی ہفتہ بھر کی سرسری سیر سے واپس ہو رہا تھا اور یہ سیاحت خاصی سود مند ثابت ہوئی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ دوسرے دن اپنی خوب صورت فرانسیسی بیوی برٹینا کے ساتھ ہوگا اور اسے بتا رہا ہوگا کہ کس طرح فرانسیسی زبان جانے بغیر اس نے پورا ایک ہفتہ سیر و سیاحت کرتے گزارا' کیونکہ جب وہ جا رہا تھا تو وہ بے حد متردد تھی۔

"تم کھاؤ گے کس طرح؟" اس نے پوچھا تھا۔

"یہ آسان سی بات ہے' مرغی کھانا چاہوں گا تو اپنے دونوں بازو پروں کی مانند ہلا کر ویٹر کو سمجھا دوں گا۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

"اور اگر تمہیں آملیٹ کھانا ہوگا تو کیا کرو گے؟" اس کے سوالات' اس کا تردد ظاہر کر رہے تھے جن کے باعث وہ کچھ اور اچھی لگنے لگی تھی۔

"مجھے واقعی تمہاری طرف سے فکر رہے گی تمہیں فرانسیسی آتی نہیں اور تمہارے ساتھ کسی قسم کا واقعہ بھی ہو سکتا ہے' کہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں۔"

"اوہ نو......؟" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ہفتے بھر کی تو بات ہے پھر تمہارے والدین چاہتے ہیں کہ تم ہفتہ بھر ان کے ساتھ گزارو۔" اس نے تمکنت میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخت سفر باندھ لیا تھا۔

پال سلاٹر کافی عرصے سے نیویارک کی اشتہاری فرم کے ساتھ کمرشل آرٹسٹ کی حیثیت سے منسلک تھا اور خواہاں تھا کہ کچھ سنجیدہ کام بھی کرے۔ یہ ٹرپ اسی مقصد کے ضمن میں تھا۔ وہ اس وقت ادھر ایک چھوٹی سی زرد رنگ کی کار میں آیا تھا' روڈ کے اوپر سے نیچے پھیلی وادی اسے بھلی لگی' پھر اس نے کار ایک جانب کھڑی کر دی تھی اور اپنے اسکیچ پیڈ کو بغل میں دبا کر بڑے خوشگوار موڈ میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ پہلے وہ قریب پھیلے کھیتوں میں گھسا پھر ان سے گزر کر وہ ادھر آ گیا تھا۔

اس نے اپنے سامنے پھیلی وادی کو غور سے دیکھا تھا۔ یہاں ایک نرم رو جھرنا بھی بہہ رہا تھا۔ پھر وادی کے دوسرے مناظر سے ہٹ کر اس کی نظروں نے دو افراد کو دیکھا جو راستے بھر دکھائی دیئے تھے اور اب اسے اچانک احساس ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

وہ بھاری بھرکم اور لمبے قد کا آدمی تھا' عورت خوف زدہ سی تھی اور اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر مدافعتی انداز میں کچھ بول رہی تھی۔ آدمی جب بھی اس کی سمت بڑھتا وہ غنچہ دے کر بچ نکلتی اور پھر ایک بار مرد نے اسے دبوچ ہی لیا۔ وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی لیکن آدمی نے اسے گھسیٹنا شروع کر دیا۔

پال کو اندازہ ہو رہا تھا کہ مرد اسے چوٹی پر لے جا کر نیچے گرا دینا چاہتا ہے' وہ بہر حال مدد کرنے سے قاصر تھا۔ کوئی اور تدبیر نہ دیکھ کر زور سے چیخا۔

اس کی پکار ضائع گئی۔ ہو سکتا ہے ان دونوں نے اپنے چکر میں سنا ہی نہ ہو یا پھر جھرنے کی گونج نے ان تک آواز نہیں پہنچنے دی تھی۔ اس مرد نے عورت کو کاندھے پر لاد لیا اور عورت مسلسل مچل رہی تھی۔ تبھی عورت کی ایک لات مرد کے پیٹ پر لگی اور اس نے عورت کو زمین پر پٹخ دیا۔ پھر اس سے قبل کہ عورت اٹھتی مرد نے اپنی پیٹی سے کوئی شے نکالی اور اس نے عورت کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ عورت کا مچلتا بدن ایک دم ساکت ہو گیا۔

پال سلاٹر کو اپنے اعصاب جھنجناتے محسوس ہوئے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خوف ناک خواب دیکھ رہا ہو۔ اس نے آدمی کو اپنے چہرے کی خراشوں سے خون صاف کرتے دیکھا جو عورت نے جدوجہد کے دوران لگائی تھیں۔ آدمی نے عورت کی ساکت لاش کو دوبارہ اٹھا لیا اور چٹان کی سمت چل پڑا۔

یہ غالباً اسے چٹان کے ادھر پھینکنا چاہتا ہے۔ پال نے سوچا کہہ دے گا کہ مر گئی' لیکن میں سمجھتا ہوں شاید اس نے مجھے سارا منظر دیکھتے دیکھ لیا ہے۔

دیہاتی چند لمحوں تک چلتا رہا پھر رک کر اس نے ادھر دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں پال پر رک گئیں۔ اس نے لاش کو وہیں رکھ دیا اور پال کی سمت گھورنے لگا۔

آدمی خاصا لمبا اور تنومند تھا۔ پھر اس کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ویسے یہ اچھی بات تھی کہ وہ کوئی سو گز کی دوری پر نیچے تھا۔ پھر بھی اس کے سامنے کا راستہ خاصا ہموار تھا اور اوپر جلد ہی پہنچ سکتا تھا اس جگہ جہاں پال سلاٹر کی زرد کار کھڑی تھی' پھر سلاٹر نے طے کیا کہ وہ گھوم کر اپنی کار تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

یہاں سے سلاٹر کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ دیہاتی کے چہرے کے تاثرات سمجھ سکتا۔ خود دیہاتی بھی اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کپڑوں کے یا اس کے قد کی لمبائی اور دبلے پن کے۔ سلاٹر نے محسوس کیا کہ اس کے گھورنے کا انداز غیر دوستانہ ہے۔

مجھے کسی سے مدد لینی چاہیے تاکہ اسے گرفتار کرایا جا سکے۔ پال سلاٹر نے سوچا پھر یہ غالباً مجھے بھی مارنا چاہتا ہے۔ لہٰذا مجھے یہ کام جلدی کرنا ہوگا۔ اسے یہاں کے راستوں کا بھی علم ہے اور مجھے چالاک بھی لگتا ہے۔ جب کہ میں بقول برٹینا یہاں ایک اجنبی ہوں اور یہاں کی زبان تک سے بھی ناواقف ہوں یہ خاصی پریشانی والی بات ہے۔

پھر دونوں ایک ساتھ بھاگنے لگے۔ سلاٹر کی سمجھ میں آ چکا تھا کہ وہ کار تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر پہنچ بھی جائے تو اس آدمی سے الجھنا ہوگا جبکہ مقابلہ برابر کا نہ تھا۔ آدمی کو ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ سلاٹر کو زبان نہیں آتی تھی مگر یہ بات اسے ابھی معلوم نہ تھی۔

ہائی وے پر پہنچ کر سلاٹر نے پہاڑی کے نشیب میں دوڑنا شروع کر دیا۔ پھر جو پہلا مکان اسے دکھائی دیا وہ اس میں گھس گیا۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی اور زبان اسے آتی نہ تھی۔

یہ مکان دو منزلہ تھا۔ پتھر کا بنا ہوا۔ غالباً کسی کھاتے پیتے کسان کا تھا۔ سلاٹر نے گیٹ کھولا اور اندر چلا گیا۔ جہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا یہاں سے اس نے مڑ کر دیکھا، اور چونک گیا اس کی زرد گاڑی نیچے کی سمت چلی آ رہی تھی۔

اس نے صدر دروازے کو دبایا۔ وہ کھلا ہوا تھا، اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ تبھی اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ آواز اوپری منزل سے آ رہی تھی۔

''ہیلو......'' اس نے پکارا ''کوئی ہے؟'' اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

سنٹرل راہداری سے ہٹ کر وہ جس کمرے میں داخل ہوا وہاں ایک لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی او ر درمیان میں میز تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا، باہر دیہاتی کار روک کر اتر رہا تھا سلاٹر جلدی سے کچن کی سمت لپکا تاکہ عقبی دروازے پر پہنچ سکے۔ یہ دروازہ مقفل تھا۔ مڑ کر وہ اوپری منزل کی سمت لپکا۔ اوپری منزل کی کھڑکی سے اس نے باہر جھانکا۔ دیہاتی اب باغیچہ میں رکا ہوا تھا۔ انداز سے پتا چلتا تھا جیسے یہ گھر اسی کا ہو۔ اسے کوئی پتا نہ تھا کہ سلاٹر اندر پھنس چکا ہے۔

بچہ ایک بار پھر رویا۔ سلاٹر نے دیکھا کہ وہ پالنے میں پڑا ہوا ہے۔ اس نے سوچا یہ ایک فرانسیسی بچہ ہے اس سے انگریزی میں بولنا فضول ہوگا۔ وہ ویسے بھی کوئی آواز پیدا کر کے اپنے لیے خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

بچے نے پھر مسلسل رونا شروع کر دیا۔ سلاٹر کو خوف آنے لگا۔ بچے کو چپ کرانا ضروری تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا بچے کے کپڑے ایک جانب رکھے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک کپڑا اٹھایا اور بچے پر جھک گیا۔ خوش قسمتی سے اسے بچوں کو کپڑے پہنانے کا طریقہ آتا تھا۔ کیونکہ ماضی میں اس کی ایک بہن نے اسے سکھایا تھا۔ اس نے لباس کو تین حصوں میں موڑا۔ گندے کپڑے کو بچے کے نیچے سے نکال کر اس نے صاف کپڑے کو اس کی جگہ پہنچا کر ماہرانہ انداز سے پن سے پھنسا دیا۔ بچہ چپ ہو گیا۔ وہ ابھی مشکل سے سیدھا ہوا تھا کہ اس نے دروازے میں بھاری بھرکم دیہاتی کے ہیولے کو دیکھا۔ اب اس نے لکڑی کی کھڑاؤں کے بجائے سلیپر پہن رکھے تھے۔

سلاٹر اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس نے گھبرائی نظروں سے آدمی کے گول سرخ چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خراشوں کے نشانات موجود تھے۔ اس کی نظریں سلاٹر پر مرکوز تھیں۔ وہ مطمئن نظر آ رہا تھا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ دیہاتی کا ہر قدم سلاٹر کے اقدامات سے بہتر تھا۔ شاید یہ قریبی مکان اسی کا ہے۔ پھر آس پاس دوسرے مکانات نہ تھے۔ اور وہ آسانی سے سلاٹر سے نپٹ سکتا تھا۔

سلاٹر چاہتا تو خطرہ مول لے کر کھڑکی سے چھلانگ لگا سکتا تھا لیکن اس میں اس کی ٹانگ ٹوٹ سکتی تھی۔ رکے رہنے میں بھی کوئی بھلائی موجود نہ تھی۔

اس نے دیکھا کہ دیہاتی فی الحال دروازے پر جما ہوا ہے۔

بچہ اس دوران شاید سو گیا تھا۔ سلاٹر نے کمرے میں کسی عورت کے کپڑے بھی دیکھے۔ غالباً وہ کپڑے پہن رہی تھی۔ جس وقت اس کے شوہر نے اسے پکڑنے کی سعی کی ہوگی۔

اسے حیرت تھی آخر یہ آدمی ہلتا کیوں نہیں۔ وہ آہستہ سے کھڑکی کی سمت کھسکا۔ دیہاتی بھی آہستہ سے بڑھا، ساتھ ساتھ اس نے ایک دھمکی آمیز حرکت کی۔

سلاٹر کو سخت پریشانی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی بیوی کی یاد آئی۔ مردہ عورت کا خیال آیا، وقت بہت سستی سے گزر رہا تھا۔

باہر کسی کار کے گزرنے کی آواز آئی پھر کوئی سائیکل گھنٹی بجاتی گزری۔ سلاٹر نے پھر حرکت کی اور دیہاتی نے بھی دروازے کو چھوڑ دیا۔ لگتا تھا جیسے وہ موقع دے رہا ہو کہ سلاٹر بھاگ جائے مگر کیوں؟ سلاٹر نے سوچا، لیکن اب سوچنے کا وقت نہ تھا۔ سلاٹر نے دروازے کی سمت چھلانگ لگائی۔ فرش پر زور سے گرا اور پھر بڑی تیزی سے اٹھ کر بھاگا۔ اس نے عجلت کے ساتھ سیڑھیاں طے کیں۔

نیچے اس کی کار موجود تھی۔ اس نے کار میں گھس کر اسے جلدی سے اسٹارٹ کیا۔ اس لمحے اسے حیرانی بھی ہوئی کیونکہ دیہاتی نے اس کے تعاقب کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اسے امید نہ تھی کہ اس جیسا چالاک آدمی قتل کے عینی شاہد کو نکل جانے دے گا۔ اس عنایت کا جواب اسے آدھ میل آگے جا کر ملا جب اس نے پلٹ کر عقبی حصے میں دیکھا جہاں کار کے اندر مردہ عورت کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ گویا دیہاتی نے عمدگی سے قتل کا الزام اس پر منتقل کر دیا۔ وہیں آلہ قتل بھی پڑا ہوا تھا۔

سلاٹر نے اسے چھوئے بغیر دیکھا۔ دیہاتی کی اسکیم عمدہ تھی۔ ایک اجنبی گھر میں گھستا ہے جہاں صرف ایک عورت اور اس کے بچے کے سوا کوئی نہیں۔ کار کو بھی وہاں دیکھا جاتا ہے۔ اجنبی عورت پر حملہ کرتا ہے اور اسے مار ڈالتا ہے۔

اس اسکیم کے جواب میں سلاٹر کے پاس کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں سوائے اس کے اپنے الفاظ کے۔ پھر وہ اچھی طرح اپنا مافی الضمیر بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے زبان نہیں آتی تھی۔ اب اس کے سامنے گویا جیل کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ کل تک جیل پہنچ سکتا تھا یعنی اس دن جس روز بریٹنا کو ساڑھے چار بجے والی ٹرین سے مینٹنی پہنچنا تھا۔ جب وہ اسٹیشن نہیں پہنچے گا تو یقیناً وہ بے چاری متوحش ہو جائے گی۔

سلاٹر واقعی مشکل میں تھا۔ اس کے پاس کوئی گواہ نہ تھا۔ پولیس کے پاس ایسے میں جانا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ پھر وہ کیا کرے۔ اب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ چالاک دیہاتی کے دوسرے قدم کا انتظار کرے، لیکن پھر بھی اس کے سامنے کوئی راہ نجات نہ تھی۔ وہ بریٹنا کے سامنے شرمندہ بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے فرانسیسی نہ جاننے کے باوجود اپنی حفاظت کے ضمن میں کافی بڑہانکی تھی۔

اس نے اسٹیئرنگ وہیل کو تھپتھپاتے ہوئے سوچا۔ ''حقائق اپنی جگہ ہیں اور وہ یوں ہیں کہ ایک تنومند دیہاتی اپنے عمدہ گھر میں رہتا ہے ظاہر ہے کہ وہ دولتمند ہے ہو سکتا ہے اس نے عورت سے رقم کے لیے شادی کی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے ذہن میں کوئی اور عورت بھی ہو پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے درمیان سے ہٹا دے۔ میرا پولیس کے پاس جانا بھی مناسب نہیں۔ مجھے کسی دوست کی ضرورت ہے۔ اس نے کار پھر اسٹارٹ کر دی اور لیتین شہر کی سمت چل دیا جہاں اس کی بیوی بریٹنا پہنچنے والی تھی۔

ایک جگہ اس نے راستے میں ایسے کھیت دیکھے جن کے ارد گرد متعدد جھاڑیوں نے کافی زمین گھیر رکھی تھی۔ اس نے اپنی کار اسی کے اندر چھپا دی۔ اس نے اپنے بیگ سے استعمال کی اشیاء لیں اور پیدل چل دیا۔

وہ شہر میں ساڑھے چار بجے پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر جا کر اس نے گاڑی کا انتظار کیا۔ گاڑی آنے کے بعد وہ واپس شہر کی سمت چل دیا۔ یہ حرکت اس نے

صرف اس لیے کی تھی تاکہ بتا سکے کہ وہ گاڑی سے یہاں آیا ہے۔ شہر میں اس نے ایک چھوٹے ہوٹل میں رات کے لیے کمرہ لے لیا۔

اتفاق سے ہوٹل والا کچھ انگریزی سمجھ لیتا تھا۔ اس کی مدد سے اس نے اپنے لیے ایک ایسے آدمی کی مدد مانگی جسے انگریزی آتی ہو تاکہ وہ اسے اپنے انٹر پریٹر کی طرح استعمال کر سکے۔ آدھے گھنٹے بعد اس کا مطلوبہ آدمی آ پہنچا۔ یہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس نے اپنا نام ہیون بتایا۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھا۔ سلاٹر نے اس سے مصافحہ کیا اور کہا کہ اسے کمپنی کی ضرورت ہے۔ اور وہ اس کی مدد سے فرانسیسی زندگی کے بارے میں جاننے کا خواہاں ہے۔ اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ان دنوں اسکول کی چھٹیاں تھیں۔

کھانے کے دوران اسکول ٹیچر ہیون نے اس کے استفسار پر مطلع کیا کہ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے دراصل درمیان میں محبوبہ کے ماں باپ حارج ہو رہے تھے۔

"اس کا باپ ایک جج ہے۔ وہ خاصا بااثر ہے۔" ہیون نے بتایا' کھانے کے دوران سلاٹر نے نوٹ کیا کہ دوسری میزوں پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ بالآخر ہیون نے مدد کی اور گفتگو کو سننے کے بعد اس نے سلاٹر سے کہا۔

"یہاں قریب ہی کوئی قتل ہوا ہے۔ وہ کلاؤ فیرو کی بیوی تھی۔ لاش میدان میں پڑی ملی ہے۔ کسی نے اس کا سر کچل دیا ہے۔ کسی زرد کار کا تذکرہ بھی ہو رہا ہے۔"

"یہ فیرو کون ہے؟"

"ایک کسان ہے۔ اس نے اپنے علاقے کے زمیندار کی لڑکی سے شادی کی۔ عورت خاصی بدصورت تھی تاہم مالدار تھی۔ وہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ اس کے گھر ایک بچہ بھی ہے۔"

"اور یہ زرد کار؟"

"لوگوں کے بیان کے مطابق کار پیرس کے نمبر والی ہے۔ اس میں ایک لانبا دبلا آدمی تھا۔ پولیس جلد پتا چلا لے گی۔"

"کیا فیرو دوسری شادی کرے گا۔"

"پتا نہیں' ہوسکتا ہے کر لے۔"

"مگر بچے کا کیا ہوگا؟" سلاٹر نے پوچھا۔

"فیرو کا خاندان موجود ہے۔ کوئی نہ کوئی رکھ ہی لے گا۔"

"ذرا اس معاملے کے بارے میں مزید معلومات کر کے مجھے صبح بتانا۔" اس نے اسکول ٹیچر سے کہا۔ میں اس میں دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔"

دوسری صبح ہیون اطلاعات کے ساتھ وارد ہوا۔ اس نے بتایا پولیس نے فیرو سے سوالات کیے ہیں۔ فیرو نے انہیں بتایا ہے کہ کل وہ کھیتوں میں تھا۔ وادی سے ذرا پرے ایک بیل نے اسے زخمی کر دیا اور وہ اسی کے ساتھ مصروف تھا۔ گھر واپس آ کر اسے پتا چلا کہ بیوی موجود نہیں ہے۔ پھر وہ اسے ڈھونڈنے نکلا اور بالآخر وہ اسے ایک جگہ پڑی مل گئی۔ اس کے گھر پر باغ میں کسی کے قدموں کے نشانات بھی ملے ہیں یہ جوتوں کے نشانات ہیں جبکہ فیرو جوتے نہیں پہنتا۔ ان کا خیال ہے کہ قاتل کو عورت اکیلی ملی ہوگی۔ اس نے عورت پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی ہوگی اور عورت بھاگ نکلی ہوگی۔ پھر غالباً قاتل اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے سر پر کسی لوہے سے ضرب لگائی گئی تھی۔

بہرحال آلہ قتل ملا ہے نہ اجنبی کا کوئی پتا ہے۔ کار بھی غائب ہے تاہم اسے کئی لوگوں نے فیرو کے گھر کے سامنے دیکھا تھا۔ فیرو کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے۔"

"لیکن پولیس تو غلطی بھی کر سکتی ہے۔" سلاٹر نے کہا۔ "ہوسکتا ہے فیرو نے دوسری عورت کے لیے یہ حرکت کی ہو۔"

"ہوسکتا ہے۔ رقم بذات خود ایک مصیبت ہے۔"

"تمہارے خیال میں فیرو کیسا آدمی ہے۔ وہ قتل کر سکتا ہے۔"

"فیرو؟ جی نہیں۔" اسکول ماسٹر نے کہا۔ "یہ حرکت اجنبی کی ہے۔"

"یہ فیرو اب کہاں ہوگا؟"

"کیفے ڈیلا ایلیس میں۔" ہیون نے سرد مہری سے کہا۔ "وہ گھر جانے ہی والا ہے۔"

"ٹھیک ہے" سلاٹر نے کہا۔ "ہم دونوں روڈ تک چلتے ہیں۔ گھر واپس جاتے وقت ہم اس سے ملیں گے۔"

"کون سی روڈ؟"

"تمہی بتاؤ۔"

ہیون نے نقشہ نکال کر ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کے انداز سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے وہ سلاٹر کے ساتھ جانا نہ چاہتا ہو۔ بہرحال اس کے اصرار پر ہیون تیار ہوگیا۔

ہائی وے پر ٹریفک کم تھا۔ صرف چند ہی گاڑیاں انہیں جاتی دکھائی دیں۔ جب سلاٹر اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کار چھپائی تھی تو وہ رک گیا۔

"ذرا یہاں رکتے ہیں۔" سلاٹر نے کہا۔ "تم یقیناً سوچ رہے ہوگے کہ میں اس معاملے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہوں۔" سلاٹر نے ایک جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

ہیون نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

سلاٹر نے بات کو سمجھتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "بے شک تمہیں مجھ پر شبہ ہو رہا ہوگا۔ لہٰذا میں تمہیں ساری بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ تم یقین کرو میں نے فیرو کو اپنی بیوی کی جان لیتے دیکھا ہے مگر مسئلہ ثبوت کا ہے۔ اس معاملے میں صرف فیرو ہی میری مدد کر سکتا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" ہیون نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میں درست کہہ رہا ہوں۔" سلاٹر نے اطمینان سے کہا۔ "مجرم اکثر خود کو پھنسواتے ہیں۔ میں بھی یہی بات کہہ رہا ہوں۔ فیرو خود کو ضرور پھنسوائے گا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔"

"موسیو" ہیون نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہتر ہوگا تم خود کو پولیس کے حوالے کر دو اور میرے ساتھ چلو تاکہ میری محبوبہ کا جج باپ میری بہادری کا قائل ہو جائے۔"

عجیب ہی احمق آدمی ہے۔ یہ اسکول ٹیچر' جھلا کر سلاٹر نے کہا۔

"تم اپنی مدد آپ کرنا سیکھو۔"

ہیون نے نروس ہو کر منہ گھما لیا۔

بالآخر انہیں وہ سیاہ کار دکھائی دی' جس میں فیرو موجود تھا۔ سلاٹر کو دیکھ کر اس نے گاڑی روک لی اور فرنچ میں کچھ کہنے لگا۔ پھر وہ گاڑی سے اتر کر سلاٹر کی طرف بڑھا۔

ہیون نے اس سے کچھ کہا مگر وہ خاصے خراب موڈ میں تھا۔

اس نے بڑھ کر سلاٹر کو گلے سے پکڑ لیا۔ سلاٹر نے چیخ کر ہیون سے کہا کہ وہ دوڑ کر پولیس کو اطلاع دے۔

اس عرصے میں فیرو اسے بھینچ چکا تھا۔ نیچے سے سلاٹر نے اسے ایک مکا رسید کیا تو اس نے گرفت چھوڑ دی تاہم اس نے بھی وار کیا اور دو ایک ہاتھ جھاڑ دیئے۔ اسی لمحے قریب سے ایک ٹرک گزرا۔ اور چند

آدمیوں نے اتر کر سلاٹر کو چھڑا لیا۔

☆☆☆......

سلاٹر پر سوال و جواب کی بوچھاڑ ایک ایسے کمرے میں ہوئی جس میں صرف چند میزیں اور کرسیاں تھیں۔ یہ کمرہ گندا سا تھا کوئی چھ عدد پولیس والے اسے گھیرے ہوئے تھے ایک لمبی ناک اور سیاہ مونچھوں والا چیف سوالات پوچھ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ سلاٹر کو مجرم سمجھ رہا ہے۔ میز کے دوسرے سرے پر فیرو بیٹھا ہوا تھا اور ہیون درمیان میں ترجمان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

سلاٹر نے انہیں ساری داستان سنائی اور مضبوط دلائل بھی دیئے۔ اس نے انہیں کار کی جگہ بھی بتادی اور وجہ بھی بتادی۔ اس نے آلۂ قتل کے بارے میں بتایا کہ وہ کار میں ہے لیکن اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں۔

''چیف کو بتاؤ۔'' سلاٹر نے ہیون سے کہا۔ ''کہ فیرو کے چہرے پر جو خراشیں ہیں وہ اس کی بیوی نے لگائی تھیں۔''

ہیون نے مشینی انداز میں یہ بات دہرادی پھر جواب سن کر اس نے کہا۔ ''عورت نہیں بلکہ یہ خراشیں ایک بیل کے ساتھ بھاگ دوڑ میں لگی ہیں۔''

''یہ غلط ہے'' سلاٹر نے کہا۔ ''چیف سے کہو کہ وہ ان کا معائنہ محدب شیشے سے کرے۔'' تاہم ہیون یونہی بیٹھا رہا۔ وہ شاید وہاں رکتا بھی نہیں اگر اسے امید نہ ہوتی کہ اس کا ہونے والا سسر جج شاید اس طرح مہربان ہو سکے۔ چیف مسلسل کینہ توز نظروں سے سلاٹر کو گھور رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی فرنچ میں ہیون سے کچھ کہا جس کا ترجمہ اسے یوں بتایا گیا۔

''چیف پوچھ رہا ہے کہ تم گھر میں گھس کر اوپری منزل میں کیوں گئے تھے۔ وہاں تم نے کیا کیا تھا؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا بچہ رو رہا تھا' میں نے اس کا بھیگا لباس بدلا تھا۔'' ہیون نے چیف کو بتایا تو وہ خون خوار انداز میں مسکرایا۔ پھر اس نے کوئی حکم دیا۔

سلاٹر نے پھر کہا۔ ''ہیون چیف سے کہو کہ بیل والی کہانی جھوٹی ہے۔ گھر میں افراتفری بھی خود اسی نے پیدا کی ہے۔ یہی میری کار لے کر اپنے گھر تک آیا تھا۔ چیف سے کہو کہ وہ اس سلسلے میں تحقیقات کرے۔''

ہیون نے کچھ نہیں کہا۔

جھلا کر سلاٹر نے پھر کہا۔ ''چیف کو بتاؤ کہ وہ کسی ڈاکٹر سے مل کر پتا کرے کہ یہ خراشیں کیسی ہیں؟''

اسی وقت دروازہ کھلا اور عورت ایک بچے کے ساتھ اندر آ گئی۔

گویا چیف بالکل ہی گدھا نہ تھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سلاٹر کو واقعی بچے کو لباس پہنانا آتا ہے یا نہیں۔ سلاٹر نے اس کا مظاہرہ بھی کیا مگر بچے کی ماں نے احتجاج کیا۔ وہ اس کے طریقے سے متفق نہ تھی تاہم سلاٹر مطمئن تھا کیونکہ پولیس بچے کو دیکھ چکی تھی۔

اسی لمحے چیف نے کچھ کہا اور ہیون نے اسے بتایا۔ ''چیف پوچھ رہا ہے تم کیسے مجرم ہو کہ بچوں کے پوتڑے درست کر رہے تھے۔ کیا اسی طرح تم سکون کے ساتھ عورت سے نپٹنا چاہتے تھے؟''

''اس کا دماغ خراب ہے۔'' غصے سے پاگل ہوتے ہوئے سلاٹر نے کہا۔ ''آخر یہ حقائق کو پرکھتا کیوں نہیں۔ اسے بتاؤ میری بیوی آنے والی ہے اور مجھے اسے لینے اسٹیشن جانا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ ایک اہم بات اور ہے۔''

سلاٹر نے بے چینی سے ہیون کی سمت دیکھا۔ اس نے اب تک اپنی بہترین کوشش کی تھی کہ شبے کو دور کر سکے تاہم ابھی اس کے پاس ایک بڑا چبھتا ہوا سوال موجود تھا اسے امید تھی کہ دیہاتی فیرو اس کا

جواب نہیں دے سکے گا۔ وہ اس سوال کو اپنی بیوی کی آمد سے پہلے ہی کرنا چاہتا تھا۔

''سنو...'' سلاٹر نے کہا۔ ''فیرو نے یہی کہا ہے نا کہ جس وقت اس کی بیوی کا قتل ہوا وہ کسی بیل کے پیچھے تھا۔ گویا وہ بتا رہا تھا کہ واردات کے وقت وہ اس جگہ سے کہیں دور تھا۔ ذرا یہ بات اس سے صاف کراؤ۔''

ہیون نے چیف کو بتایا اور چیف سنتا رہا۔ پھر سلاٹر نے دوبارہ کہا۔ ''ٹھیک ہے اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ فیرو کس طرح اپنے جرم کو ثابت کرتا ہے۔ اس سے پوچھو آخر اس نے کچھ دیر قبل مجھے کس طرح پہچانا جبکہ اس نے کل سرے سے مجھے دیکھا ہی نہ تھا؟''

سلاٹر کو امید تھی اب فیرو ضرور الجھ جائے گا۔ اس نے ہیون سے کہا۔ ''اسی لیے تمہیں لے گیا تھا تا کہ تم گواہ رہو۔'' ہیون نے گھبرا کر ہونٹوں پر زبان پھیری اور جلدی سے بولا۔

''اسے تو میں نے بتایا تھا کہ تم کون ہو۔ جب اس نے کار روکی تھی تبھی میں نے اسے بتادیا تھا۔ تمہیں فرانسیسی آتی ہوتی تو تم یہ سوال نہ کرتے۔''

سلاٹر بدحواس ہو کر رہ گیا۔ یہ اس کا آخری وار تھا جو اس احمق اسکول ٹیچر نے ضائع کرا دیا تھا۔

اب صرف برٹینا کا ہی سہارا رہ گیا تھا۔ پژمردہ انداز میں اس نے کہا۔ ''کسی کو اسٹیشن بھیج دو تا کہ وہ میری بیوی کو یہاں لے آئے۔''

''چیف اس کا حلیہ پوچھ رہا ہے۔'' ہیون نے کہا۔

''اس سے کہو کہ سارے اسٹیشن پر سب سے خوب صورت عورت وہی ہوگی۔ اور ذرا جلدی کرو۔ وہ بھناتے ہوئے بولا۔

جلدی ہی چیف کے حکم پر سپاہی کمرے سے نکل گیا۔ آئندہ پندرہ منٹ کمرے میں سناٹا رہا۔ سلاٹر احمق پولیس چیف کی کم عقلی پر ماتم کرتا رہا اور اس منحوس گھڑی کو کوستا رہا جب وہ تنہا سفر پر نکلا تھا۔ اسے یہ بھی فکر تھی کہ دیکھیں برٹینا کچھ کر بھی سکتی ہے۔

بالآخر انتظار ختم ہوا۔ دروازہ کھلا اور اس نے برٹینا کو اندر آتے دیکھا۔ وہ خاصی پریشان تھی۔

''کیا ہوا؟ آتے ہی اس نے پوچھا۔ آخر ہوا کیا؟''

جھنجلائے انداز میں اس نے کہا۔ ''اس کوڑھ مغز آفیسر کو بتاؤ کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔''

پھر وہ تقریباً پانچ منٹ تک چیف سے باتیں کرتی رہی اور پھر چیف نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ اس نے تھوڑا سا خم ہو کر برٹینا سے کچھ کہا اور برٹینا یک بیک کھل اٹھی۔

''پال۔'' وہ مطمئن انداز میں بولی۔ ''تمہیں صرف ایک بیان لکھنا ہوگا اور بس اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔''

متعجب ہو کر اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ''برٹی کمال ہے تم نے کون سا جادو پھونکا ہے اس پر؟ میں اتنی دیر سے سیکڑوں دلائل کے ذریعے اسے قائل کرتا رہا تھا مگر اس کی کھوپڑی میں کچھ بھی نہیں آیا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ وہ تمہاری دو منٹ کی بات سے مطمئن ہو گیا ہے۔ میں بھی تو سنوں کیا کہا تھا تم نے؟''

''میں نے کچھ نہیں کہا۔'' برٹینا نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ ''میں تو صرف اسے سمجھا رہی تھی یہ بات تو اس نے خود کہی تھی کہ بھلا میری جیسی خوب صورت بیوی کے شوہر کو کیا ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ایک بدصورت دیہاتی عورت پر مجرمانہ حملہ کرے اور اسے قتل کرے۔''

❁

قسط نمبر 7

بازی گر

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں، حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت‘ اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا لیکن اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ و دلکش سلسلے وار کہانی

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ میرے بائیں بازو میں اترنے والا جہنمی انگارہ درحقیقت ایک بے آواز فائر کا نتیجہ تھا۔ کسی نے میرے عقب سے سائیلنسر لگی گن سے گولی چلائی تھی جو میرے بازو میں آ کر لگی تھی اور میں لڑکھڑا کراوندھے منہ زمین پر گرا تھا۔ یہ زمین بھی کار پورچ کا پختہ فرش تھا۔ گویا تکلیف کی شدت دوآتشہ ہوگئی تھی۔

یہ ایسے احساس اور نازک لمحات تھے کہ میں جسم وجاں کی ہر تکلیف سے بے نیاز ہوگیا تھا۔ مجھے کسی بھی صورت جنید خان کی گاڑی تک پہنچنا تھا جو اس وقت بنگلے کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ ماجد نے مجھے گرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا اور وہ کسی بھی صورت گاڑی رکوا کر مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب تک میں اٹھ کر کھڑا ہوتا‘ جنید خان کی گاڑی بنگلے سے نکل کر میری نگاہ سے اوجھل ہوچکی تھی۔

اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ ماجد نے اس فائر کی آواز نہیں سنی ہوگی جو میرے عقب سے کسی نے سائیلنسر لگی گن سے کیا تھا۔ ورنہ وہ مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر ہرگز وہاں سے نہیں جاسکتا تھا۔ اس فائر کی آواز تو مجھے بھی سنائی نہیں دی تھی‘ ماجد کیسے سنتا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ گیٹ کھولنے والے بندے نے بھی گولی چلنے کی آواز نہیں سنی ہوگی۔ جنید خان کی گاڑی کے چلے جانے کے بعد وہ بندہ بڑے اطمینان سے گیٹ بند کررہا تھا گویا وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو......!

جو کچھ بھی ہوا تھا‘ میرے ہی ساتھ ہوا تھا اور جیسے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہوا‘ میرے ساتھ ہونے والا سلسلہ کچھ آگے بڑھا۔ مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً وہی شخص تھا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اس کم بخت کو ادھر تاریکی ہی میں روکنا ضروری تھا۔ اگر وہ گیٹ والے بندے کی نگاہ میں آجاتا تو معاملہ خراب ہوسکتا تھا۔

مجھے زخمی کرنے والا شخص یہی توقع کررہا ہوگا کہ میں اٹھ کر گیٹ کی جانب دوڑ لگاؤں گا لیکن ایک فوری

فیصلے کے تحت میں نے اس کی تمام تر توقعات کو خاک میں ملادیا۔

اس دوران میں وہ دوڑتے ہوئے میرے سر پرآن پہنچا تھا۔ میں نے اسے اپنے عقب میں محسوس کرتے ہی زمین پر گر کر بیک رول کیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں ایسی حرکت بھی کرسکتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے وہ بوکھلا گیا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے لڑھک کر دور چلا گیا۔

میں نے اُس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگی گن کو دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی لڑھکنے کا عمل مکمل ہونے کے بعد ہم ایک مقام پر ٹھہرے‘ میں نے اس کے گن والے ہاتھ پر اپنا ”سلامت“ ہاتھ ڈال دیا تاکہ گن کو اس کے ہاتھ سے چھڑا سکوں۔ اسی چھینا جھپٹی میں مجھے اس بندے کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ ایک سو ایک فی صد عمران تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر عمران علی نہیں بلکہ وہ عمران جسے میں دن میں انٹا غفیل کرکے واش روم میں بند کر گیا تھا۔ یقیناً اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

میرا چہرہ دیکھ لینے کے بعد اس کی مزاحمت میں طوفانی تیزی آگئی تھی۔ ہم دونوں اس طرح گتھم گتھا تھے کہ کبھی میں اوپر اور کبھی وہ اوپر۔ میں اسے اپنے ساتھ لڑھکاتے ہوئے اتنے فاصلے پر لے آیا تھا کہ اس تاریک حصے تک گیٹ والے بندے کی نظر رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔

عمران میری امید سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہورہا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں‘ ایک تو میں نے دن میں اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا‘ وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے کچھ زیادہ ہی جوشیلا ہورہا تھا۔ دوسرے زخمی بازو کے سبب میں پوری طرح اسے اپنے قابو میں لانے میں کامیاب نہیں ہو پارہا تھا۔ اگر میں اس کشتم کشتی میں دیر کردیتا اور اس دوران میں عمران کا داؤ چل جاتا تو میں کسی وبال میں بھی آسکتا تھا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اپنی ٹانگوں کو دہرا کرکے دونوں پاؤں اس کے پیٹ کے ساتھ لگائے پھر جسم وجان کی پوری قوت کے ساتھ ٹانگیں کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کردیا۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کی مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے مجھ سے دس فٹ دور جاگرا۔

زمین پر ٹکرانے کے باعث یقیناً اس کی کمر میں چوٹ لگی تھی۔ وہ سسک کر رہ گیا۔ میں نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے سنبھلنے نہیں دیا۔ میں آنِ واحد میں اس کے سر پر پہنچا اور اسے اپنے پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

اس نیچی پرواز کے دوران میں گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ادھر ادھر ہوگئی تھی ورنہ وہ مجھ پر دوبارہ فائر کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا۔ میں نے بڑی بے دردی سے اس کے چہرے کو ادھیڑ ڈالا۔

میرے جوتوں کی ٹھوکروں نے اس کا چہرہ لہولہان کردیا ہوگا۔ اندھیرے کے باعث میں اس کی حالت زار کا مشاہدہ تو نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی مجھے اس کا کوئی شوق تھا۔ میں تو جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرکے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔

دن میں کافی دیر تک بے ہوش رہنے کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک میرا سامنا نہیں کرسکا اور جلد ہی اس کی مزاحمت جواب دے گئی۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر اس کی حالت کا جائزہ لیا تو وہ مجھے دوبارہ بے ہوش ہونے کے قریب دکھائی دیا۔ میں نے اس کی گردن کو اوپر اٹھایا اور گردن کی سائیڈ پر واقع ایک مخصوص رگ کو مسل

کراس کی مشکل آسان کردی۔ وہ بے جان کچوے کی مانند بازوؤں میں جھول کررہ گیا۔

اسی لمحے مجھے گیٹ پر متعین شخص کی آواز سنائی دی۔

''اے..... کون ہے ادھر.....؟''

''میاؤں.....!'' میں نے اپنے حلق سے بلی کی مخصوص آواز نکالی اور تیزی سے ایک جانب دوڑ لگادی۔

مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ بندہ میرے تعاقب میں ادھر کا رخ کرے گا۔ یقیناً اس نے میری اس حرکت کو بلی کا کیادھرا سمجھا ہوگا۔ عمران کو میں نے دن کی طرح اب بھی ایک ایسی دنیا میں پہنچادیا تھا کہ وہ اٹھ کر اس بندے کو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

میں بنگلے کے پہلو میں بڑے اطمینان سے دوڑتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں کھڑے ہو کر میں نے ہال کے اندر ایک معمولی سی درز کے توسط سے جھانکا تھا۔ میں نے بنگلا چھوڑنے سے پہلے ایک بار پھر اسی مقام پر آنکھیں لگا کر اندر کے ماحول کا جائزہ لیا۔

ہال میں معمول کے مطابق شوٹنگ جاری تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے اور عمران کے درمیان ہونے والے معرکے کا ابھی تک کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے اس بنگلے اور اس کے حالیہ تمام مکینوں پر لعنت بھیجی اور بہ مشکل دیوار پھلانگ کر بنگلے سے باہر نکل آیا۔

اگرچہ اس وقت میرے بازو میں بے پناہ تکلیف ہورہی تھی مگر کسی نہ کسی صورت اس اذیت کو برداشت کرنا ہی تھا۔ خود پر توجہ دینے سے زیادہ اہم معاملات اس وقت مجھے درپیش تھے۔ میں نے اپنی جیب میں سے سیل فون نکالا اور فوراً سے پیش تر ماجد کو کال کیا۔

ماجد جن حالات میں جنید خان کی گاڑی پر سوار ہو کر بنگلے سے نکلا تھا وہ کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھے۔ پتا نہیں، جنید خان کو اس کی اصلیت کی خبر ہوچکی تھی یا وہ ابھی تک ماجد کو اداکاری کا کوئی شوقین ہی سمجھ رہا تھا اور مین روڈ تک ''ڈراپ'' کرنے کے لیے اس کو لفٹ دی تھی۔

دوسری گھنٹی پر ماجد نے کال ریسیو کرلی۔ ''ہاں، بولو باس.....!'' رسمی کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ڈائریکٹ مجھ سے مستفسر ہوا۔

ہم دونوں میں سے کوئی کسی کا باس نہیں تھا تاہم ہم ایسے ہی ایک دوسرے کو ''باس'' کہہ کر مخاطب کرلیتے تھے۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حالات پوری طرح میرے قابو میں ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''شکار میری ہدایت پر ڈرائیونگ کررہا ہے۔ میں نے عقبی نشست پر بیٹھے بیٹھے اسے گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔''

''تم اس بھاری بھرکم پنچھی کو کہاں لے کر جارہے ہو؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''اپنے خفیہ ٹھکانے پر..... اور کہاں؟'' اس نے معنی خیز انداز میں بتایا پھر پوچھا۔ ''مگر تم کہاں ہو۔ تم مجھے کارپورچ میں کہیں دکھائی نہیں دیئے تھے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہاں رک کر تمہارا انتظار کرتا۔ اگر میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کردیتا تو یہ موٹا پرندہ میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ بس، پندرہ بیس منٹ کے بعد میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں گا۔''

''حیرت ہے.....!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''کس بات پر؟'' ماجد کا چونکا ہوا استفسار میری سماعت سے ٹکرایا۔ ''اس پنچھی کو قابو کرنے پر یا تمہارا انتظار نہ کرنے پر۔ ویسے بائی دا وے..... تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ کہاں ہو؟''

''مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم نے مجھے کارپورچ میں دیکھا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو یہی سمجھ رہا تھا، تم نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میرے لیے گاڑی کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہوا ہے.....''

''تمہارا یہ کہنا تو درست ہے کہ میں نے کار کا دروازہ تمہارے ہی لیے کھلا رکھا ہوا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مگر جب تم مجھے کہیں دکھائی نہ دیے تو میں نے دروازہ بند کردیا۔ کیا تم اس وقت کارپورچ کے پاس ہی کہیں موجود تھے؟''

''ہاں..... کارپورچ کے پختہ فرش پر..... اور وہ بھی اوندھے منہ'' میں نے کہا۔

''فرش پر..... کیا مطلب؟'' اس کی اضطراری آواز ابھری۔

''مجھے گولی لگی تھی اور میں کارپورچ کے فرش پر گر گیا تھا۔'' میں نے ماجد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ''شاید وہاں کی تاریکی کے باعث تم مجھے دیکھ نہیں سکے تھے۔''

''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''مگر میں نے تو فائر کی آواز نہیں سنی تھی۔ تم پر کب اور کس نے گولی چلائی تھی؟''

''آواز تو میں نے بھی نہیں سنی تھی کیونکہ فائر سائیلنسر لگی گن سے کیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس وقت پتا چلا جب بائیں بازو میں آگ سی اترتی محسوس کی اور میں منہ کے بل کارپورچ کے فرش پر گرا.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ پر فائر عمران نے کیا تھا۔ پتا نہیں، وہ اچانک کہاں سے نمودار ہوگیا تھا حالانکہ میں نے اسے اور مراد کو بنگلے کے بیرونی حصے میں کہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال، میں عمران سے تسلی بخش انداز میں نمٹنے کے بعد اب بنگلے سے باہر آچکا ہوں۔''

''تھینکس گاڈ!'' اس کی اطمینان بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تمہارے زخمی بازو کا کیا حال ہے۔ کیا گولی اندر دھنسی ہوئی ہے؟''

''نہیں.....!'' میں نے پورے تیقن سے جواب دیا۔ ''میں سمجھتا ہوں گولی میرے بازو کا مزاج پوچھ کر گزر گئی تھی۔ اگر وہ اس وقت گوشت کے اندر کہیں پناہ گزیں ہوتی تو میں اتنی آسانی سے تم سے گفتگو نہیں کرسکتا تھا۔ میرے خیال میں اس گولی نے میرے بازو کے گوشت کو چھیل ڈالا ہے۔ جس کی وجہ سے شدید جلن محسوس ہورہی ہے اور تکلیف بھی مگر..... فکر والی کوئی بات نہیں، میں ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہوں کہ اتنی سی تکلیف بھی برداشت نہ کرسکوں۔''

''باس! تمہیں فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میری مانو تو عاطف صاحب سے رابطہ کرکے ان کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ تمہارے معاملے کو سنبھال لیں گے۔''

''میرا ''معاملہ'' اس وقت تمہاری گن کے نشانے پر ہے ماجد۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم میری تکلیف کی پروا نہ کرو اور اپنے اڈے یا ٹھکانے کے بارے میں بتاؤ۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔ یہ معمولی سی چوٹیں تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ میں بازو کی اس تکلیف کو لے کر اپنا راستہ کھوٹا نہیں کرسکتا۔ مجھے پہلی فرصت میں جنید خان تک پہنچنا ہے اور..... اس کی زبان سے فرحانہ کا پتا اگلوانا ہے.....''

میرے الفاظ میں ایسی سنگینی اور قطعیت تھی کہ ماجد

نے مزید کسی بحث کو غیر ضروری جانتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اوکے باس! میں اپنے ٹھکانے کے بارے میں تمہیں ایس ایم ایس کر دیتا ہوں۔''

''تم اتنی دیر سے کس سے باتیں کر رہے ہو؟'' جنید خان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

یقیناً وہ ڈرائیونگ کے ساتھ ہی ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہا تھا۔ اگرچہ میری آواز اس کی سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھی تاہم وہ ماجد کی باتوں سے کم از کم اتنا تو اندازہ لگا ہی چکا ہوگا کہ میں اس کا ہی کوئی ساتھی ہوں جو بنگلے پر موجود تھا۔ جنید خان کے استفسار کے جواب میں ماجد کی دھمکی آمیز آواز ابھری۔

''خان صاحب! تم اپنے کام سے کام رکھو تو اچھا ہوگا۔ یہ کسی ڈرامے کی شوٹنگ نہیں بلکہ ''لائیو لیٹ نائٹ شو'' ہے جس کا ڈائریکٹر میں ہوں۔ لہٰذا تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ میری ڈائریکشن کو چپ چاپ فالو کرتے جاؤ ورنہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی تمہارا ڈراپ سین شوٹ کرلوں گا۔''

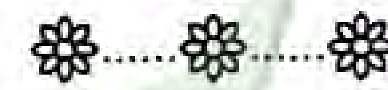
''اوکے ماجد!'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے ایس ایم ایس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اوکے......!'' یہ کہتے ہوئے اس نے سیلولر رابطہ منقطع کر دیا۔

ماجد سے گفتگو کے دوران میں میں سبک قدموں سے چلتے ہوئے آسیبی بنگلے سے کافی فاصلے پر نکل آیا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا تاہم گلستان جوہر کے اس نیم آباد علاقے میں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں رات ڈھلے صدیاں بیت گئی ہیں۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی بھی محسوس ہو رہی تھی جس نے میرے بازو کے زخم کی تکلیف کو بڑھا دیا تھا۔ جب تک میرا بازو حرکت میں تھا اور زخم گرم تھا تو درد کا احساس اتنا نہیں تھا جتنا اب محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے میں نے ٹٹول کر اچھی طرح گھائل بازو کا معائنہ کر لیا تھا۔ تکلیف کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا مگر زخم کی نوعیت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔ ہڈی محفوظ رہی تھی۔ گولی بازو کے ٹرائی سیپس کو چھیلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ متاثرہ حصے سے رسنے والے خون نے اگرچہ میری شرٹ کو آلودہ کر دیا تھا مگر میرے محتاط اندازے کے مطابق یہ معاملہ دو تین ڈریسنگ سے زیادہ کی مار نہیں تھا۔

اگلے ہی لمحے میں نے ماجد کا میسج ریسیو کر لیا۔ اس نے مجھے اپنے ٹھکانے کا ایڈریس تو نہیں بتایا تھا تاہم صدر کے علاقے کی ایک مخصوص لوکیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر اس سے رابطہ کروں۔ وہ خود مجھے پک کر لے گا۔

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ماجد نے یہ حکمت عملی احتیاط کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے اختیار کی تھی تاہم اس بات پر مجھے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے مجھے صدر ایسے گنجان آباد اور مصروف تجارتی مرکز میں پہنچنے کو کہا تھا جب کہ میرے اندازے کے مطابق اس کے خفیہ ٹھکانے کو آبادی سے دور کسی ویران مقام پر ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال ماجد کے پاس پہنچنے کے بعد ہی اس مصلحت سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔ وقت مجھے کس موڑ پر کیا دکھانے کا ارادہ رکھتا تھا اس کے بارے میں قبل از وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا......!



مین روڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ شاید وہ اللہ کا بندہ کسی پسنجر کو آگے چھوڑ کر آ رہا تھا ورنہ آدھی رات کے بعد جوہر کے اس دور افتادہ حصے سے ٹیکسی یا رکشا کا حصول اتنا آسان نہیں تھا بلکہ یہ ناممکنات میں سے تھا۔

میں نے صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر ٹیکسی والے سے بھاؤ تاؤ کی کوشش نہیں کی۔ اس نے صدر جانے کے دو سو روپے مانگے اور میں ایک لفظ ادا کیے بغیر ٹیکسی کی عقبی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ٹیکسی والے نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

میری جیب میں اس وقت لگ بھگ ساڑھے نو ہزار کی رقم موجود تھی۔ اگر ٹیکسی والا پانچ سو روپے بھی بتاتا تو میں بلا چوں و چرا اس کی ٹیکسی میں بیٹھ جاتا۔

گزشتہ رات ندیم شیروانی نے مجھے دس ہزار روپے دیے تھے جب میں اس کی قید میں مجبور اور بے بس تھا لیکن اب مجبوری والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نہ صرف یہ کہ اس کے شکنجے سے نکل آیا تھا بلکہ پچھلے چوبیس گھنٹے میں میں نے اسے قابل ذکر نقصان بھی پہنچایا تھا اور آئندہ بھی ناقابل فراموش نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ندیم شیروانی نے پچھلی رات مجھے اپنی جیب سے دس ہزار روپے نہیں دیے تھے بلکہ یہ میری ہی رقم تھی جو اس نے مجھے لوٹائی تھی۔ فرحانہ کی بہ خیریت رہائی کے بدلے شیروانی کے مطالبے پر میں ''پانچ لاکھ'' روپے لے کر گلستان جوہر کے ایک بنگلے پر پہنچا تھا لیکن یہ بات صرف مجھے اور خوش دلی کو معلوم تھی کہ پانچ لاکھ کی ان پانچ گڈیوں میں صرف دس ہزار کے نوٹ اصلی تھے یعنی ہر گڈی کے اوپر اور نیچے والا نوٹ باقی اندر سب نقلی کرنسی بھری ہوئی تھی۔ شیروانی نے میری یہ چار سو بیسی پکڑ لی تھی اور جب میں اس کی قید میں تھا تو یہ دس ہزار اٹھا کر میرے منہ پر مار دیے تھے......!

فرحانہ کے باپ عبدالخالق صاحب نے اپنی بیٹی کی بازیابی کے لیے مجھے پورے پانچ لاکھ مہیا کیے تھے جن میں سے میں نے صرف یہی دس ہزار خرچ کر کے ''پانچ لاکھ'' والی گڈیاں تیار کی تھیں۔ باقی کے چار لاکھ نوے ہزار میرے پاس گھر میں محفوظ پڑے تھے جو میں کسی بھی موقع پر انکل خالق کو واپس کر دیتا لیکن میں کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جب اس رقم کے ساتھ ہی میں فرحانہ کو بھی ان تک پہنچانے کی پوزیشن میں آ جاتا مگر ایسے کسی خوشگوار موقعے سے پہلے ہی عبدالخالق اسپتال پہنچ گئے تھے۔ بیٹی کی جدائی نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

عبدالخالق کے ہارٹ اٹیک سے میرا دھیان ایک بار پھر فرحانہ کی طرف چلا گیا۔ ندیم شیروانی نے بڑے شاطر پنے سے یکے بعد دیگرے ہم دونوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا اور اس کارروائی میں حالات کی ستم ظریفی نے بھی کافی چمتکار دکھائے تھے۔ میں اسی کا کیا بھگت رہا تھا۔

شیروانی کی دشمنی مجھ سے تھی لیکن میں اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا لہٰذا مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلانے کے لیے اس نے میری چھوٹی بہن شازیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی مگر فرحانہ کی اسمارٹ نیس کے باعث اغوا کنندگان شازیہ کے بجائے فرحانہ کو اٹھا لے گئے تھے۔ میں تو کسی طرح مارا ماری کر کے شیروانی کے چنگل سے نکل آیا تھا تاہم ابھی تک فرحانہ اسی کی کسٹڈی میں تھی اور مجھے امید تھی کہ اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں فرحانہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ان شاء اللہ!

''سر! صدر میں آپ کس اسپتال میں جائیں گے؟''

ٹیکسی ڈرائیور کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت ہم نمائش کے قریب پہنچنے والے تھے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ میں کسی اسپتال میں

جانے کا ارادہ رکھتا ہوں......؟''

''سر! آپ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے کسی سوچ میں گم ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ ٹیکسی لائن میں میرا تجربہ یہ ہے کہ رات کے وقت پسنجرز عموماً ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرنے لگتے ہیں تاکہ سفر بے خوف و خطر کٹ جائے۔ آپ جانتے ہیں' شہر کے حالات کس قسم کے ہیں۔ انسان اپنے سائے پر بھی بھروسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی اچانک کہیں سے آئے گا اور گن پوائنٹ پر موبائل فون اور نقدی چھین کر لے جائے گا۔ اگر کوئی لیڈیز وغیرہ ساتھ ہوئیں تو سمجھو کہ...... زیورات بھی گئے۔''

''ٹھیک ہے۔ شہر کے حالات تو بس ایسے ہی ناقابل یقین اور انتہائی افسوسناک ہیں۔'' میں نے ڈرائیور کی باتوں میں دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا......؟''

''کون سا سوال سر؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

عجیب جھکی آدمی تھا وہ بھی۔ گلستان جوہر سے یہاں تک خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا چلا آیا تھا اور اب گویا اس کی زبان کا قفل کھل گیا تھا۔

''میں نے پوچھا تھا کہ تم نے میری کس بات سے یہ اندازہ لگایا کہ مجھے کسی اسپتال جانا ہے؟'' میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان معتدل رکھتے ہوئے سوال کو دہرایا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ کی پراسرار خاموشی اور چہرے پر ابھرنے والے تکلیف کے آثار سے......''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''بات دراصل یہ ہے سر......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب سے آپ میری ٹیکسی میں بیٹھے ہیں' میں بیک ویو مرر میں مسلسل آپ کا جائزہ لے رہا ہوں۔ آپ نہ صرف خاموش ہیں بلکہ کسی گہری سوچ میں بھی ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ کے چہرے پر اذیت برداشت کرنے کے مخصوص تاثرات بھی نمودار ہو رہے ہیں اور......اور......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''اور کیا؟''

''اور سر...... آپ کا بایاں بازو بھی شدید زخمی ہے۔'' اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بائیں کندھے پر سے آپ کی شرٹ بھی خون آلود ہو رہی ہے۔ میں نے اسی بنا پر کہا تھا کہ کہیں آپ مرہم پٹی کے لیے کسی اسپتال وغیرہ تو نہیں جانا چاہتے۔''

''اوہ......تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں کہ میں آدھی رات کے بعد گلستان جوہر سے نکل کر صدر کے کسی اسپتال کا رخ کروں۔ معمولی سا زخم ہے۔ میں گھر ہی میں مرہم پٹی کرلوں گا۔ تمہیں میرے بارے میں اتنا زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''یس سر! میں نے تو بس ایسے ہی انسانی ہمدردی کے ناتے پوچھ لیا تھا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''اگر میری بات بری لگی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ کا پوچھنا مجھے بالکل برا نہیں لگا۔''

''بہت شکریہ سر۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ایک مشورہ دوں سر؟''

''ہاں ضرور دیں مشورہ۔'' میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کسی چھوٹے سے چھوٹے زخم کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بعض اوقات ذرا سی غفلت سے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ میں محمد حسین کے سلسلے میں ایک ایسا ہی حادثہ بھگت چکا ہوں۔''

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا' وہ اپنے سینے میں کوئی بہت گہرا دکھ چھپائے بیٹھا ہے۔ اس کی حالت کے پیش نظر میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہ محمد حسین کون ہے اور...... اس کے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آ گیا تھا جس کے ذکر نے تمہیں اس قدر ملول کر دیا ہے......؟''

''سر! محمد حسین میرا اکلوتا بیٹا ہے۔'' اس نے بوجھل آواز میں بتایا۔ ''اکلوتا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پانچ بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ اس وقت تقریباً چھ سال کا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''کیا ہوا ہے تمہارے بیٹے کو؟''

''ایک سال پہلے محمد حسین کے پاؤں میں ایک معمولی سی چوٹ لگ گئی تھی۔'' وہ نم ناک لہجے میں بتانے لگا۔ ''کچھ ہماری کوتاہی اور کچھ حالات کی ستم ظریفی کہ محمد حسین کا سنجیدگی سے باقاعدہ علاج نہیں کیا۔ ایک سال کی مختلف ناتجربہ کاری کے بعد وہ زخم ناسور کی شکل اختیار کر گیا' بالآخر گھٹنے سے اس کی ٹانگ کو کاٹنا پڑا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اللہ نے ہزاروں منتوں اور مرادوں کے بعد مجھے نرینہ اولاد دی تھی اور وہ بھی داغ دار ہو چکی ہے۔ محمد حسین اب بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔''

''اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔'' میں نے اشک شوئی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کو صبر سے کام لینا چاہیے۔ وہ قادر مطلق آپ کو کسی اور انداز میں نواز دے گا۔''

''صبر ہی کر رہا ہوں سر......'' وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''بس' یہ تو ایسے ہی تذکرہ نکل آیا۔ آپ کا زخمی کندھا دیکھا تو مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا اور میں نے آپ کو مشورہ دے ڈالا۔ یہ سوچے بغیر کہ......ایسی باتیں آپ کو بری بھی لگ سکتی ہیں۔''

''بالکل نہیں......'' میں نے صدق دل سے کہا۔ ''مجھے تمہاری کوئی بھی بات بری نہیں لگی۔''

اس نے ٹیکسی سڑک کے کنارے روک دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ میرے بائیں پہلو میں ''رینبو سینٹر'' کی بلند و بالا عمارت استادہ تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو رینبو سینٹر صدر ہی آنے کا کہا تھا۔

میں نے ٹیکسی چھوڑنے سے پہلے اپنی جیب سے ایک ہزار روپے کا نوٹ نکال کر ڈرائیور کی جانب بڑھا دیا۔ میرے پاس کرائے کے دو سو روپے ادا کرنے کے لیے کھلے پیسے بھی تھے لیکن میں نے ایک خیال کے تحت دانستہ اسے ایک ہزار کا نوٹ دیا تھا۔

اس نے میرے ہاتھ سے ہزار والا نوٹ لے لیا پھر الجھن زدہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے پاس کھلے دو سو روپے نہیں ہیں؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ایک پانچ سو روپے والا نوٹ بھی نہیں؟''

''بالکل نہیں......!''

''آپ ایک منٹ ٹھہریں سر۔'' وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سامنے والے ہوٹل

سے کھلا لے کر آتا ہوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کک..... کیا مطلب!" وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ "اگر میں کھلا نہیں لے کر آؤں گا تو آپ کو باقی آٹھ سو روپے کیسے دوں گا.....؟"

"میں نے کہا نا' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ہزار روپے تم رکھ لو۔"

"میں ہزار روپے کیسے رکھ سکتا ہوں سر۔" وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔ "دو سو کرایہ بتایا تھا تو آپ سے دو سو روپے ہی لوں گا نا۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"غلام حسین۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر اس معاملے کا میرے نام سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پہلے یہ نوٹ جیب میں رکھو' پھر بتاتا ہوں۔"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد غلام حسین نے وہ ہزار کا نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا پھر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"دیکھو غلام حسین۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "غلام حسین کا سیدھا سیدھا مطلب ہے' حسین کا غلام۔ یعنی تم حسین کے غلام ہو تو..... اگر حسین میرے توسط سے ایک ہزار روپے اپنے غلام تک پہنچا رہے ہیں تو آپ کو اس پر اعتراض کیوں ہے؟"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ "سر! آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے کہ میرے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔ میں حسین ابن حیدر کے بھیجے ہوئے تحفے کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔"

"آپ ان میں سے محمد حسین کے لیے ایک کپڑوں کا نیا جوڑا خریدیں گے۔" میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "حسین کے بھیجے ہوئے تحفے پر غلام حسین سے زیادہ حق محمد حسین کا ہے۔ غلام کا کام اپنے آقا کا حکم بجا لانا ہے۔ آپ اس تحفے کو محمد حسین تک پہنچائیں گے۔"

"سمجھ گیا سر!" وہ جذبات سے لب ریز آواز میں بولا۔ "بہت اچھی طرح سمجھ گیا۔"

میں نے اسے "اللہ حافظ" کہا اور ٹیکسی سے باہر نکل آیا۔ پیچھے سے اس نے مجھے پکارا۔

"سر! اپنا نام تو بتا جائیں.....!"

"اسد....." میں نے مڑے بغیر کہا۔ "اسد اللہ۔"

"اسد اللہ.....!" اس نے زیر لب دہرایا۔ "بہت خوب' اللہ کا شیر ہی حسین کے غلام کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہے۔"

اگر میں رک جاتا تو بات لمبی ہو جانا تھی اور میں اس وقت لمبی چوڑی گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ایمپریس مارکیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے ماجد کو کال کرنے لگا۔

ماجد نے مجھے ایمپریس مارکیٹ اور گھڑیالی بلڈنگ کے نزدیک پہنچنے کے بعد کال کرنے کو کہا تھا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ مارکیٹس تو تمام بند ہو چکی تھیں البتہ پھل فروٹ والے چند ٹھیلے اب بھی جاگ رہے تھے۔ دن کے وقت صدر کے اس حصے میں جس قدر رونق' چہل پہل اور رش دیکھنے کو ملتا ہے' اس کا اس وقت دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ سڑکیں سنسان اور فٹ پاتھ خالی تھے۔ البتہ گھڑیالی بلڈنگ

کے فٹ پاتھ رات گئے بھی آباد دکھائی دے رہے تھے اور انہیں آباد کرنے والوں کا تعلق اخبار کی دنیا سے تھا۔

صبح کا اخبار آدھی رات کے بعد بنڈلوں کی صورت سوزوکی وینز پر لد کر پرنٹنگ پریس سے اخبار مارکیٹ' ریگل اور گھڑیالی بلڈنگ کے علاوہ شہر کے دیگر علاقوں تک پہنچنا شروع ہو جاتا ہے جہاں پر تیز رفتار اسٹاف اخبار کی "پیج سیٹنگ" میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کی محنت ہی سے ایک اخبار صفحات کی ترتیب کے لحاظ سے اپنی اصل شکل میں آتا ہے جس کے بعد ہاکرز کا کام شروع ہوتا ہے۔

"پیج سیٹنگ" کے بعد اخبار نیوز اسٹینڈ پر پہنچتا ہے یا پھر ہاکرز اسے اپنے مخصوص کلائنٹ تک پہنچانے کے کام میں جت جاتے ہیں۔ میں نے گھڑیالی بلڈنگ کے فٹ پاتھ پر ہونے والی "پیج سیٹنگ" کا مشاہدہ جاری رکھتے ہوئے ماجد سے رابطہ کر لیا۔

"ہاں بابا....." اس کے ہیلو کے جواب میں' میں نے کہا۔ "میں صدر پہنچ گیا ہوں اور گھڑیالی بلڈنگ کے سامنے کھڑا ہوں۔ تم کہاں ہو.....؟"

"میں دیسی مرغی کے ساتھ مصروف ہوں۔" اس نے بڑے بھرپور انداز میں جواب دیا۔ "ذبح کیے بغیر اس کی کھال کھینچنے کا ارادہ ہے۔ اور اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

ماجد خاصے خوش گوار موڈ میں تھا۔ میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ "میں تمہاری مدد کے لیے آ گیا ہوں مگر تم کہیں نظر نہیں آ رہے.....؟"

"آپ گھڑیالی بلڈنگ سے زاہد نہاری ریسٹورنٹ کی جانب چلنا شروع کرو۔" اس نے معتدل لہجے میں کہا۔ "راستے میں میرا آدمی تمہیں ریسیو کر لے گا۔ میں نے اسے تمہارے حلیے اور قد کاٹھ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا ہے۔ اس کا نام بشارت ہے اور اس نے دھاری دار شرٹ پہن رکھی ہے۔"

"او کے..... میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

رابطہ موقوف کرنے کے بعد میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور گھڑیالی بلڈنگ کے قریب سے گزر کر اس سڑک پر چلنے لگا جو صدر دواخانہ سے لکی اسٹار کی طرف جاتی تھی۔ اسی سڑک پر آگے چل کر زاہد نہاری ریسٹورنٹ تھا۔ ابھی تک میرا ذہن اس مسئلے کو حل نہیں کر پایا تھا کہ ماجد نے اپنا ٹھکانہ ایسی مصروف جگہ پر کیوں بنا رکھا تھا.....!

بوہری جماعت خانہ کے قریب سے گزر کر میں سگنل تک پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے مجھے ایک میانہ قد شخص آتا دکھائی دیا۔ میرے ذہن نے فوراً فیصلہ سنا دیا کہ وہ ماجد کا آدمی بشارت ہوگا۔ وہ بندہ بھی مجھی پر نگاہ جمائے آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

"میں بشارت ہوں۔" اس نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ یقیناً ماجد صاحب کے دوست ہیں.....؟"

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آپ آئیں میرے ساتھ.....!" اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

میں اس کی تقلید میں قدم اٹھانے لگا۔

اس وقت ہم مینسفیلڈ اسٹریٹ پر آگے پیچھے چل رہے تھے اور ہمارا رخ لکی اسٹار کی طرف تھا۔ اس اسٹریٹ کی دونوں جانب زیادہ تر اسلحہ فروشوں کی دکانیں تھیں یا پھر اکا دکا ہوٹلز کے علاوہ چند چشمے والے تھے تاہم رات کے اس پہر تمام دکانیں بند تھیں۔

میں بشارت کی معیت میں ایک گلی سے دوسری گلی کی سیر کرنے لگا۔ زاہد نہاری ریسٹورنٹ سے آگے آنے کے بعد وہ بائیں جانب ایک گلی میں مڑ گیا تھا اور پھر اس نے کئی گلیوں میں مجھے گھما ڈالا تھا۔ بالآخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ صدر کا علاقہ میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ مجھے بشارت نے جس جگہ پہنچایا تھا' میرے اندازے کے مطابق یہاں تک آنے کے لیے ہمیں اتنے گھماؤ پھراؤ کی ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً بشارت نے کسی احتیاط کے پیش نظر یہ پے چیدہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

بشارت نے ایک گندی گلی سے گزرنے کے بعد آخر کار مجھے ایک گودام میں پہنچا دیا۔ مذکورہ گودام ایک پرانی اور بوسیدہ بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھا جس کا راستہ گندی گلی میں سے تھا۔ یہ بلڈنگ پیلے پتھروں سے بنائی گئی تھی اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی تعمیر قیام پاکستان سے پہلے یا فوراً بعد کی گئی تھی۔

بڑے بڑے گٹھروں کے درمیان سے گزر کر میں ماجد کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مذکورہ گودام کے ایک تنگ سے حصے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کرسی اور بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بشارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے' تم جاؤ......"

بشارت کسی زرخرید غلام کی مانند ماجد کے اشارے پر نو دو گیارہ ہو گیا۔

"جنید خان کہاں ہے؟" میں نے ادھر ادھر متلاشی انداز میں دیکھتے ہوئے ماجد سے سوال کیا۔

"ادھر ہی ہے۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔ "اس سے تمہیں بعد میں ملواؤں گا' پہلے تم اپنی شرٹ اتارو......"

"شرٹ......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں...... میں نے شرٹ ہی کہا ہے۔" اس نے کہا پھر کرسی کے قریب ہی رکھے ہوئے ایک شاپنگ بیگ کو اٹھا کر بولا "جنید خان کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ پہلے تمہارے بازو کا معائنہ ضروری ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے شاپنگ بیگ کو کرسی پر رکھ دیا پھر دوسری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

میں نے پہلے شرٹ اتاری پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماجد کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح میرے زخمی بازو کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک منٹ کے بعد اس نے فتویٰ جاری کیا۔

"شکر کرو کہ بچ گئے۔ گولی نے تمہارے ساتھ بڑی نرمی کا برتاؤ کیا ہے۔ زخم خطرناک نہیں...... دو چار پٹیوں میں تم ایک دم فٹ ہو جاؤ گے۔"

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" میں نے کہا۔

وہ شاپنگ بیگ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ پہلے اس نے ایک شرٹ نکال کر کرسی کے پشتے پر پھیلا دی اور کہا۔ "یہ بشارت کی شرٹ ہے' فری سائز ہے' تمہیں پوری آ جائے گی۔" پھر اس نے بیگ کے اندر سے ایک چھوٹا بیگ نکال لیا۔

اس چھوٹے بیگ کے اندر ڈریسنگ وغیرہ کا سامان تھا۔ اگلے دس منٹ میں ماجد نے میرے گھائل بازو کے متاثرہ حصے کو اچھی طرح صاف کر کے بڑی صفائی کے ساتھ میری مرہم پٹی کر دی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکات اور کام کے معیار سے یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی ڈاکٹر یا کم از کم کوالیفائڈ ڈسپنسر ضرور

ہے۔

ڈریسنگ کا کام مکمل ہو چکا تو میں نے شرٹ پہن لی۔ اگرچہ بشارت میرے کینڈے کا بندہ نہیں تھا تاہم فری سائز ہونے کے باعث وہ مجھے پوری آ گئی تھی۔ میں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہ ہے تمہارا ٹھکانا......؟"

"ہاں......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ "کیوں...... پسند نہیں آیا؟"

"پسند یا ناپسند کی بات نہیں۔" میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "ادھر قریب ہی پولیس کا انویسٹی گیشن سینٹر بھی تو ہے......؟"

"ہے نہیں...... تھا!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اب تو وہ بلڈنگ ٹریفک پولیس والوں کے قبضے میں ہے۔"

"پھر بھی' ایسے خطرناک کاموں کے لیے تمہیں کسی محفوظ اور آبادی سے دور پرے کسی الگ تھلگ جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔" میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اظہار خیال کیا۔ "صدر کا علاقہ تو بہت ہی بارونق اور مصروف ہے اور پھر یہاں قریب میں......"

"میں تم سے مختلف انداز میں سوچتا ہوں اسد۔"

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "جس طرح تمہیں ہضم نہیں ہو رہا نا کہ کوئی اتنے گنجان آباد علاقے میں بھی اس قسم کا ٹھکانا بنا سکتا ہے' اسی طرح کسی اور کا دھیان بھی اس طرف نہیں جا سکتا اور سب سے اہم بات یہ کہ......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں اس گودام کو ایسے مقاصد کے لیے کبھی کبھار ہی استعمال کرتا ہوں۔ میں نے اچھے وقتوں میں یہ بلڈنگ خرید لی تھی۔ اس کے فرنٹ پر ہیئر ڈریسر کی دکان ہے' جو بشارت کی نگرانی میں چلتی ہے۔ بشارت کا تعلق ضلع جھنگ سے ہے۔ یہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔ یہ دن بھر ہیئر ڈریسر سیلون چلاتا ہے اور رات کو اسی دکان کے اندر سو جاتا ہے۔"

"اور یہ گودام......" ماجد کے خاموش ہونے پر میں نے سوال اٹھایا۔ "یہ کس چیز کا گودام ہے اور ان بڑے بڑے گٹھروں میں کیا بھرا ہوا ہے؟"

"ان گٹھروں میں لنڈے کا مال بھرا ہوا ہے۔" وہ چاروں طرف موجود گٹھروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ان میں مختلف نوعیت کے کپڑے کوٹ' پتلون' جینز' سوئیٹر' جرسیاں اور جیکٹس وغیرہ بھری ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی گٹھر میں جوتے وغیرہ بھی ہوں۔ تم نے صدر کے مختلف ٹھیلوں پر یہ سامان بکتے دیکھا ہو گا؟"

"ہاں' دیکھا ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "مگر تمہارا اس لنڈے کے کاروبار سے کیا واسطہ؟"

"میرا اس بزنس سے صرف اتنا سا واسطہ ہے کہ میں نے اپنا یہ گودام ایک پارٹی کو کرائے پر دے رکھا ہے۔" وہ سرسری انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ پارٹی لاٹ کے مال کو یہاں اسٹور کرتی ہے اور پھر یہاں سے مختلف ٹھیلوں تک سپلائی کر دیا جاتا ہے۔"

"اگر تم نے یہ گودام کسی پارٹی کو کرائے پر دے رکھا ہے تو پھر اس کی چابی تمہارے پاس کیوں ہے؟" میں نے فطری تجسس کے باعث پوچھ لیا۔ "اور تم بہ وقت ضرورت اتنے دھڑلے سے اسے کیسے استعمال کر رہے ہو......؟"

جواب دینے سے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر سنبھل کر بولا۔ "وہ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل

کے حالات کا تو تمہیں پتا ہی ہے نا۔ تم نے سنا ہوگا' پچھلے دنوں لانڈھی کے علاقے میں کپڑے کے ایک گودام میں آگ لگ گئی تھی جس پر قابو پانا ناممکن ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے سائٹ کے علاقے میں بھی آتش زدگی کا ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا جس میں لاکھوں روپے کا کپڑا جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں قدر مشترک صرف یہ بات تھی کہ ان سانحات کا پتا بہت بعد میں لگا تھا اور جب تک کوئی عملی قدم اٹھایا جاتا' لاکھوں کا نقصان ہوچکا تھا۔ اسی لیے......" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اسی لیے میں نے لنڈے کا کاروبار کرنے والی پارٹی سے گودام کی ایک چابی بشارت کو دلوا رکھی ہے۔ بشارت رات کو ہیئر ڈریسر سیلون کے اندر ہی سوتا ہے۔ کسی اونچ نیچ کے وقت یہ پارٹی کو بروقت خبر تو دے سکتا ہے......"

اس کی وضاحت سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ماجد مجھ سے کچھ نہیں' بلکہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ کرید اور بحث و تمحیص کا وقت نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ پھر کبھی فرصت میں ماجد سے اس موضوع پر تفصیلی بات کروں گا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آؤ اسد ذرا شکار کی خبر لیں......!"

میں ماجد کے پیچھے چلتے ہوئے گٹھروں کے پیچھے اس گودام کے ایک دور افتادہ حصے میں پہنچا۔ یہاں جنید خان موجود تھا اور خاصی مضحکہ خیز حالت میں نظر آرہا تھا۔ ماجد نے اسے ایک ننگی ستون کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے وہ عمارت پرانی وضع کی تھی اگرچہ اس کی مضبوط بنیاد کو دیکھتے ہوئے اس کے اوپر مزید فلور بھی بنا لیے گئے تھے تاہم گراؤنڈ فلور کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا تھا۔ موسم اچھا تھا اس لیے اس گودام میں سانس لینے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ گرم موسم میں تو وہاں ایک منٹ رکنا بھی مشکل ہوگا۔

"باس! آپ کا مجرم حاضر ہے۔" ماجد نے جنید خان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

جنید خان کو ماجد نے نائیلون کی رسی کی مدد سے ستون کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اس کام میں یقیناً بشارت نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا ہوگا۔ جنید خان کی حالت دیدنی تھی۔ شیروانی کا ساتھی ہونے کے ناتے اسے کوئی شریف آدمی تو نہیں کہا جاسکتا تاہم ان لمحات میں وہ پوری طرح ماجد کی دہشت میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں کبھی مجھے اور کبھی ماجد کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا تاہم چہرے کے تاثرات سے تو یہی لگتا تھا کہ اس "پہچان" میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہورہی تھی۔

میں اس کے بالکل سامنے پہنچ گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے جانتے ہو......؟"

میرے استفسار میں دنیا جہان کا غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"نن......نہیں!"

"باس! آپ اپنے مجرم سے بات کرلو۔" ماجد نے مجھ سے کہا۔ "میں ادھر دوسری طرف بیٹھا ہوں۔ اگر میری ضرورت محسوس کرو تو آواز دے لینا۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور ماجد کے جانے کے بعد میں دوبارہ جنید خان کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"اگر زندہ رہنے کی تمنا ہے تو میرے ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے ساتھ زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے جوابات میں مجھے دروغ گوئی کی بو محسوس ہوئی تو میں تمہیں اسی بندے کے حوالے کردوں گا جو تمہیں گن پوائنٹ پر یہاں لے کر آیا ہے' پھر یہ تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کرے......"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"فرحانہ کو تم نے کہاں قید کر رکھا ہے؟"

"فرحانہ......" اس نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "میں کسی فرحانہ کو نہیں جانتا......"

میں نے بے ساختہ اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور خونخوار لہجے میں کہا۔

"اب تم یہ بھی پوچھو گے کہ میں کون ہوں؟"

"مم......میں تمہیں بھی نہیں جانتا۔" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "بتاؤ' کون ہو تم اور......مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

"شوبز کی دنیا میں رہتے ہوئے اداکاری بھی سیکھ لی ہے تم نے......" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم نے میری ایک عزیزہ کو اپنے پرائی ویٹ باپ شیروانی کے حکم پر کسی جگہ قید کر رکھا ہے۔ کیا یہ وجہ دشمنی کے لیے کافی نہیں ہے......؟"

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس گھورنے میں حیرت سے زیادہ بے بسی پائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑنے کی غرض سے کہا۔

"میں اس فرحانہ کی بات کررہا ہوں جسے آج دوپہر میں تم اپنے باس ندیم شیروانی کے حکم پر جوہر والے اسی بنگلے پر لانے والے تھے جہاں سے ابھی تم آرہے ہو لیکن شیروانی نے تمہیں اس کام سے منع کردیا تھا۔ اچانک اس کا پروگرام تبدیل ہوگیا تھا......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ یاد آیا یا کوئی اور حوالہ بھی دینا پڑے گا؟"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تت......تم اسد تو نہیں ہو......؟"

"بالکل ٹھیک پہچانا جنید خان۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "بہت دیر لگادی تم نے اپنے اس ایڈہاک باپ کو پہچاننے میں۔ اب جلدی سے بتادو کہ فرحانہ کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے چکر دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ میں نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

"دیکھو جنید خان! میری دشمنی تمہارے پرائی ویٹ باپ ندیم شیروانی سے ہے۔ تم اگر ہماری دشمنی کے راستے میں آؤ گے تو خواہ مخواہ رگڑے جاؤ گے۔ میں فرحانہ کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ اگر تم کل صبح کا سورج دیکھنا چاہتے ہو تو شرافت کے ساتھ مجھے فرحانہ کا پتا بتادو ورنہ تمہارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے......کچھ بھی!"

"تمہیں شاید میری بات کا یقین نہ آئے......!"

"یقین کرنے یا نہ کرنے کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی غصیلے انداز میں کہا۔ "پہلے کچھ بکو تو سہی......"

"فرحانہ......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "فرحانہ

میری کسٹڈی میں نہیں ہے......"

"میں نے تمہیں بکنے کے لیے کہا تو تم نے بکواس شروع کردی۔" میں نے اسے ایک اور چانٹا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو' مجھے اتنی آسانی سے الو بنانے میں کامیاب ہوجاؤ گے؟"

اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کے تاثرات ابھرے تاہم مجبوری کے باعث وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کرسکا اور دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"تم یقین کرو' فرحانہ میرے پاس نہیں ہے......!"

"پھر کہاں ہے وہ!" میں دہاڑا۔ "میری معلومات کے مطابق' شیروانی نے فرحانہ کو تمہاری تحویل میں دے رکھا ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے یا نہیں' مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں۔ تم ہی مجھے فرحانہ تک پہنچاؤ گے ورنہ جان سے جاؤ گے۔"

"تمہاری معلومات خاصی پرانی ہوچکی ہیں۔" وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج سہ پہر تک واقعی فرحانہ میری تحویل میں تھی لیکن پھر شیروانی صاحب نے اسے کہیں اور شفٹ کرادیا ہے اور......اس کی وجہ بھی تم ہی ہو۔"

"میں......میں کس طرح؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے آج دن میں......میرا مطلب ہے' پچھلے روز اس بنگلے پر شہبازی' عمران اور مراد کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی رپورٹ شام سے پہلے باس تک پہنچ گئی تھی۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بتانے لگا۔

"اسی لیے میں ذرا تاخیر سے شوٹنگ کے لیے اس بنگلے پر پہنچا تھا۔"

"ظاہر ہے' جب میں شیروانی کے بندوں کی ایسی تیسی کرکے اس بنگلے سے نکلا تھا تو اس کارروائی کی اطلاع شیروانی تک پہنچنا ہی تھی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور مجھے یقین ہے' یہ اطلاع مراد ہی نے شیروانی تک پہنچائی ہوگی کیونکہ عمران اور شہبازی کو تو میں نے اس قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔"

"کسی حد تک تمہاری بات درست ہے۔" وہ بدستور نفرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم بنگلے پر جو گل کھلا کر گئے تھے اس کی مکمل رپورٹ مراد ہی نے باس کو دی تھی لیکن اس سے پہلے باس کو اس معاملے کی خبر ہوچکی تھی۔"

"وہ کس طرح......؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا شیروانی نے دن میں کوئی خواب دیکھ لیا تھا......؟"

"تم میری بندشیں کھولو' پھر آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اس کے چہرے پر اذیت کے آثار ابھرے۔ "نائیلون کی ڈوری میرے بدن کے اندر دھنسی جارہی ہے۔"

"تم سمجھ لو کہ یہ کسی ڈرامے کی شوٹنگ ہورہی ہے اور تمہیں جھوٹ موٹ ستون کے ساتھ باندھا ہوا دکھایا جارہا ہے۔" میں نے اس کے زخموں پر نمک کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ "اس تصور کے ساتھ تمہاری تکلیف میں بڑی حد تک کمی واقع ہوجائے گی۔"

"نہیں سوچ سکتا ایسا......" وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ شوٹنگ نہیں ہورہی بلکہ تم لوگوں نے حقیقت میں مجھے کڈنیپ کرکے اس ٹارچر سیل میں باندھ رکھا ہے۔ نائیلون کی یہ رسیاں تیز دھار چھریوں کی مانند میرے گوشت کو کاٹ رہی ہیں۔ اگر تم میری بندشیں کھول دو تو میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا' سب کچھ......!"

"یہ بندشیں تو نہیں کھل سکتیں۔" میں نے سفاکی سے کہا۔ "تمہیں اسی حالت میں رہتے ہوئے سب کچھ بتانا ہوگا۔ میرا خیال ہے اس کنڈیشن میں تمہاری زبان زیادہ روانی سے چلے گی۔ تم جتنی جلدی اپنی کہانی بیان کرو گے، اتنی ہی آسانی سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاباش! اب شروع ہو جاؤ اور..... آغاز اس بات سے کرنا ہے کہ مراد کی رپورٹ سے پہلے شیروانی کو میری "شان دار کارکردگی" کی رپورٹ کس نے دی تھی؟"

"عارف نے......" اس نے بتایا۔

عارف میرے لیے ایک نیا نام تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ عارف کون ہے؟"

"عارف باس کا ایک خاص مخبر ہے۔" جنید خان نے طوعاً و کرہاً جواب دیا۔ "آج دن میں اس بنگلے سے جانے کے بعد باس نے عارف کو وہاں کی خفیہ نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ عارف خود کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتا۔ خاموشی سے کسی کونے کھدرے میں لگا اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اسی عارف نے تمہاری کارروائی کی رپورٹ باس تک پہنچائی تھی۔"

جنید خان کے انکشاف نے میرے ذہن میں پچھلی سہ پہر کے ایک منظر کو تازہ کر دیا۔ وہ عجیب وغریب منظر جو میری سمجھ میں آیا تھا اور نہ ہی مراد کی سمجھ میں۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں جنید خان سے استفسار کیا۔

"تم اس بندے کی بات تو نہیں کر رہے جو گرے سوزوکی ہائی روف میں بیٹھ کر اس بنگلے سے اڑن چھو ہو گیا تھا؟"

"بالکل..... تم صحیح جگہ پہنچ گئے ہو۔" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "میں اسی عارف کا ذکر کر رہا ہوں......"

"ٹھیک ہے، میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں۔" میں نے جنید خان کو ایک نئے انداز میں گھیرنے کی کوشش کی۔ "شیروانی کو اپنے مخبر خاص عارف کے ذریعے اس بنگلے پر رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع مل گئی تھی لیکن ان واقعات کی بناء پر فرحانہ کو تمہاری تحویل سے نکال کر کہیں اور کیوں شفٹ کیا گیا ہے......؟"

اس سے پہلے کہ جنید خان میرے سوال کا جواب دیتا، دوسری جانب سے ماجد کی آواز آئی۔ "باس اگر تمہارا شکار زیادہ پھڑپھڑا رہا ہو تو میں اسے قابو کرنے میں تمہاری مدد کروں؟"

"تم نے اسے پھڑپھڑانے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے۔" میں نے جنید خان پر نگاہ رکھتے ہوئے ماجد سے کہا۔ "بہرحال آجاؤ..... یہاں نئی نئی کہانیاں چل رہی ہیں تم بھی سنو اور انجوائے کرو۔"

اگلے ہی لمحے ماجد بھی گودام کے اس حصے میں پہنچ گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی جنید خان کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ میں نے جنید خان کے اس بے پناہ خوف کی وجہ جاننے کے لیے ماجد کی طرف دیکھا تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔

جنید خان کی وحشت کا سبب وہ تیز دھار استرا تھا جو ماجد نے اپنے ہاتھ میں بڑے خطرناک انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ استرے کا پھل گودام کے نیم روشن ماحول میں چاندی کی مانند چمک رہا تھا۔ گودام کے اندر بس، گزارے لائق ہی روشنی تھی۔ ایک بلب جل رہا تھا جس نے گودام کو اس حد تک اجال رکھا تھا کہ وہاں کے معاملات کو بہ آسانی ہینڈل کیا جا سکتا تھا۔

"کیا تم اس مرغے کا شیو بنانے کا ارادہ رکھتے ہو جو یہ استرا اٹھا رکھا ہے؟" میں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"شیو تو نہیں البتہ......" وہ خطرناک انداز میں جنید خان کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اس استرے کی دھار کو مرغے کی شہ رگ پر آزمانے کی کوشش ضرور کروں گا لیکن......" لمحاتی توقف کرکے اس نے میری جانب دیکھا۔ پھر بڑے معنی خیز انداز میں بولا۔

"لیکن وہ نئی نئی کہانیاں سننے کے بعد جن کے لیے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے۔"

میں نے نفرت آمیز انداز میں جنید خان کی طرف دیکھا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ "شروع ہو جاؤ......"

"میں بتا رہا تھا کہ......" وہ تھوک نگل کر اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے بولا۔ "جب باس کو تمہاری کارروائی کی رپورٹ ملی تو اس نے ہنگامی طور پر اپنے پروگرام میں چند تبدیلیاں کر لی تھیں۔ بنگلے پر میرا شوٹنگ کا اسکیجوئیل تو پہلے سے طے تھا۔ میں نے اس سلسلے میں باس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا، تم اپنا پروگرام کینسل نہیں کرو اور اسکیجوئیل کے مطابق شوٹنگ کے لیے بنگلے پر جاؤ مگر تھوڑی تاخیر سے جب تک مراد زخمی شہبازی کو کسی اسپتال پہنچا کر بنگلے کے حالات کو نارمل کر لے گا اسی لیے میں سہ پہر کے بجائے شام کو اپنے یونٹ کے ساتھ اس بنگلے پر پہنچا تھا۔"

"مجھے تمہاری شوٹنگ کے اسکیجوئیل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے رکھائی سے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ شیروانی نے فرحانہ کو تمہاری تحویل سے نکال کر کہیں اور شفٹ کیوں کیا...... اور کہاں؟"

جنید خان میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سہمی ہوئی نظر سے کبھی مجھے اور کبھی ماجد کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے خوف میں بھی مجھے چالاکی کا شائبہ دکھائی دیا۔ میں نے اس کی زبان سے سچ اگلوانے کے لیے ماجد سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے یہ مرغا آج صبح کی بانگ نہیں دے سکے گا۔ اس کے "اناللہ" ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے کہ تکبیر پڑھتے ہوئے اپنے استرے کی دھار چیک کرلو......"

"تم لوگ غلط کر رہے ہو...... بالکل غلط!" وہ جال میں پھنسے ہوئے کسی خوف زدہ درندے کی مانند بلبلایا۔ "اس کا خطرناک نتیجہ تمہیں بہت جلد بھگتنا پڑے گا۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں......"

"تم دوسروں کے لیے اہم ہو گے مگر ہماری نظر میں تمہاری حیثیت نالی کے کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔" ماجد نے آگے بڑھ کر خطرناک پھل والے استرے کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "ہم غلط کر رہے ہیں یا صحیح...... اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں کس نے دیا ہے اور...... یہ جو تم ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہو تو ان پر عمل تو تب کر سکو گے، جب تم یہاں سے زندہ سلامت باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکو گے۔ جتنا چاہو چلاؤ، تمہاری آواز اس گودام سے باہر نہیں جا سکتی اور...... نہ ہی تم اس وقت تک...... جب تک ہمارے سوالات کے صحیح اور کھرے جواب نہیں دے دیتے!"

"میں نے ابھی تک آپ لوگوں سے ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "پھر بھی تم میرے ساتھ اتنا برا سلوک کر رہے ہو۔"

"ہم اس سے بھی زیادہ برا سلوک کر سکتے ہیں تمہارے ساتھ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے رحمی سے کہا۔ "تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کس حد تک جا سکتے ہیں......!"

"دیکھو...... میری بات کا یقین کرلو......" وہ باری

باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "فرحانہ اب میری کسٹڈی میں نہیں ہے، باس نے تمہاری جنونی کارروائی کے نتیجے میں احتیاط برتتے ہوئے اس لڑکی کو کہیں اور شفٹ کر دیا ہے...... کہاں...... مجھے کچھ پتا نہیں......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"مراد نے باس کو بنگلے پر ہونے والی کارروائی کی رپورٹ تو دی تھی مگر چونکہ باس کو ان واقعات کی پہلے ہی خبر ہو چکی تھی لہٰذا وہ مراد کی طرف سے الرٹ ہو گیا تھا۔ یہ بات مراد جانتا تھا کہ فرحانہ میری تحویل میں ہے۔ باس کو شک ہو گیا کہ کہیں تم نے مراد کی زبان سے یہ راز اگلوا نہ لیا ہو اور فرحانہ کی تلاش میں تم میرے ٹھکانے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جاؤ۔ بس یہی سوچ کر باس نے فرحانہ کو کہیں اور منتقل کر دیا۔ تم لوگ میری بات کا یقین کرو یا نہ کرو مگر حقیقت یہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مراد پر شک ہونے کی وجہ سے فرحانہ کا ٹھکانہ بدل دیا گیا مگر تم خود اسی بنگلے پر شوٹنگ کرنے چلے آئے جہاں میں نے مارا ماری کی تھی۔ شیروانی کو اس بات کا خیال نہیں آیا......؟"

"میں باس سے سوال نہیں کر سکتا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

اس کی وضاحت میں صداقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چند لمحے اسے ٹٹولنے والی نظر سے دیکھا پھر کہا۔

"جنید خان! میں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں کہ فرحانہ اس وقت تمہاری تحویل میں نہیں اور نہ ہی تم اس کی موجودہ پوزیشن کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔ بس اتنا بتا دو کہ تم نے فرحانہ کو کس کے حوالے کیا تھا؟"

"شہزاد کے......" اس نے بتایا۔ "شہزاد دو آدمیوں کے ساتھ میرے ٹھکانے پر پہنچا تھا اور میں نے فرحانہ کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔"

"اور...... جب تم شوٹنگ میں مصروف تھے تو کس کی کال نے تمہیں سیٹ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بارہ چالیس پر تم ایک کال ریسو کرتے ہو اور شوٹنگ کو اپنے اسسٹنٹ کے حوالے کر کے تم افراتفری میں بنگلے سے نکل آتے ہو...... کون تھا وہ؟"

"وہ میرے ایک آدمی کی کال تھی۔" اس نے بتایا۔

"اس کا نام اصغر ہے۔"

"اصغر نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ تمہیں اپنا کام چھوڑ کر بھاگنا پڑا......؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... وہ......" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"باس! تم پیچھے ہٹ جاؤ۔" ماجد نے مجھ سے کہا پھر خطرناک انداز میں جنید خان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اس استرے کی پیاس جنید خان کے ناپاک لہو ہی سے بجھے گی!"

"نہیں نہیں......" جنید خان دہشت کے مارے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسی حرکت نہیں کرنا...... پلیز۔"

"تم نے بزرگوں سے سنا نہیں کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔" ماجد استرا بدست جنید خان کے قریب پہنچ گیا۔

"میں ایسی ویسی حرکت نہیں کروں گا تو تمہاری زبان میں برکت کیسے پیدا ہوگی...... تمہارے اندر سے ہمارے سوالات کے جوابات کیسے برآمد ہوں گے......؟"

"بتاتا ہوں...... میں سب بتاتا ہوں۔" وہ لرزتی

ہوئی آواز میں بولا۔

زندگی ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے۔ موت کا خوف بڑے سے بڑے سورما کو بھی سچ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان لمحات میں جنید خان کی بھی تھی۔ اس نے اپنی موت کو استرے کی دھار پر چمکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"کپکپاتے ہی جاؤ گے یا منہ سے کچھ پھوٹو گے بھی؟" ماجد نے دھمکی آمیز انداز میں استرے کو اس کی شہ رگ کے نزدیک لے جاتے ہوئے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے اگر ماجد ایک لحہ بھی جنید خان کے قریب موجود رہا تو اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا اور میں فی الحال ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کوئی اہم انکشاف کرنے جا رہا تھا۔ یہ انکشاف سنے بغیر میں اسے جان سے کیسے گزرنے دیتا......!

"ماجد! تم واپس جاؤ۔" میں نے جنید خان کا خوف کم کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں خود ہی اس سے پوچھ تاچھ کرتا ہوں۔ اگر کسی مرحلے پر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں آواز دے لوں گا۔ اگر تم چند لمحے اور یہاں موجود رہے تو یہ اپنے کپڑے خراب کر لے گا اور میں اچھے خاصے ماحول کو بدبودار ہوتے نہیں دیکھ سکتا......"

"اوکے......" ماجد نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

ماجد کے وہاں سے ہٹنے کے بعد جنید خان نے سکھ کی سانس لی پھر جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

"تمہارا ساتھی تو پورا جلاد ہے۔"

"اس سے پہلے کہ وہ جلاد استرے سمیت واپس آ جائے اور میں اس بار اسے روک نہ پاؤں تم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شروع ہو جاؤ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اصغر نے مجھے ایک تشویش ناک خبر دی تھی۔" جنید خان بتانے لگا۔ "دراصل تمہارا ساتھی وہ چترالی بندہ بھی میری کسٹڈی میں تھا۔ میں نے فرحانہ اور خوش ولی کو دو الگ مقام پر قید کر رکھا تھا۔ خوش ولی شدید زخمی تھا۔ آج دن میں وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے......"

"کیا بک رہے ہو......؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں چنگھاڑ اٹھا اور بے ساختہ میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن کی جانب بڑھے۔

"ایک منٹ ایک منٹ۔" وہ فریادی لہجے میں بولا۔ "میری بات تو پوری ہونے دو...... تمہارا ساتھی زندہ ہے اور...... آزاد بھی......"

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ جنید خان نے خوش ولی کا ذکر کچھ ایسے تشویش ناک انداز میں کیا تھا کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا اور میں جنید خان کی گردن مروڑنے کے لیے مچل اٹھا تھا۔

"ہاں بولو......" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم خوش ولی کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے خوش ولی کو اصغر کی نگرانی میں رکھا ہوا تھا اور اسی نے بتایا تھا کہ قیدی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا ہے مگر یہ اصغر کی غلط فہمی تھی۔" جنید خان نے تلے الفاظ میں بتانے لگا۔ "حقیقت یہ ہے کہ قیدی گہری بے ہوشی میں چلا گیا تھا۔ لہٰذا اسے مردہ سمجھتے ہوئے ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ آج آدھی رات کے بعد ایک گاڑی خوش ولی کی لاش کو لے کر اسی بنگلے پر پہنچنے والی تھی جہاں میں شوٹنگ کر رہا تھا۔ وہاں ایک لاش پہلے سے موجود تھی۔ وہ گاڑی ان دونوں لاشوں کو لے جا کر کہیں ٹھکانے لگا دیتی مگر گڑبڑ ہو گئی......"

"کیسی گڑبڑ......؟" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما تو میں نے فوراً سوال کردیا۔
"تمہارا ساتھی زندہ تھا......" جنید خان نے بتایا۔ وہ دانستہ ایسے جملے استعمال کررہا تھا کہ میرے غیظ وغضب سے محفوظ رہ سکے۔ "جب گاڑی تمہارے ساتھی کی لاش کو لے کر بنگلے کی جانب روانہ ہونے والی تھی تو وہ......یعنی تمہارا ساتھی اچانک اٹھ کر ایک جانب دوڑ پڑا۔ اصغر اور اس کے ساتھی کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی "لاش" بھی یوں اٹھ کر کہیں فرار ہوسکتی ہے۔ چند لمحات کے لیے تو وہ سناٹے میں آگئے تھے اور جب انہیں ہوش آیا تو قیدی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوکر تاریکی کا حصہ بن چکا تھا۔ انہوں نے قیدی کو گردونواح میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اصغر نے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور...... میں شوٹنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا تھا......"
"پچھلے ایک گھنٹے میں تمہارے منحوس تھوبڑے سے صرف ایک کام کی بات نکلی ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور وہ یہ کہ میرا ساتھی خوش ولی نہ صرف زندہ ہے بلکہ تم لوگوں کی قید سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہوچکا ہے۔"
"جو سچ تھا' وہ میں نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہیں بتادیا ہے۔" وہ گویا احسان جتانے والے انداز میں بولا۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اب تو تم مجھے چھوڑ دو۔"
"میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں بلکہ ماجد کے ہاتھوں کہیں مناسب سی جگہ پر چھڑوادوں گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پہلے اپنا سیل فون میرے حوالے کرو۔"
"سیل فون!" وہ چونکا۔ "سیل فون تو تمہارے ساتھی نے بنگلے سے باہر نکلتے ہی مجھ سے چھین لیا تھا۔ وہ اسی کے پاس ہے مگر......" لمحاتی توقف کرکے اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "تم میرے سیل فون کا کیا کروگے؟"
"آج کل مجھے سیل فونز کا اچار ڈالنے کا بڑا شوق ہورہا ہے۔" میں نے جنید خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کئی لوگوں کے سیل فونز تیل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے فون کو بھی یہی شرف بخشنا چاہتا ہوں۔"
میری باتیں خاک اس کے پلے نہیں پڑی ہوں گی...... وہ تعجب خیز نظر سے یک ٹک مجھے تکے جارہا تھا۔ میں نے اس کے "دیکھنے" پر لعنت بھیجی اور ماجد کے پاس آگیا۔
میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ماجد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر وہ بھی خوش ہوا تھا کہ میرا یار خوش ولی زندہ اور آزاد تھا۔ اس نے مجھے مبارک باد بھی دی۔ میں نے کہا۔
"تم نے جنید خان کا سیل فون اپنے قبضے میں کررکھا ہے۔ اس پر کسی کی کال تو نہیں آئی؟"
"میں نے سیل فون اس سے چھیننے کے بعد آف کردیا تھا۔" ماجد نے بتایا۔ "ابھی آن کرکے دیکھتا ہوں' وہاں کی صورت حال کیا ہے۔"
"فون آف ہے تو کوئی مس کال تو شو ہوگی نہیں البتہ میسجز ریسیو ہوجائیں گے لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تم جنید خان کا سم کارڈ اپنے فون میں لگا کر اس کی فون بک کاپی کرلو۔ اس طرح بہت سے اہم نمبروں تک ہمیں رسائی حاصل ہوجائے گی۔ عین ممکن ہے' انہی نمبروں میں ندیم شیروانی کا کوئی نمبر ہمارے ہاتھ لگ جائے۔"

"گڈ آئیڈیا......" ماجد نے تعریفی نظر سے میری جانب دیکھا۔ "جنید خان اس واقعے کے بعد زیادہ سے زیادہ اپنا نمبر تبدیل کرسکتا ہے' ڈھیروں لوگوں کے نمبر تو وہی رہیں گے نا!"
ماجد نے پہلے جنید خان کے سم کارڈ میں محفوظ نمبروں کو اپنے فون میں محفوظ کیا پھر اس کے سیل فون کے نمبروں کو بھی بڑی کامیابی سے اپنے پاس کاپی کرلیا۔ اس کارروائی کے دوران میں تین چار میسجز فلیش ہوچکے تھے جن میں اصغر کے میسجز کے علاوہ ایک میسج شہزاد کی طرف سے بھی تھا۔ ہم دونوں نے وہ میسجز پڑھ ڈالے۔ اصغر تو اپنی نالائقی اور غیر ذمے داری کے داغ کو دھونے کے لیے الفاظ کا زوداثر ڈٹرجنٹ استعمال کرنے میں لگا ہوا تھا اور شہزاد کے میسج سے گہری تشویش اور گھمبیرتا جھلکتی تھی۔ یہ ایک طویل ایس ایم ایس تھا۔
"جنید خان! تمہارا فون مسلسل آف مل رہا ہے ہمیں اسد کے ساتھی کے فرار ہونے کی اطلاع مل گئی ہے اور ہم نے یہ بھی پتا چلا لیا ہے کہ تم شوٹنگ چھوڑ کر جب افراتفری میں بنگلے سے نکلے تھے تو ایک اجنبی دراز قامت' داڑھی والا شخص بھی تمہاری گاڑی میں سوار ہوگیا تھا۔ اسی بنگلے میں اسد کی موجودگی کے آثار بھی ملے ہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ وہ داڑھی والا اسد ہی کا ساتھی ہے۔ بہرحال' ہم بہت جلد حالات پر قابو پالیں گے۔ پہلی فرصت میں مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔"
"اس مرغے کا کیا کرنا ہے؟" میں نے ماجد سے پوچھا۔ "یہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔ آگے بڑھنے کے لیے ہمیں کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہوگا......"
"تم صرف آدھا گھنٹا مجھے دو۔" ماجد گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں اس کو کہیں ٹھکانے لگا کرآتا ہوں۔ اب اس کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔"
"یہاں رہنا بھی مناسب نہیں اور آئندہ چار چھ گھنٹے تک ہوش میں آنا بھی ٹھیک نہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اسد۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں اس سے صرف اتنا پوچھ لوں کہ خوش ولی کس مقام اور علاقے میں ان کی قید سے فرار ہوا ہے تاکہ ہمیں خوش ولی کو ڈھونڈنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔ اس کے بعد میں اس صحت مند مرغے کو طویل نیند میں پہنچادوں گا......"
میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

❀......❀......❀

اگلے آدھے گھنٹے میں بہت سے کام ہوئے جن میں زیادہ کردار ماجد ہی کا تھا۔ اس معاملے میں آدھی رات کے بعد سے اس نے پوزیشن سنبھال رکھی تھی اور مجھے کم سے کم "زحمت" دے رہا تھا اور ان تمام تر کارروائیوں میں بشارت اس کا برابر کا ساتھ دے رہا تھا۔ ماجد نے بالکل ٹھیک کہا تھا' بشارت اس کے بھروسے کا آدمی ہے۔ اس نوعیت کی سنگین سرگرمیوں میں کسی ایرے غیرے پر تو کسی بھی صورت بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔
ماجد نے بڑی آسانی سے جنید خان کی زبان سے یہ اگلوالیا تھا کہ خوش ولی کس مقام پر ان لوگوں کی کسٹڈی سے فرار ہوا تھا۔ یہ مقام سہراب گوٹھ اور ابوالحسن اصفہانی روڈ کے درمیان واقع تھا۔ ان لوگوں نے خوش ولی کو مردہ سمجھ لیا تھا اور کبھی بھول کر بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ کوئی لاش بھی فرار کی راہ اختیار کرسکتی ہے۔ اب یہی سوچا جاسکتا تھا کہ طویل بے ہوشی سے ہوش میں آنے کے بعد خوش ولی نے کچھ زیادہ ہی

عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور خود کو مردہ ہی ظاہر کیا تھا پھر جب اسے موقع ملا تو اس نے ان لوگوں کی قید سے بھاگنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔ یہ میرا قیاس یا یوں کہہ لیں کہ اندازہ تھا۔ حقیقت کیا تھی' یہ تو خوش دلی سے ملاقات پر ہی سامنے آسکتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آج دن میں کسی وقت ہماری ملاقات انتہائی متوقع تھی۔

ماجد نے جنید خان کو ''سی آف'' کرنے سے پہلے اس کے بازو میں ایک انجیکشن دیا تھا جو یقیناً کوئی خواب آور انجیکشن تھا کیونکہ اس انجیکشن کے دو چار منٹ بعد ہی جنید خان کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور اس کا بدن بھی ڈھلک گیا تھا۔ ماجد' بشارت کی مدد سے اسے کہیں ''ڈسپوز'' کرنے لے گیا تھا۔ ماجد نے مجھے اسی ''ٹھکانے'' پر رکنے کو کہا تھا۔ جب تک ماجد جنید خان سے تفتیش کررہا تھا' اس دوران میں' میں نے وہ تمام اہم نمبرز اپنے سیل فون میں منتقل کرلیے تھے جو ماجد نے جنید خان کے فون سے کاپی کیے تھے۔ ماجد کے جانے کے بعد میں اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

جنید خان کے سیل فون سے حاصل ہونے والے نمبرز میں سے زیادہ تر کا تعلق شوبزنس کے افراد سے تھا جن میں میل اور فی میل آرٹسٹ سرفہرست تھے۔ میں نے ایک ایک نمبر کو چیک کیا مگر مجھے کہیں بھی شیروانی کا نمبر نظر نہیں آیا۔ ہاں' شہزاد کا نمبر میری نگاہ میں آگیا تھا۔ یہ وہی نمبر تھا جو میرے پاس پہلے سے سیو تھا۔ یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ جنید خان کے پاس ندیم شیروانی کا کانٹیکٹ نمبر نہ ہو۔ جنید خان' شیروانی کے لیے ایک اہم شخص تھا جبھی اس نے میرے عزیزوں کو اس کی کسٹڈی میں دیا تھا۔ کل صبح یعنی لگ بھگ دوپہر کے وقت جب میں اس آسیبی بنگلے کی ''سیر'' میں مصروف تھا تو ڈرائنگ روم میں' میں نے ندیم شیروانی' اس کے امریکی دوست جوزف اور دیسی گینڈے مرزا یاسین بیگ کی باہمی گفتگو بھی سنی تھی۔ اس دوران میں جنید خان کو فون کرکے فرحانہ کو بنگلے پر لانے سے منع کیا گیا تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ جنید خان نے حفظ ماتقدم کے طور پر ندیم شیروانی کا نمبر کسی اور ڈمی نام کے ساتھ فیڈ کررکھا ہو۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔ بہرحال' مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ میرا یار خوش دلی نہ صرف یہ کہ زندہ تھا بلکہ وہ دشمنوں کی قید سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہوچکا تھا۔

میرے جی میں آئی کہ عاطف صاحب کو فون کرکے تازہ ترین حالات کی خبر دوں۔ وہ اس معاملے میں حد سے بڑھ کر میرا ساتھ دے رہے تھے۔ میں نے ان کے بڑے بھائی خالد رشید کے بزنس کو تباہ ہونے سے بال بال بچایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ عاطف رشید صاحب میری اس کارکردگی' بلکہ شان دار کارکردگی کے باعث مجھ سے بے دریغ تعاون کررہے تھے۔ میں نے جو کچھ کیا تھا' اسے اپنا فرض سمجھتے ہوئے کیا تھا۔ وہ فارماسیوٹیکل کمپنی ایک ایسا درخت تھا جہاں سے میرا رزق نکلتا تھا۔ اس درخت کی حفاظت' نگہداشت اور آب یاری مجھ پر لازم تھی۔ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو وہ کفران نعمت بہ الفاظ دیگر نمک حرامی ہوتی اس کے جواب میں عاطف صاحب میرے ساتھ جو کچھ کررہے تھے یہ ان کے عالی ظرف ہونے کا ثبوت تھا۔

میں یہ سوچ کر عاطف صاحب کو فون کرنے سے باز آ گیا کہ رات کے آخری پہر انہیں ڈسٹرب کرنا نامناسب ہوگا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ میں انہیں ایک مختصر سا میسیج کردیتا ہوں۔ صبح وہ

جب سو کر اٹھیں گے تو خود ہی مجھ سے رابطہ کرلیں گے۔

میں نے ''رائٹ میسیج'' میں پہنچ کر ابھی ٹائپنگ شروع نہیں کی تھی کہ میرا سیل فون تھرتھرا اٹھا۔ یہ عاطف صاحب کی کال تھی۔ میں نے فوراً کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو سر......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں اسد......!'' وہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں مخاطب ہوئے۔ ''کیا پراگریس ہے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس آگاہی میں میری اور ماجد کی تمام تر کارکردگی کا ذکر شامل تھا۔ آخر میں' میں نے پوچھ لیا۔

''سر...... آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟''

''میں جاگ تو نہیں رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھا ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اے سی چلتے چلتے اچانک بند ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ بہرحال' اب سب ٹھیک ہے......'' لمحاتی توقف کرکے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جاگ گیا تھا تو سوچا' تم لوگوں سے رابطہ کرکے ادھر کی خیریت معلوم کرلوں۔''

ان دنوں موسم خشک اور اچھا خاصا خوشگوار تھا مگر جن لوگوں کو ''اے سی'' کی عادت ہوتی ہے وہ اس کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتے ہیں......!

''بہت اچھا کیا آپ نے سر۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ کو فون کرنے کے بارے میں سوچا تھا پھر اس خیال سے باز آ گیا کہ اتنی رات گئے آپ کو ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''اب آپ لوگوں کا آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟'' عاطف صاحب نے پوچھا۔

''ماجد' جنید خان کو ٹھکانے لگا آئے تو پھر سوچتے ہیں' آگے کیا کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھے اپنی واپسی تک اسی گودام میں رکنے کو کہا ہے۔''

''ماجد' جنید خان کو کس چیز میں ٹھکانے لگانے گیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اسی کی گاڑی میں۔'' میں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے......'' وہ معتدل انداز میں بولے۔ ''میرا خیال ہے' وہ جنید خان کے ساتھ ہی اس کی گاڑی کو بھی ٹھکانے لگا کر ہی آئے گا۔ خیر' آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اب آپ دونوں ماجد کے فلیٹ پر جاکر اطمینان سے سوجاؤ۔ تم لوگ ایک بھرپور نیند لو گے تو فریش ہوجاؤ گے۔ آج دن میں پتا نہیں' کون کون سے ہنگامے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر کچھ دیر سو لو گے تو زیادہ شدومد کے ساتھ اپنی عزیزہ کو تلاش کرسکو گے۔''

اگرچہ فرحانہ کے ساتھ میرا کوئی بھی رشتہ نہیں تھا مگر عاطف صاحب نے اسے میری عزیزہ کہہ کر ایک ''رشتہ'' جوڑ دیا تھا۔ یقیناً وحید صاحب اور خوش دلی کی زبانی انہیں میرے اور فرحانہ کے تعلق کا علم ہوگیا ہوگا جبھی انہوں نے ''پروین'' کے بجائے فرحانہ کے لیے ''عزیزہ'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

''سر! یہ تو ٹھیک ہے کہ فرحانہ فی الوقت مجھ سے دور ہوگئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر خوش دلی کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں کیسے پرسکون نیند

سو سکتا ہوں......!''

''اسد! میں آپ کے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''آپ دونوں کی دوستی بھی میرے سامنے ہے۔ آپ خوش ولی کے لیے جتنے پریشان ہو رہے ہیں مجھے اس کا اندازہ ہے مگر آپ خوش ولی کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ابھی تلاش کرنے سے وہ ہاتھ آنے والا نہیں۔ جنید خان کے آدمیوں نے اسے کم تلاش نہیں کیا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں' اس نے بڑی ذہانت سے خود کو روپوش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس وقت جہاں بھی ہوگا' محفوظ ہوگا اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ سب سے پہلے آپ ہی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب اسے آپ کا نمبر نہیں ملے گا تو اس کی دوسری ترجیح میں یا اس کے گھر والے ہوں گے۔ جب وہ مجھ سے رابطہ کرے گا تو میں اس کے معاملے کو سنبھال لوں گا۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ خوش ولی میری آرگنائزیشن میں کام کرتا ہے۔ وہ میری ذمے داری ہے اسد......''

''سر! میں آپ کے ان مخلصانہ اور ہمدردانہ جذبات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن سر...... خوش ولی کو جنید خان کے بندوں کی کسٹڈی سے فرار ہوئے لگ بھگ تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرا سیل فون میرے پاس نہیں رہا' وہ مجھ سے رابطہ نہیں کرسکتا کیونکہ میرا نیا نمبر اس کے پاس نہیں ہے مگر وہ آپ کو تو کانٹیکٹ کرسکتا تھا......''

''اس نے اگر ابھی تک مجھے کانٹیکٹ نہیں کیا تو کرلے گا۔'' وہ معتدل انداز میں بولے۔ ''اگر آپ کے پاس آپ کا فون نہیں رہا تو یقیناً خوش ولی کو بھی اس کے فون سے محروم کردیا گیا ہوگا۔ وہ جب بھی موقع دیکھے گا مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ میں رات کو اپنا فون آف نہیں کرتا ہوں۔''

''سر! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ زخموں سے چور خوش ولی کہیں بے ہوش پڑا ہو۔ گہری بے ہوشی میں اس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''میری ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اسد اللہ!'' وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''انسان کو بہت زیادہ چیمپئن بننے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ معاملات کو خدا پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ جنید خان کے آدمی خوش ولی کو مردہ سمجھ کر کہیں ٹھکانے لگانے لے جارہے تھے۔ اگر اسے ہوش نہ آتا تو بے خبری میں پتا نہیں کس بھیانک موت کے منہ میں چلا جاتا......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھمے پھر اضافہ کرتے ہوئے بولے۔

''قدرت کو خوش ولی کی زندگی منظور ہے۔ وہ دشمنوں کے ہر ظلم و ستم کو سہہ کر بھی زندہ رہا ہے۔ نہ صرف زندہ رہا ہے بلکہ ان کی قید سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہوچکا ہے۔ اگر اس کے دن پورے ہوچکے ہوتے تو یہ معجزہ ہرگز رونما نہیں ہوتا۔ مسٹر اسد! میری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان موت کے قریب سے ہوکر واپس آجائے تو اس کے زندہ بچ جانے میں قدرت کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ قدرت اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔''

''سر! آپ نے اتنی بڑی بات کردی ہے کہ میں اس کے آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خوش ولی کے معاملے کو اسی وقت آپ کے سپرد کیا۔ اب میں پوری توجہ سے فرحانہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میرے پاس چند اہم نمبرز آگئے ہیں' کہیں نہ کہیں سے کوئی سراغ تو مل ہی جائے گا۔''

''وش یو گڈ لک!'' وہ خلوص دل سے بولے۔ ''میں خوش ولی کے بارے میں آپ کو اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔ ماجد اس وقت تک آپ کے ساتھ رہے گا جب تک آپ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوجاتے۔''

''تھینک یو سر......'' میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''اوکے...... ٹیک کیئر......!'' انہوں نے کہا۔

سیلولر رابطہ منقطع ہوا تو میں عاطف صاحب کے کہے ہوئے الفاظ کی گہرائی میں ڈوب گیا۔ واقعی انہوں نے بڑی اہم اور انمول بات کی تھی۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں اس قدر کھو کر رہ گئے ہیں کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہم خدا سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ بلکہ ہم نے اپنے معمولات میں خدا کی ذات کو نظرانداز کرنا شروع کردیا ہے۔ ہمارے ہاتھ سے اگر کوئی قابل تعریف کام ہوجاتا ہے تو اس کا کریڈٹ لینے میں ہم کسی سستی و کاہلی سے کام نہیں لیتے اور سب کو بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ یہ کارنامہ ہم نے سرانجام دیا ہے لیکن اگر ہم کوئی کام بگاڑ بیٹھتے ہیں اور اس بگاڑ کی نمو داری میں سراسر ہماری ہی غلطی ہوتی ہے تو ہم بڑی چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بری الذمہ ہوتے ہوئے منہ لٹکا کر کہہ دیتے ہیں کہ کیا کریں بھائی! اللہ کی مرضی یہی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ فائدہ اور نقصان کا مالک اللہ ہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اللہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور اپنی مخلوق کو ستر ماؤں سے بھی زیادہ چاہتا ہے' وہ ہمارے نقصان کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے۔ یہ سب ہمارے ذہنوں کا فتور اور اعمال کی سزا ہے کہ ہم سراسر گھاٹے میں ہیں۔ ہم نے کبھی اللہ کو اپنی شہ رگ سے زیادہ قریب سمجھا ہی نہیں۔ اگر ایسا محسوس کرلیتے تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ اللہ کی قسم! جو لوگ خدا کو واقعی اپنی شہ رگ سے قریب محسوس کرتے ہیں گناہ ان سے سو میل دور بھاگتے ہیں اور شیطان ان سے پناہ مانگتا ہے۔ بڑے افسوس اور دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس روئے زمین پر جتنے مسلمان ہیں وہ اگر ایک اس یقین کے ساتھ کہ اللہ ان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ بنالیں تو اس کرہ ارض کو اپنی گرفت میں جکڑ سکتے ہیں مگر ہو کیا رہا ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ دوسری قومیں جو سلوک کررہی ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اللہ سے کوئی بھی گلہ شکوہ کرنے سے پہلے اگر ہم اپنے گریبان میں جھانک لیں تو سارے مسئلے خود بہ خود حل ہوجائیں گے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ کون حل کرے گا...... دیانت داری اور سچائی کے ساتھ اپنے گریبان میں جھانکنے کا مسئلہ......!

میرے سیل فون کا کلاک تین پینتالیس کا وقت بتارہا تھا۔ میں شاید ہی کبھی اتنی رات گئے تک جاگا ہوں گا۔ مگر پچھلی دو راتوں سے میرے ساتھ جو کچھ ہورہا تھا وہ ایک نیا' سنسنی خیز اور اذیت ناک تجربہ تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس ناخوش گوار تجربے سے گزر رہا تھا۔

اچانک میرا جی مچلا کہ گھر فون کروں۔ شام میں عاطف صاحب کے فون سے میں نے امی اور شازیہ سے بات کی تھی۔ انہیں اپنے حالات سے باخبر کیا تھا اور ان کے حالات سے آگاہی حاصل کی تھی۔

یہ جان کر مجھے دلی افسوس ہوا تھا کہ فرحانہ کی جدائی میں انکل خالق اسپتال پہنچ گئے تھے۔ اللہ ہی جانے اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوگی۔ ہارٹ اٹیک کوئی معمولی مرض تو نہیں ہوتا۔ شازیہ نے مجھ سے کہا تھا

کہ وہ پوری رات جاگ کر میری کامیابی کے لیے دعا کرے گی۔ یہی سوچ کر میں نے گھر کا نمبر ڈائل کر دیا کہ اگر شازیہ واقعی جاگ رہی ہوگی تو اس سے فرحانہ کے باپ کی طبیعت کا پوچھ لوں گا۔

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ فرحانہ اپنی ہوشیاری کی وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی تھی۔ اگر وہ خود کو شازیہ ظاہر نہ کرتی تو اس وقت گھر میں سکون سے بیٹھی ہوتی' اس کی جگہ شیروانی کے بندے شازیہ کو اٹھا لے جاتے مگر اس سب کے باوجود بھی میں اس معاملے میں خود کو بری الذمہ نہیں سمجھتا تھا' فرحانہ نے جو کچھ کیا تھا وہ شازیہ کی دوستی اور محبت میں کیا تھا اور درحقیقت یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ نہ میری شیروانی سے دشمنی ہوتی' نہ وہ الو کا چرخہ مجھے نیچا دکھانے کے لیے میری اکلوتی بہن کو اٹھوانے کا منصوبہ بناتا اور نہ ہی شازیہ کے مغالطے میں فرحانہ کو اغوا کرلیا جاتا۔ اس سارے فساد کی جڑ میری ہی ذات تھی اور اب...... مجھے ہی ان معاملات کو سنبھال کر کسی منطقی انجام تک پہنچانا تھا۔

میں نے دو تین مرتبہ گھر کا نمبر ٹرائی کیا مگر دوسری جانب کال ریسیو نہیں کی گئی۔ امی کا اتنی رات گئے جاگنا تو ممکن نہیں تھا پہلے تو میں نے یہی سوچا کہ اگر شازیہ جاگ رہی ہے تو ہو سکتا ہے' اجنبی نمبر دیکھ کر فون اٹینڈ نہ کر رہی ہو لیکن ایسا ایک بار تو ممکن تھا مگر جب میں نے تین مرتبہ ٹرائی کیا اور کال ریسیو نہیں کی گئی تو میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ شازیہ بھی گہری نیند میں ہوگی۔ میں نے اس مہم کو اگلے دن پر چھوڑ دیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ماجد اور بشارت واپس آ گئے۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ ماجد نے آتے ہی مجھ سے کہا۔

''اسد! تم آؤ میرے ساتھ۔ اب ہمیں یہاں نہیں رکنا۔''

''جنید خان کا کیا ہوا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''گھر پہنچ کر بتاؤں گا۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''گھر......'' میری حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ ''کون سے گھر...... کس کے گھر؟''

''میرے فلیٹ پر...... اور کس کے گھر۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی۔''

میں نے اس کے ساتھ گودام سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''عاطف صاحب کی کال آئی تھی۔ میں نے انہیں صورت حال کی رپورٹ دے دی ہے۔''

''تم سے بات کرنے کے بعد انہوں نے مجھے بھی فون کیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں انہی کے کہنے پر تمہیں اپنے ساتھ فلیٹ پر لے کر جا رہا ہوں۔''

اس کے بعد میں نے ماجد سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے انداز سے میں نے بڑے واضح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ وہ سردست بات کرنے کے موڈ میں نہیں۔ میں جانتا تھا' ماجد عاطف رشید کے لیے بڑے بھروسے کا بندہ تھا اور میں عاطف رشید پر اندھا اعتماد کرتا تھا لہٰذا آنکھیں بند کر کے ماجد کے ساتھ کہیں بھی جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی پھر پچھلے پانچ چھ گھنٹے میں اس نے جس عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اس کے قابل اعتبار ہونے کا کھلا ثبوت تھا۔

میں ماجد کے ساتھ اس کی سرخ بائیک ہنڈا سی جی۔ ون ٹو فائیو پر بیٹھا اور صدر سے طارق روڈ کی جانب روانہ ہوگیا۔ سی جی۔ ون ٹو فائیو کی ایک اپنی اڑان ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا' میں کسی بائیک پر نہیں بلکہ کسی فلائنگ ہارس پر سوار ہوں۔ خنک فضا

میں یہ سفر خاصا رومینٹک اور مہم جویانہ محسوس ہو رہا تھا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے صبح میں طارق روڈ پر ماجد کے فلیٹ میں تھا۔ شام میں عاطف صاحب کے آفس سے نکلنے سے پہلے انہوں نے مجھے اچھی طرح کھلایا پلایا تھا مگر اس کے بعد سے میں نے جتنی دوڑ دھوپ کی تھی اس کی وجہ سے میں اس وقت اچھی خاصی بھوک محسوس کر رہا تھا اس لیے جب ماجد نے مجھے صلح ماری تو میں انکار نہیں کرسکا۔ لائٹ ریفریشمنٹ کے بعد اس نے مجھے پین کلر میڈیسن بھی کھلا دی تھی۔ شام میں عاطف صاحب نے بھی مجھے دوا کھلائی تھی جس کی ایک خوراک میں ساتھ لے آیا تھا۔ اب یہ تمام ملا کر میں نے حلق کے نیچے اتار لی تھیں۔ میرے گھائل بازو سے درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں تاہم نیند کے خمار نے مجھے اس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دی اور میں سونے کے لیے بیڈ پر دراز ہوگیا۔

ویسے یہ بڑی عجیب اور حقیقت پر مبنی بات ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ ایسے ہی کوئی بھی دماغی کیفیت اپنے سے چھوٹی کیفیت کو نگل جاتی ہے۔ جب میں شیروانی اینڈ کمپنی کے ہتھے چڑھا تھا تو مجھے سب سے پہلا تحفہ کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگنے والی کسی آہنی شے کی ضرب کا ملا تھا۔ ظاہر ہے' میں نے اس تحفے کے ''اثرات'' کو ہوش میں آنے کے بعد بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ ابھی اس تحفے کی ''خوشی'' پوری طرح زائل نہیں ہوئی تھی کہ آدھی رات کو ایک بے آواز فائر نے مجھے بائیں بازو کے ٹرائی سیپس مسل کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دی تھی۔ اس تکلیف کے سامنے میں کھوپڑی کی تکلیف کو بھول گیا تھا اور اب نیند کا خمار بازو کی تکلیف پر حاوی آ رہا تھا۔ نیند کسی مہربان محبوبہ کی آغوش کی مانند ہوتی ہے جس کی پناہ میں جا کر انسان ہر غم وفکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ بستر پر لیٹنے کا تو مجھے یاد ہے' اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ میں کب اور کیسے اس مہربان محبوبہ کے نظر فریب حسن سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے خود فراموشی کی دنیا میں کھو گیا تھا۔



اگلی صبح خاصی سہانی اور چمک دار تھی۔

میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے نگاہ وال کلاک پر گئی۔ کلاک دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں نے کم وبیش پانچ گھنٹے کی نیند لی تھی۔ میں نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور بستر چھوڑ دیا۔ گزشتہ رات کی ساری تھکاوٹ اور کسلمندی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ ماجد مجھے کہیں نظر نہیں آیا تو میں اس کی تلاش میں فلیٹ کا معائنہ کرنے لگا۔

وہ دو کمرے کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ یعنی ایک بیڈ اور ایک ڈرائنگ یا پھر چھوٹا سا کامن۔ یہ فلیٹ طارق روڈ کے کمرشل ایریا کی ایک بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر واقع تھا جہاں ماجد اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس پراسرار شخص کے بارے میں مجھے بہت سی تفتیش کرنا تھی مگر ابھی ایسے کاموں کا نہ تو وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ رات ماجد نے مجھے بیڈروم میں پہنچانے کے بعد خود ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا۔ وہ وہاں ایک صوفے پر رات گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں اپنے گھر میں قالین پوش فرش پر سونے کا عادی تھا لیکن گزشتہ رات ماجد کے اصرار پر میں نے بیڈ سنبھال لیا تھا اور اس کا یہ اصرار خاص طور پر میرے بازو کے زخم کی وجہ سے تھا۔

میں واپس بیڈروم میں آیا تو سیل فون کے قریب ہی مجھے ایک پرچہ پڑا ہوا ملا۔ رات ہم دونوں نے سیل

فون آف کرکے چارجنگ پر لگادیے تھے۔ میں سیل فون کو آن رکھنے کے موڈ میں تھا مگر ماجد کا مشورہ یہ تھا کہ اگر بھرپور نیند لینا ہے تو فون کو آف کرنا ضروری ہے۔ ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جو ہونا ہے وہ تو ہوکر ہی رہنا ہے۔ جب اتنا کچھ بھگت رہے ہیں تو مزید جو ہوگا اسے بھی بھگت ہی لیں گے۔

اب مجھے وہاں ماجد کا سیل فون نظر نہیں آرہا تھا اور جس پرچے کا میں نے ذکر کیا وہ میرے سیل فون کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اس پرچے کی تحریر کو پڑھا۔ ماجد نے لکھا تھا۔

''میں ناشتا لینے نیچے مارکیٹ تک جارہا ہوں۔ میری واپسی سے پہلے اگر تمہاری آنکھ کھل جائے تو فریش ہوجانا۔''

میں اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔ رات عاطف صاحب کے آفس میں میں نے ایک بھرپور شاور لیا تھا۔ نہانے کا جی تو اس وقت بھی چاہ رہا تھا مگر بازو والے زخم کا خیال کرکے میں جی کی بات ماننے سے باز رہا اور پندرہ بیس منٹ میں فریش ہوکر واش روم سے باہر نکل آیا۔ اس دوران میں ماجد لوٹ آیا تھا اور اس نے ڈرائنگ روم ہی میں ناشتا لگادیا تھا۔

ناشتے کے دوران میں ہمارے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ میں نے اس سے وہی سوال کیا جس کا رات اس نے جواب نہیں دیا تھا۔

''ہاں تو اب بتاؤ..... جنید خان کے ساتھ تم نے کیا کیا.....؟''

''جو کرنے گیا تھا' وہی کیا.....'' اس نے بتایا۔ ''ٹھکانے لگادیا۔''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے اسے کہاں ٹھکانے لگایا ہے اور..... اس کی گاڑی کا کیا ہوا؟''

''دونوں کو ٹھکانے لگادیا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نرسری سے جو راستہ محمود آباد کی طرف جاتا ہے' وہاں ان دونوں کو ریلوے لائن کے قریب چھوڑ آیا ہوں۔ مطلب یہ کہ ٹھکانے لگا آیا ہوں۔''

''تم چینسر ہالٹ کی بات تو نہیں کررہے.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ادھر تو ریلوے پھاٹک ہے۔ وہاں ریلوے کا کوئی نہ کوئی ملازم ساری رات جاگتا ہے۔ اگر میں وہ گاڑی وہاں چھوڑتا تو مجھ پر کسی کی بھی نظر پڑسکتی تھی۔ میں اس نوعیت کے احمقانہ رسک لینے کا عادی نہیں ہوں۔''

''پھر..... پھر تم نے کس مقام پر اس گاڑی کو ریلوے لائن کے قریب چھوڑا ہے۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''پلیا کے نیچے!'' اس نے مضبوط لہجے میں بتایا۔

میری الجھن دوچند ہوگئی۔ ''کون سی پلیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''نرسری سے محمود آباد جائیں تو راستے میں کون سی پلیا آتی ہے۔''

''وہ پلیا جس کے اوپر سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔'' وہ سسپنس پیدا کرنے والے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اصل میں تمہارا ذہن بہت دور چینسر ہالٹ کی طرف چلا گیا ہے۔ میں پھاٹک والے اس راستے کی جانب گیا ہی نہیں۔ میں نے نرسری کے پہلے سگنل ہی سے شارع فیصل کو چھوڑ دیا تھا اور دائیں جانب سروس روڈ سے دودھ والی دکان کے قریب سے پی ای سی ایچ ایس میں داخل ہوگیا تھا۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نظام دودھ فروش کی بات کررہے ہو۔ یہ تو ٹراما سینٹر والی گلی ہے۔''

''بالکل ٹراما سینٹر والی گلی۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

وہ سارا علاقہ یکایک میری نگاہ میں گھوم گیا۔ اس طرف کئی بار میرا جانا ہوا تھا۔ ٹراما سینٹر سے تھوڑا آگے ریلوے لائن تھی جس کے نیچے سے بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے کسی زمانے میں نالا بنایا گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ نالا معدوم ہوتا چلا گیا۔ برسوں پہلے پلیا کے نیچے سے جو نالا رواں دواں ہوا کرتا تھا وہ اب گاڑیوں کی گزرگاہ کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ لوگ اس راستے کو شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اب بھی اس پلیا کے نیچے گندے پانی کی ایک لکیر سی جاری ہے جو اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے اور یہ درس عبرت بھی دیتی ہے کہ انسان اپنے ماضی سے اتنی آسانی کے ساتھ پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہ کسی نہ کسی روپ میں انسان کے تعاقب میں رہتا ہے۔

''جنید خان بھی گاڑی کے اندر ہی موجود ہے یا تم نے اسے کہیں اور پھینکا ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں ماجد سے پوچھا۔

''وہ گاڑی کی ڈکی میں بڑے سکون سے سو رہا تھا جب میں نے اس کی گاڑی کو پلیا کے نیچے سے گزار کر ایک سائیڈ میں کھڑا کردیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بشارت بائیک لے کر میرے ساتھ گیا تھا۔ واپسی میں ہم دونوں بائیک پر آئے تھے۔'' ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے ڈکی کو پوری طرح بند نہیں کیا تاکہ جنید خان کی سانس کی آمدوشد کے لیے تازہ ہوا اندر پہنچتی رہے۔ اگر اسے ''اناللہ'' کرنا ہوتا تو پھر اتنا کھٹ راگ پھیلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

''اس کی آنکھ خود ہی کھل جائے یا ادھر سے گزرنے والا کوئی شخص اس کی خبر لے کر اسے جگادے بہرحال اسے بیدار تو ہونا ہی ہے.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ تو ممکن نہیں کہ اس کے ذہن سے تمہارا صدر والا ٹھکانا محو ہوجائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب تم اسے ٹھکانے لگانے لے کر جارہے تھے تو وہ بے ہوش تھا مگر جب تم اسے گن پوائنٹ پر گلستان جوہر والے منحوس بنگلے سے صدر تک لائے تھے تو اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی یادداشت آف ہوئی تھی۔ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور ایسے مکار لوگوں کو مختلف جگہوں اور راستوں کی کچھ زیادہ ہی پہچان ہوتی ہے۔ وہ تمہارے صدر والے ٹھکانے کو کسی قیمت پر فراموش نہیں کرے گا ماجد.....!''

''نہ کرے فراموش.....'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

''کیا واقعی!'' میں نے تعجب خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں' واقعی۔'' وہ بڑے اطمینان سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر ان الفاظ میں وضاحت کردی۔ ''اول تو لنڈے کے مال والے اس گودام کو میرا ٹھکانا ثابت کرنا ممکن نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے بشارت نے وہاں سے وہ تمام آثار مٹادیے ہوں گے جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا تھا کہ گزشتہ رات وہاں جنید خان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا گیا تھا۔ وہ ہر زاویے سے صرف اور صرف لنڈے کے مال والا ایک گودام ہی دکھائی دے گا۔ دوم.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دوم یہ کہ بشارت بہت کائیاں اور چلتا پرزہ قسم کا

بندہ ہے۔ وہ ہر نازک صورت حال کو بڑی آسانی سے ہینڈل کرلے گا تمہیں اس معاملے میں اپنے ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ بس تم یقین کرلو کہ گزشتہ رات اس گودام پر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہمیں آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"بہت خوب......" میں نے سراہنے والے انداز میں ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "واقعی ہمیں آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ناشتا تو ختم ہوچکا۔ اب میں پہلی فرصت میں سیل فون کو آن کرکے عاطف صاحب سے رابطہ کرتا ہوں تاکہ خوش ولی کے بارے میں تازہ ترین صورت حال کا پتا چلے۔"

"عاطف صاحب سے میرا رابطہ ہوچکا ہے۔" ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "جب میں ناشتا لے کر مارکیٹ سے واپس آرہا تھا تو ان کی کال آئی تھی میرے سیل فون پر۔"

"پھر......" میں نے اضطراری انداز میں ماجد کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے خوش ولی کے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"انہوں نے اس مشن پر کچھ بندے لگا دیئے ہیں۔" ماجد نے تسلی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "کہہ رہے تھے شام تک کسی خوش خبری کی امید رکھی جاسکتی ہے۔"

بات ختم کرتے ہوئے وہ ناشتے کے برتنوں کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا جس دوران میں ماجد برتن سمیٹ کر کچن تک پہنچا تا میں اپنے سیل فون کو آن کرکے اس کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا۔

کوئی میسج دکھائی نہ دیا۔ مجھ سے اس نئے نمبر پر سردست دو افراد رابطہ کرسکتے تھے۔ نمبر ایک عاطف رشید صاحب نمبر دو مراد۔ عاطف صاحب کی ماجد سے بات ہوچکی تھی لہٰذا اس کے بعد مجھ سے رابطہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ماجد کو خصوصی ہدایات دے چکے تھے۔ اگرچہ اس حوالے سے ماجد نے مجھ سے کھل کر بات نہیں کی تھی تاہم میں سمجھ سکتا تھا کہ عاطف صاحب نے آج دن کی مصروفیات کے حوالے سے اسے ضرور کوئی پلان دیا ہوگا۔ وہ اس لیے بھی کہ مجھے عاطف صاحب کے کہے ہوئے الفاظ اچھی طرح یاد تھے۔ انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ جب تک میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوجاتا ماجد سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلے گا اور جہاں تک اس نامراد مراد کا تعلق تھا تو اس کے بارے میں میں نے یہی اندازہ قائم کیا کہ اس نے واقعی مجھے شہبازی کے گاؤں کا کوئی بندہ سمجھ لیا تھا ورنہ اگر اسے میری ذات پر شک ہوتا تو جنید خان کے اغوا والے واقعے کے بعد وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا۔ ویسے یہ بات تو طے تھی کہ جب اس حوالے سے اس کی شہبازی سے کبھی بات ہوگی تو شہبازی منظور بلوچ نامی کسی شخص سے اپنی واقفیت سے انکار کردے گا۔ یہ سب بعد کی باتیں تھیں اور انہیں بعد ہی میں دیکھنا بھی چاہیے تھا۔

ماجد واپس آکر میرے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھا تو میں نے کہا۔ "ماجد! میرا چھیڑ چھاڑ کا موڈ ہورہا ہے۔"

"چھیڑ چھاڑ......" اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔ "کس سے چھیڑ چھاڑ......؟"

ماجد کے بارے میں مجھے یہی تاثر دیا گیا تھا کہ وہ ایک کم گو اور سنجیدہ شخص ہے۔ میرا ابتدائی تجربہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں میرا تاثر تبدیل ہوتا چلا گیا تھا۔ انڈراسٹینڈنگ ہوجانے کے بعد وہ مجھ سے بے

دھڑک باتیں کررہا تھا۔ بعض لوگ بہت کم لوگوں کے ساتھ گھل مل پاتے ہیں اور جب گھل مل جاتے ہیں تو ان کی ذات سے نتھی کم گو والی شکایت بھی جاتی رہتی ہے۔ ماجد بھی مجھ پر کھل گیا تھا۔

اس کے حیرت بھرے استفسار کے جواب میں میں نے کہا۔ "اپنے دشمنوں سے......اور کس سے۔"

"لگتا ہے......" وہ میرے سیل فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کہیں سے اس اچکن کی اولاد شیروانی کا نمبر مل گیا ہے۔"

"نہیں......" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "شیروانی کا تو نہیں البتہ شیروانی کی اولاد واسکٹ کا نمبر میرے پاس محفوظ ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"میں شہزاد کی بات کررہا ہوں یار۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "یہ بندہ بہ ظاہر شیروانی کا ڈرائیور ہے اور اپنے حلیے اور وضع قطع سے بھی ایک ڈرائیور ہی دکھائی دیتا ہے مگر پچھلے چوبیس گھنٹے میں میں اس بندے کی ذات کے حوالے سے جو کچھ جان پایا ہوں اس کی روشنی میں شہزاد کو شیروانی کی ناک کا بال کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"مگر تم نے تو اس کے لیے "واسکٹ" کا لفظ استعمال کیا ہے......؟" ماجد نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔

"ہاں میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس بندے نے کسی واسکٹ کا رول ہی لے رکھا ہے یا یوں سمجھ لو کہ شیروانی نے اسے کسی واسکٹ کی طرح پہن رکھا ہے۔ شیروانی کے سیٹ اپ کے تمام لوگ اسی واسکٹ سے احکامات لیتے ہیں۔"

ماجد طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

اس کی مسکراہٹ میں ایک خاص نوعیت کی معنی

خیزی پائی جاتی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"ماجد! کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا؟"

"ایسی ہی بات ہے......" اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"کیا مطلب......؟" میں نے متاسّل نظر سے اسے گھورا۔

"یار! بات دراصل یہ ہے کہ......" وہ بہ دستور گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب تم نے کہا کہ شیروانی نے شہزاد کو کسی واسکٹ کی طرح پہن رکھا ہے تو میری ہنسی چھوٹنے والی تھی مگر میں نے اسے کنٹرول کیا تو خود بہ خود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ تم خود بھی ایک لمحے کے لیے تصور کر کے دیکھو...... اگر کسی شیروانی نے واسکٹ پہن رکھی ہو تو وہ کیسی لگے گی؟"

میں زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اسی شہزاد سے رابطہ کر رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں، وہ شیروانی کے اوپر کیسا نظر آتا ہے۔"

"ضرور......ضرور۔" ماجد اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "دوستوں کی تو انسان خبر لیتا ہی رہتا ہے۔ دشمنوں کا بھی حال احوال معلوم کرتے رہنا چاہیے۔"

میں نے شہزاد کا نمبر ڈائل کر دیا۔ ڈائلنگ مکمل ہونے کے بعد دوسری جانب بیل جانے لگی۔ ان لمحات میں، میں چاق و چوبند اور حاضر دماغ بیٹھا تھا۔ گھنٹی پر ادھر سے کال ریسیو کر لی گئی پھر میری سماعت سے ایک مردانہ آواز ٹکرائی۔

"ہیلو......"

میں نے گزشتہ روز آسیبی بنگلے میں نہ صرف یہ کہ شہزاد کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا بلکہ اس کی آواز بھی سنی تھی۔ لہٰذا مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ کال شہزاد ہی نے ریسیو کی تھی۔

"کیسی گزر رہی ہے؟" میں نے اس کی "ہیلو" کے جواب میں پوچھا۔

اس کا محتاط استفسار مجھ تک پہنچا "کون......؟"

"اوہ......" میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "اپنے چاہنے والے کو نہیں پہچانے۔ خیر، کوئی بات نہیں، میں خود ہی اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے اس کے اعصاب کو سپردِ عذاب کیا پھر سرسری انداز میں پوچھا۔

"تمہارا باپ اپنے امریکی دوست جوزف کے ساتھ بیرون ملک جا چکا یا ابھی ادھر کراچی ہی میں جوتیاں چٹخا رہا ہے؟"

"کیا بکواس کیے جا رہے ہو؟" وہ برہمی سے بولا۔ "ڈھنگ کی بات کرو ورنہ میں لائن کاٹ دوں گا۔"

"اگر تم نے لائن کاٹی تو میں تمہارا گلا کاٹ ڈالوں گا۔" میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "کیا زمانہ آ گیا ہے کہ تم اپنے اصلی باپ کو تو پہچان نہیں رہے ہو اور بناسپتی باپ شیروانی کی خدمت کرتے ہوئے تمہیں ذرا سا بھی تھکن کا احساس نہیں ہوتا......!"

"تت......تم......اسد ہو نا......!" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔"

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں تو نیوز چینلز پر ٹکر چلوانے والا تھا کہ...... کسی جائز انسان کی ناجائز اولاد! گھر آ جاؤ...... تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"بک بک ہی کیے جاؤ گے یا کوئی کام کی بات بھی کرو گے۔" وہ برہمی کو اپنے ہی اوپر تھوک کر قدرے معقول انداز میں بولا۔ "بتاؤ کس لیے فون کیا ہے...... اور تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

"کس لیے فون کیا ہے، یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا شیروانی جوزف کے ساتھ فلائی کر گیا ہے یا ابھی ادھر ہی جھک مار رہا ہے؟"

"میں تمہیں اپنے باس کے بارے میں کیوں بتاؤں۔" وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ "تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال کرنے والے؟"

"ایک بار پورے ہوش و حواس کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ میں تمہارا اصلی باپ ہوں۔" میں نے کہا۔ "بار بار یہ سوال کرو گے تو مجھے ٹکر چلوانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔"

اس سے پہلے کہ شہزاد کا جواب آتا، میں نے سیل فون کا اسپیکر آن کرتے ہوئے ماجد کو اپنے قریب بلا لیا۔ اب ہم دونوں بہ یک وقت شہزاد کی بات سن سکتے تھے۔

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو اسد!" شہزاد کی تنبیہہ بھری آواز ابھری۔ "تمہاری کوئی بھی چالا کی ہم سے چھپی ہوئی نہیں۔ تم نے جوہر والے بنگلے میں گولی اور شہبازی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا خمیازہ تمہیں بہت جلد بھگتنا پڑے گا اور یہ بات بھی ہمارے علم میں آ چکی ہے کہ جنید خان کو تمہارے کسی آدمی نے اغوا کیا ہے۔"

"واہ وا...... سبحان اللہ!" میں نے زہرخند انداز میں کہا۔ "یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" والا معاملہ ہو گیا نا...... میں جو کر رہا ہوں، وہ اچھا نہیں ہے اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور تم لوگ سب اچھا کر رہے ہو، ہیں!" میں نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس کھیل کی شروعات کس نے کی ہے...... میں نے یا تم نے......؟ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ تمہارے کیے کے ردعمل میں ہے۔ اپنے کیے کا خمیازہ تم بھگتو میں کیوں بھگتوں......؟"

"فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو اسد۔" اس نے مجھے اپنے دباؤ میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جنید خان کو چھوڑ دو...... یہ نہیں بھولو کہ تمہارے دو آدمی اس وقت بھی ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔"

"کون سے دو آدمی؟" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے پوچھ لیا۔

"کیا اتنی جلدی اپنے آدمیوں کو بھی بھول گئے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہاری محبوبہ فرحانہ اور اس رکشا ڈرائیور خوش دلی کی بات کر رہا ہوں جو تمہارا گہرا دوست ہے اور رکشا ڈرائیور کے روپ میں تمہیں گلستان جوہر پہنچانے آیا تھا۔ اس کا رکشا ابھی تک اسی بنگلے کے اندر کھڑا ہے جہاں تم نقلی نوٹوں کا بیگ لے کر اپنی محبوبہ کو چھڑانے آئے تھے......"

"اوہ...... یاد آ گیا...... سب یاد آ گیا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا پھر پینترا بدلتے ہوئے اضافہ کیا۔ "تم جس رکشا ڈرائیور کو میرا دوست کہہ رہے ہو نا وہ واقعی ایک رکشا ڈرائیور ہے۔ مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے تو اسے قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ تم اس کے ساتھ جیسا بھی بہیمانہ سلوک کرو مجھے کوئی پروا نہیں البتہ......"

" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے......!"

ایک لمحے تک شہزاد کی جانب خاموشی رہی۔ یقیناً میں نے خوش دلی کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ اس پر غور کر رہا ہو گا کہ میں نے کس حد تک درست کہا ہے۔ ظاہر ہے، وہ یہ تو اعتراف نہیں

کرسکتا تھا کہ خوش دلی ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوچکا ہے۔

''میں سمجھا نہیں......'' اس کی محتاط آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''جنید خان اور فرحانہ کے تبادلے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''اتنے ننھے نونہال بھی نہیں ہو شہزاد کہ مجھے پیپرز بدلنے کے لیے کوئی آیا ملازم رکھنا پڑے۔'' میں نے اس پر چوٹ کی۔ ''اگر تم فرحانہ اور جنید خان کے تبادلے سے یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ دونوں سرکاری آفیسرز ہیں اور ان کا تبادلہ اندرون سندھ کہیں کیا جانے والا ہے تو میں تمہیں دنیا کا احمق درجہ اول تصور کروں گا۔ فرحانہ اور جنید خان نہ تو جیکب آباد جائیں گے اور نہ ہی رتوڈیرو...... یہ ادھر کراچی ہی میں رہیں گے۔ بس ان کی جگہیں تبدیل ہوجائیں گی۔ فرحانہ میرے پاس اور جنید خان تمہارے پاس چلا جائے گا۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے؟''

''ہاں ہاں...... بات تو سمجھ میں آرہی ہے۔'' وہ میرے نادیدہ جال میں قدم ڈالتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا ٹائم دو......''

وہ یقیناً اس سلسلے میں شیروانی سے صلاح و مشورہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں سوچنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا......؟''

''پانچ سے دس منٹ۔'' اس کا جواب آیا۔

''ٹھیک ہے دس منٹ ڈن......'' میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک دس منٹ کے بعد تم مجھے کال کرکے اپنے فیصلے سے آگاہ کروگے...... ٹھیک ہے؟''

''بالکل ٹھیک۔'' وہ بڑی شرافت سے بولا۔

''اور جس تبادلے کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ظہر کی اذان سے پہلے ہوجانا چاہیے۔'' میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''اوکے......'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''میں پانچ منٹ میں تمہیں کال کررہا ہوں۔''

میرے اور شہزاد کے بیچ سیلولر رابطہ موقوف ہوا تو ماجد نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار تم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے جو ظہر کی اذان سے پہلے تبادلے کی بات کی ہے۔''

''جنید خان ہماری کسٹڈی میں نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسے کسی بھی وقت ہوش آسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد شہزاد سے رابطہ کرے یا شیروانی کا نیٹ ورک یہ پتا لگانے میں کامیاب ہوجائے کہ جنید خان ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے ہمیں اس ڈیل کو فائنل کرکے فرحانہ تک رسائی کی راہ ہموار کرلینا چاہیے۔ آگے جو ہوگا اللہ مالک ہے۔''

''میں بھی اسی نکتے پر غور کررہا ہوں اسد۔'' ماجد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہمیں تبادلے کا مقام بہت سوچ سمجھ کر منتخب کرنا ہوگا...... باس! وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے؟''

''میں اس علاقے میں طویل عرصے سے رہ رہا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور یہاں کے مزاج اور ماحول کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تبادلے کے لیے سوسائٹی قبرستان سب سے موزوں جگہ ہے۔''

''سوسائٹی قبرستان!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زیر لب دہرایا۔ ''تمہارا مطلب ہے یہ جو اللہ والی چورنگی کے برابر میں آباد ہے؟''

''بالکل...... میرا یہی مطلب ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم انہیں اس قبرستان کے سائیڈ والے گیٹ پر بلاتے ہیں وہ جو پہلو والی گلی میں ہے۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم آسانی سے اس لوکیشن کے معاملات کو کنٹرول کرلیں گے۔ میرا مطلب ہے کیا یہاں پر ایسے محفوظ انتظامات ہوسکتے ہیں کہ ہم فرحانہ کو ان کے قبضے سے بہ حفاظت چھڑا کر رفوچکر ہوجائیں۔''

''بالکل! میں یہ انتظامات کرلوں گا۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس تم اس بات کا خیال رکھنا کہ جب شہزاد کا فون آئے تو تم اسے اس بات کا پابند کردینا کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں لگنا چاہیے۔ وہ فرحانہ کو لے کر آجائے اور تم جنید خان کو لے کر مقررہ مقام پر پہنچ جاؤ گے۔''

''اوکے یہ میں کرلوں گا۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

ماجد بولا۔ ''میرا خیال ہے شہزاد اپنے باس شیروانی سے بات کررہا ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے......!''

ادھر میری بات مکمل ہوئی ادھر سیل فون میں شہزاد کی کال کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اسپیکر فون آن کردیا۔

''ہیلو......!'' اس کی آواز نشر ہوئی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''تبادلے کا فیصلہ ڈن ہے۔'' اس کا جواب آیا۔ ''مگر میری ایک شرط ہے۔''

"کیسی شرط......؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"تم جنید خان کو لے کر آؤ گے......بس تم۔" وہ تاکیدی لہجے میں بولا۔ "تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہونا چاہیے۔"

"ڈن!" اس نے میرے دل کی بات کر دی تھی۔ میں بھلا کیسے اس سے اتفاق نہ کرتا۔ "لیکن اس سلسلے میں میری دو شرطیں ہیں......!"

"دو شرطیں؟" اس کی الجھن زدہ آواز ابھری۔

"تم نے ایک شرط منوائی ہے تو اس کے بدلے میں دو شرطیں میں بھی منواؤں گا نا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، جلدی بولو......" اس نے کہا۔

"شرط نمبر ایک۔" میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ "تم فرحانہ کو لے کر آؤ گے۔ تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہونا چاہیے۔"

"منظور ہے۔" وہ جلدی سے بولا پھر پوچھا "اور دوسری شرط؟"

"شرط نمبر دو......" میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فرحانہ اور جنید خان کا تبادلہ سوسائٹی قبرستان، طارق روڈ کے سائیڈ گیٹ پر ہوگا، وہ گیٹ جو برابر کی گلی میں ہے......ٹھیک ایک بجے دوپہر...... بولو منظور؟"

"منظور......مگر سوسائٹی قبرستان کیوں؟" اس کی الجھن زدہ آواز ابھری۔

"کیوں......کیا سوسائٹی قبرستان آتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا ڈر محسوس ہو رہا ہے؟"

"نن......نہیں......" اس کی الجھن سوا ہوگئی۔ "لیکن اصول کے مطابق تو میت کو سخی حسن کے قبرستان لے جانا چاہیے۔ اگر تم نے میت سے پہلے قبرستان پہنچنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سوسائٹی قبرستان ہی کیوں......سخی حسن کیوں نہیں؟"

شہزاد کے استفسارات ون ایٹی ڈگری سے میرے اوپر سے گزر گئے۔ میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔ "یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ کون سی میت...... کس کی میت؟"

اس کی جاہلانہ گفتگو نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اس کی جانب سے ایک اور غیر متعلق سوال آیا۔

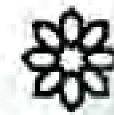
"کیا تم اس وقت اپنے گھر میں نہیں ہو؟"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کک......کیا مطلب ہے تمہارا......؟"

"بھولے بادشاہ! مطلب مجھ سے پوچھ رہے ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آج صبح سے تمہارے دروازے کے سامنے صف ماتم بچھی ہے۔ ہم نے تو اس خیال سے اپنے بندے وہاں سے ہٹا لیے تھے کہ......"

شہزاد اس سے آگے پتا نہیں کیا کیا بکواس کرتا چلا جا رہا تھا۔ میرا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے مفقود ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، میں اگلی سانس نہیں لے پاؤں گا......!

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



پانی کا محل

عمران احمد مدیر نئے افق!

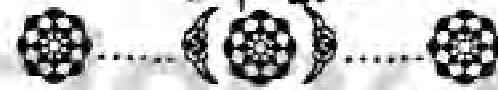
السلام علیکم

ایک وقفہ کے بعد پانی کا محل کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ کہانی ان واقعات کی عکاس ہے جو ہر سال ہمارے ملک کے مختلف حصوں میں دہرائے جاتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا فسانہ ہے جو ایک ہی سوراخ سے بار بار خود کو ڈسواتے ہیں۔ مگر شکوہ کناں نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے ہیں۔ امید ہے یہ تحریر آپ کو اور قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

محمد سلیم اختر

راولپنڈی

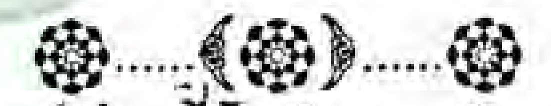
پانی کی بوندوں کے گرنے کی آواز سے زبیدہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ رات کو بہت دیر سے سوئی تھی۔ مگر پانی کے ان قطروں میں جانے کیا پیغام تھا کہ اس کی گہری نیند ٹوٹ گئی۔ آسمان سے برستے اس پانی سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔ بچپن میں جب اسے گہری نیند سے جھنجوڑ کر جگایا جاتا تو ہلکے سروں کا یہی ساز پس منظر میں بج رہا ہوتا تھا پھر یہ موسیقی تیز ہو جاتی۔ جوں جوں موسیقی تیز ہوتی جاتی، اس میں شدت، وحشت اور بربریت آتی جاتی اور آخر میں وہ مسلسل بے ہنگم شور میں بدل جاتی۔ تب وہ لوگ بچوں اور سامان کو لٹکائے پناہ گاہوں کی طرف بھاگنے لگتے۔ کسی کے ہاتھ میں چارپائی کی بلیاں ہوتیں، کوئی مرغیوں کا ٹوکرا اور کوئی برتنوں کا جھولا اٹھائے دوڑتا۔ زبیدہ بھی کسی کی بانہوں میں، کسی کے کندھوں پر کسی کی ٹانگوں سے چمٹی اس سیلاب سے اپنے ڈوبے گھر سے دور کسی اونچی جگہ پہنچ جاتی۔ برستے پانی کے ان قطروں نے ہمیشہ اسے پریشانی کا ہی پیغام دیا تھا۔



زبیدہ نے جھنجوڑ کر کریم کو جگایا، ویسے تو وہ بہت گہری نیند سوتا تھا مگر پہلی ہی آواز پر جاگ گیا، اس نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے زبیدہ کی طرف دیکھا اور بغیر اس کے کہے سب کچھ جان گیا۔ بارش کی آواز نے وضاحت کر دی تھی۔ یہ تو صرف خوف کی بات ہے ورنہ زبیدہ اور کریم کو تو بارش سے اب کچھ خطرہ بھی نہیں تھا۔ پچھلے سال کریم نے اپنا مکان پکا کروایا تھا۔ اب اس کا گھر بستی میں واحد گھر تھا، جو بلاکوں سے بنا ہوا تھا اور جس پر ٹین کی چھت تھی، اب بارش اوپر سے شور مچا کر تو گزر سکتی تھی، مگر اندر ٹرنک میں رکھے کپڑوں کو گیلا نہیں کر سکتی تھی۔ سوتے ہوئے آدمی کو نہلا نہیں سکتی۔ پکے ہوئے کھانوں کو خراب نہیں کر سکتی تھی، اب انہیں جگہ جگہ برتن نہیں رکھنے پڑتے تھے لیکن بستی کے اور مکان تو کچے ہی ہیں، بارش ان میں خوب قیامت ڈھاتی۔ بارش کا زور جوں جوں بڑھ رہا تھا بستی میں عجیب سا شور پھیل رہا تھا۔ بارش کے وقت یہ شور بہت بھیانک تھا۔ اس میں برستے ہوئے پانی کی للکار تھی۔ جیسے وہ اس آسمان کے نیچے ہر چیز کو

تباہ کردینا چاہتا ہو' اس میں جانوروں اور انسانوں کی آہ وزاری تھی' جیسے وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کررہے ہوں۔

بڑھتے ہوئے شور کو سن کر کریم باہر آ گیا' نشیب میں رہنے والے کچھ لوگ پانی میں شرابور چلے آرہے تھے' اس نے انہیں اپنے گھر پہنچایا' پاس پڑوس کے کئی لوگ بھی پناہ حاصل کرنے اس کے گھر آرہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہاں بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ بارش کا زور بڑھتا ہی جارہا تھا۔ کئی لوگ سجدوں میں گرے بارش بند ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے' یہ بارش بھی خوب ہے کہ کہیں لوگ سارا سال اس کے انتظار میں آنکھیں آسمان سے لگائے رہتے تھے اور کہیں ذرا سا پانی برس جائے تو خوشی سے دیوانہ وار رقص کرتے ہیں اور کہیں لوگ ہر بدلی پر ایک دھڑکے سے آسمان کو دیکھتے ہیں کہ کہیں اس نیلی چادر میں جو ان کے سروں پر تنی ہے کوئی شگاف نہ ہوجائے۔ اس لیے کہ چادر کے نیچے اس دنیا میں ان کے سر پر اور کوئی چادر نہیں۔

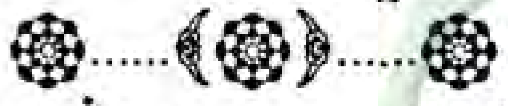


نشیب کے علاقے سے ہیبت ناک شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی مرنے سے پہلے آخری بار دم گھٹنے اور سانس روکنے والے نادیدہ ہاتھوں کو جھٹک دینے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر یہ شور کم ہوتا گیا اور آخر میں ختم ہوگیا۔ اب بارش بھی تھم چکی تھی لیکن یہ کیسا شور تھا جو اب بڑھ رہا تھا۔ بہت غور سے سننے پر معلوم ہوتا تھا لیکن یہ بارش کی طرح دور نہ تھا' یہ تو کہیں قریب ہی اپنے اندر سے پھوٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ یہ بہتے پانی کا شور تھا' ندی کا بند ٹوٹ گیا تھا' پانی آہستہ آہستہ ان کی بستی کا رخ کررہا تھا۔ جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو' جیسے کوئی شکاری کسی مجروح درندے سے کھیلتا ہو' جیسے کوئی یقینی موت کسی کے گلے میں نزع کا طویل تار بن کر اٹک جائے۔ لوگوں میں پھیلتا ہوا شور سناٹے میں بدل گیا۔ وہ سب دم سادھے بہتے پانی کو سن رہے تھے' جس میں اب تیزی آتی جارہی تھی۔ پانی آہستہ آہستہ غضب ناک ہورہا تھا' سمندر کی موجوں کی طرح جو بہت ہی آہستگی اور خاموشی سے بڑھتی ہیں لیکن خوف ناک چیخیں بلند کرتی ہوئی ساحل سے ٹکراتی ہیں' وہ سب خاموشی سے پانی کے آنے کا اعلان سن رہے تھے وہ گرجتا غراتا' ہر چیز سے ٹکراتا ہر چیز کو گراتا آرہا تھا۔ پھر کربناک خاموشی کا یہ طویل لمحہ ختم ہوگیا' گھرے ہوئے مجبور لوگوں میں پھر شور مچ گیا بھیانک ریلے کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی' وہ دبی ہوئی آوازوں میں چیختے ہوئے دوبارہ پناہ کی تلاش میں بھاگنے لگے۔

''اوپر ٹیلے پر پہنچو۔'' کوئی زور سے چلایا۔ بچے ماؤں کی گود سے گرنے لگے' مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہاتھ چھوٹ گئے۔ سامان کی سب فکریں پانی کی نذر ہوگئیں۔ وہ سب دیوانہ وار ٹیلے کی طرف بھاگے' دیکھتے ہی دیکھتے کریم کا بھرا گھر خالی ہوگیا' پانی اب گھر میں داخل ہورہا تھا' برآمدے میں چھت کے سہارے کو لگی بلی پانی کے دباؤ سے لرزنے لگی' کریم نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ وہ اس ڈوبتے گھر کو سہارا دے رہا تھا۔ جو اب تک اس کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پانی اب اس کے قدم بھی اکھاڑ رہا تھا۔ کریم جیسے دیوانگی کی حالت میں جما کھڑا تھا۔ برسوں پہلے کا واقعہ گویا دوبارہ سامنے آ گیا تھا۔

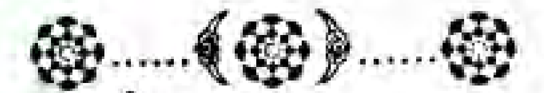
وہ بھی ایسے ہی خونی سیلاب کی رات تھی۔ چاند تک خوف کے مارے چھپا بیٹھا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا پھر پانی کے ریلے اس کے گھر میں ناچنے لگے' وہ اپنی ماں کی گود میں تھا' جب سب اپنے گھر چھوڑ کر اونچائی کی طرف بھاگے' تب پانی میں کسی چیز سے ٹکرا کر وہ گری اور کریم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ ''کاکا'' وہ زور سے چیخی پھر وہ اٹھی آگے بڑھی اور پانی سے لڑتے ہوئے بچے کو اس سے چھیننا چاہا لیکن دوسرے ہی ریلے میں پانی نے اسے بہت دور پہنچا دیا کریم کو اب تک اس کا بڑھا ہوا ہاتھ اور آنکھوں کی حسرت یاد تھی۔ وہ سوتے میں کبھی کبھی چونک کر اٹھ بیٹھتا یوں لگتا جیسے کسی نے زور سے ''کاکا'' کہہ کر اسے پکارا ہو۔

پانی کریم کے گھٹنوں تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ دیوانوں کی طرح ابھی تک زور لگا رہا تھا نیچے کوئی چیز پانی میں ڈوبتی ہوئی اس کے پیروں سے لپٹی بین کررہی تھی' اس کی چیخوں سے جیسے کریم اپنے ہوش میں آ گیا' یہ زبیدہ تھی۔ اس کی چہیتی بیوی جسے وہ پیار سے ''بیدی'' کہتا تھا۔ کریم نے اسے کندھوں پر اٹھایا اور پانی کے اس جنگل سے باہر نکل آیا۔ ٹیلے پر انہیں دو دن اور دو راتوں تک انتظار کرنا پڑا' تب جا کے کہیں پانی اترا اور امدادی کشتیاں ان تک پہنچیں۔ قیامت خیز بارش اور سیلاب کی خبروں سے پورے صوبے میں کہرام مچ گیا۔ سیلاب زدگان کے لیے امدادی کیمپ کھول دیئے گئے۔ انہیں کھانا کپڑے اور ضرورت کی سب چیزیں فراہم کی گئیں وہ لوگ اس کیمپ میں بہت خوش تھے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کر اپنی تباہی کا غم بھول گئے ہیں یا شاید وہ ایسی تباہیوں کے عادی ہوچکے تھے' اب تو وہ پکی دیواروں اور چھتوں والے کمروں میں آرام سے رہتے تھے۔ اب کوئی بارش اور کوئی سیلاب ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ اب وہ شہر میں انسانوں کے درمیان تھے لیکن کریم اور زبیدہ کا گھر تو پکا تھا' انہیں اپنے پیارے گھر کی تباہی کا بہت غم تھا' وہ گھر جس کے لیے انہوں نے دو سال تک پیسے جمع کیے اور ہر جاننے والے سے قرض لیا' وہ گھر جو اس بھری دنیا میں ان کی واحد خوشی تھی۔ ظالم بے رحم پانی کی نذر ہوچکا تھا۔ کریم نے دوسرے ہی دن سے کام پر جانا شروع کردیا لیکن اب وہ واپس آ کر خاموش بیٹھا رہتا۔ جو ساری دیواریں ایک ایک بلاک کرکے اس نے اٹھائی تھیں' پتھروں کے ایک ڈھیر کی طرح گر چکی تھیں' پانی اس کے محل کو بہالے گیا تھا۔



ملک بھر میں سیلاب اور بارش سے خوف ناک تباہی اور ہزاروں اموات پر شور مچ گیا۔ ٹی وی چینلز نے ہر منظر اسکرین پر براہِ راست دکھانا شروع کردیا۔ حزب اختلاف نے حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ اس نے غریبوں کو بسانے میں مجرمانہ غفلت سے کام لیا ہے اور انہیں ندی کے کناروں پر پانی کا شکار بننے کے

لیے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اخبارات نے صوبائی اور ضلعی حکومتوں کو ذمہ دار ٹھہرایا کہ انہوں نے پچھلی بارشوں سے سبق نہ لیتے ہوئے بچاؤ کی کوئی تدابیر نہیں کیں حتیٰ کہ ندی نالے بند بھی مضبوط نہ کیے۔ ہر طرف سے بیانات آنے لگے کہ اب کی دفعہ ان بے چارے غریبوں کو ایسی خطرناک جگہوں پر نہ بسایا جائے بلکہ ان کے رہنے کے لیے علیحدہ پلاٹ دیئے جائیں۔ جب شور بہت بڑھ گیا تو وزیر اعلیٰ نے ایک پُرہجوم کانفرنس میں سیلاب زدگان کے لیے حکومتی اقدامات کا اعلان کیا کہ سیلاب میں غرق ہونے والے لوگوں کے ورثاء میں معاوضہ تقسیم کیا جائے گا۔ مویشیوں اور سامان کے نقصان پر بھی معاوضہ دیا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام متاثرین میں رہائشی پلاٹ مفت تقسیم کیے جائیں گے۔ ان فراخدلانہ اقدامات پر سب نے انہیں آفرین کہی۔ اخبارات میں تعریفی بیانات اور مضامین چھپنے لگے، سرکاری ٹی وی خوشی کے نغمے نشر کرنے لگے اور حزب اختلاف والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔



اور وہ سیلاب زدگان میں مفت پلاٹ تقسیم کرنے کا مبارک دن تھا۔ گورنر صاحب اس شاندار تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ اس دن بسیں تمام متاثرین کو اس تقریب میں شرکت کے لیے ان کی نئی بستی لے جارہی تھیں۔ ان کے ساتھ صحافیوں کی ٹیمیں بھی تھیں، ٹی وی والے متاثرین کے تاثرات محفوظ کررہے تھے اور میڈیا کے نمائندے ان کے انٹرویو لے رہے تھے۔ بسیں چلتی رہیں اور پھر وہ شہر کے ہنگاموں کو چھوڑ کر مضافات میں نکل آئیں۔ جہاں بڑے بڑے بنگلے اور کشادہ سڑکیں تھیں، پھر آبادی کے نشانات ختم ہوگئے۔ یہاں کچھ پولٹری فارم اور باغات تھے۔ بسیں اور آگے بڑھیں اب مکمل ویرانے ہی ان کے سامنے تھے۔ کچھ اور آگے جا کر وہ سڑک سے ایک طرف مڑ گئیں۔ یہاں سے کچا راستہ اندر جاتا تھا۔ ریت کا طوفان بسوں کے اطراف میں وحشیوں کی طرح رقص کرنے لگا۔ سب نے کھڑکیاں بند کرلیں اور خاموش ہوگئے۔ سوٹ پہنے ہوئے مہذب میڈیا کے لوگ اور کیمرہ مین بھی اکتا سے گئے تھے۔ انہوں نے سگریٹ سلگا لیے اور آنکھیں بند کرکے خاموشی میں کھو گئے۔ بسیں ایک جھٹکے سے رک گئیں۔ غریبوں کی نئی بستی آچکی تھی۔ میدان میں خوب صورت شامیانے تنے تھے۔ جن کے اندر آرام دہ صوفے سجے ہوئے تھے۔ سامنے سفید چونے سے تمام پلاٹوں کے نشان لگے ہوئے تھے۔ متاثرین کو دوسری طرف شامیانوں کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس تقریب کے معزز مہمان آنے لگے۔ ان میں عمائدین شہر، اعلیٰ فوجی و سول حکام اور مختلف ملکوں کے سفارتی نمائندے بھی شامل تھے۔ تھوڑی دیر بعد گورنر صاحب کا ہیلی کاپٹر اترا آیا۔ استقبالیہ تقریر اور سیاستدانوں کے بعد وزیر آبادکاری نے انہیں ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے سب متاثرین میں الاٹمنٹ لیٹر تقسیم کیے اور اپنی تقریر میں حکومت کی طرف سے مزید ایسے ہی امدادی اقدامات کا یقین دلایا۔ آہستہ

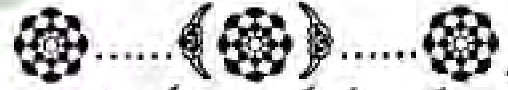
آہستہ تمام کاریں چلی گئیں۔ متاثرین کی بسیں روک لی گئیں۔ وہاں چند سپروائزر انہیں ان کے پلاٹ دکھا رہے تھے لیکن خاموش اور جامد متاثرین میں خوشی کا جوش نہ تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ایک طرف سمٹتے گئے اور ایک ڈھیر کی صورت میں جمع ہوگئے۔ بلدیہ کے افسران باتیں کررہے تھے۔

''یہ جگہ شہر سے کتنی دور ہے؟'' ان میں سے کسی نے سوال کیا۔

''130 کلومیٹر'' افسر نے جواب دیا۔

جواب کے بعد ایک اداس سی خاموشی پھیل گئی۔ کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ جیسے جواب نے سب کو ساکت کردیا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا یہاں تک کوئی بس آتی ہے؟'' کسی نے جیسے اپنے آپ ہی سے سوال کیا لیکن افسر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کوئی بھی اس کی طرف سے جواب کا منتظر نہ تھا۔ جواب تو سب کو معلوم تھا۔ ان کی مایوسی ان کے چہروں، ان کی آنکھوں اور ان کے جسموں سے ٹپک رہی تھی۔ غریبوں کو آپ سے پلاٹ نہیں چاہئیں، انہیں سرکاری بستیوں میں رہنے کی خواہش نہیں۔ وہ آپ سے پانی، بجلی اور گیس نہیں مانگتے۔ وہ تو آپ کے قریب ہی کچھ جگہ چاہتے ہیں۔ انہیں تو ایک بس کی ضرورت ہے جس کے اندھے سینے میں اتر کر وہ ہر روز اپنے مقدر کے بند دروازوں کو کھٹکھٹانے جاتے ہوں اور واپسی پر روٹی کے چند ٹکڑے اپنی جھولی میں سجا لیتے ہوں۔ آپ انہیں ندی کے کناروں پر ہی کیوں نہیں رہنے دیتے۔ آپ کے گھروں کا گندا پانی بھی تو وہیں آتا ہے۔ آپ کے سماج کی تلچھٹ سے وہ بھی اپنا پیٹ بھر لیں گے۔ پانی کا کیا ہے، یوں بھی تو وہ بچارے پانی کے ایک ایک قطرے کو سارا سال ترستے ہیں۔ اگر سال کے سال ان کی یہ پیاس بجھ جاتی ہے تو آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ متاثرین اپنے الاٹ شدہ پلاٹ بیچ نہ سکتے تھے ورنہ وہ ان خوب صورت کاغذوں کو نہ پھاڑتے پھر وہ ایک ایک کر کے پرانے ٹھکانوں پر واپس آنے لگے لیکن اب کے وہاں پولیس کا پہرہ تھا۔ اب انہیں پھیلے ہوئے اس ظالم پیٹ کو بھی بھرنا تھا۔ وہ لوگ ہرجانے دے کر اپنی بستیوں میں جانے لگے۔



زبیدہ اور کریم کو حکومت کی طرف سے کچھ نہ ملا تھا۔ ان کا تھا ہی کون؟ جس کے مرنے کی فریاد لے کر وہ ان داتاؤں کی بانٹ کے حق دار بنتے۔ اب وہ اپنے تباہ شدہ مکان کے کھنڈروں پر کھڑے تھے۔ قریب ہی نشیب میں اب بھی پانی موجود تھا۔ کریم یوں ہی ادھر ادھر پھر رہا تھا کہ اچانک اس کی ایک تیز خوشی کی چیخ زبیدہ کے کانوں میں گونجی ''بیدی'' وہ چلا رہا تھا۔

''ذرا دیکھ تو برآمدے کی ٹکی پانی میں پڑی مل گئی ہے۔''



آشیانہ

محترم مدیر نئے افق!
میری پہلی کورٹ کہانی پسند کرنے کا شکریہ' آپ کی ہدایت اور مشورہ کے مطابق دوسری کہانی حاضر ہے۔ یہ میں ایک دوست وکیل کی ڈائری سے لیا گیا ایک کیس ہے چونکہ اس کہانی کے تمام کردار زندہ اور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے ان کی خواہش اور درخواست کے مطابق تمام کرداروں کے نام تبدیل کردیے ہیں۔ باقی کہانی سو فیصد ہے امید ہے قارئین کو میری یہ کاوش ضرور پسند آئے گی۔

والسّلام
خلیل جبار
کراچی

آج جو میرے پاس ایک مقدمہ آیا تھا وہ ایک خاتون کی طرف سے خلع کی درخواست تھی اس طرح کے مقدمات اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں لیکن اس مقدمے میں خاتون نے اپنے شوہر پر سنگین نوعیت کے الزامات لگائے تھے۔ خلع کے مقدمے میں عموماً اس طرح کے الزامات کہ شوہر نکھٹو ہے' جواری ہے' نشہ کرتا ہے لیکن اس خلع کی درخواست میں موقف اختیار کیا گیا تھا کہ اس کا شوہر غیر فطری طریقے اختیار کرکے اس کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ غیر عورتوں کو گھر میں لاکر عیاشی کرتا ہے۔ اس پر تشدد کرکے بدکاری کے کام پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے شوہر سے سخت نفرت ہوگئی ہے' میں اس کا منہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ اس طرح کے الزامات پر عدالت سے جلد ہی خلع کی درخواست منظور کرلی جاتی ہیں۔ مجھے اس مقدمے میں شوہر کی جانب سے پیروی کرنا تھی۔ میرے لیے بڑا چیلنج والا مقدمہ تھا اور بڑا محنت طلب بھی' خاتون زینت کے شوہر سرفراز سے جب میں نے ان الزامات میں وضاحت طلب کرنا چاہی تو وہ رو پڑا۔

''وکیل صاحب! یہ سب الزامات بے بنیاد ہیں۔ ہماری زندگی بڑی خوش گوار گزر رہی تھی لیکن جب سے نیاز احمد باہر سے دولت کما کر لایا ہے۔ میرے لالچی سسر کی نیت اس کے مال پر لگی ہوئی ہے اور وہ مجھ سے ہر قیمت پر زینت کو طلاق دلا کر نیاز احمد سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتا ہے۔''

''تمہاری ان دنوں مالی پوزیشن کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سے کیا چھپانا وکیل صاحب! میرا بہت اچھا کاروبار تھا لیکن دو سال کے اندر اندر کاروبار پر دھیان نہ دینے پر میں لاکھوں کا مقروض ہوگیا ہوں اور گھر چلانے کے لیے ایک دکان پر نوکری کرنا پڑ رہی ہے' اس بات کا فائدہ اٹھا کر اس کے والد اور والدہ نے زینت کو مجھ سے باغی کردیا ہے اور میری اس سے ملاقات بھی نہیں ہونے دیتے' انہیں خطرہ ہے کہ اگر میری اس سے ملاقات ہوگئی تو میں اسے گھر چلنے کے لیے قائل کرلوں گا۔''

''تمہارے بچے بھی ہیں؟''

''ہاں دو لڑکیاں ہیں لیکن وہ میری والدہ کے پاس ہی رہتی ہیں۔ زینت نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن وہ تیار نہ ہوئیں۔''

''لگتا ہے انہیں اپنی دادی جان سے بہت پیار ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری والدہ بھی ان بچیوں کا بڑا خیال رکھتی ہیں۔''

''تم زینت کو طلاق دینا چاہتے ہو یا ساتھ رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں اس لیے آپ کی خدمات حاصل کی ہیں۔ نیاز احمد کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اوّل درجے کا عیاش ہے۔ ساری زندگی اس نے ڈھنگ سے کام نہیں کیا' ہم سے پہلے نیاز احمد کے گھر والوں نے ہی زینت کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس کی شہرت اتنی خراب تھی کہ برادری میں کوئی بھی اس کو رشتہ دینے کو تیار نہ تھا۔ میرے سسرال والوں نے اس رشتے سے صاف انکار کردیا اور انہیں بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس بات کا نیاز احمد کو بہت دکھ ہوا اور شرمندگی کے مارے برادری کے لوگوں سے ملنے سے کترانے لگا۔ ایک دن ہم نے سنا کہ وہ دبئی چلا گیا ہے' اس دوران ہم نے زینت کے گھر رشتہ بھیجا اس وقت میرا کاروبار اچھا چل رہا تھا اس لیے فوراً ہامی ہوگئی۔ اب دس سال بعد لوٹا ہے تو اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے دولت کی جھنکار سسر کو دکھا کر زینت سے شادی کے لیے مجبور کردیا ہے تاکہ برادری میں میرے سسر کو نیچا دکھا کر زینت کو طلاق دے کر بدنام کرسکے۔''

''وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کو تمہارا گھر کیوں اجاڑ رہا ہے؟'' میں نے کہا۔

''انتقام کی آگ میں انسان اندھا ہوجاتا ہے' وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا کررہا ہے' اس کے انتقام کی آگ بجھانے سے کتنے افراد متاثر ہوں گے۔ میرے کاروباری نقصان سے اس کے انتقام کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔''

اس مقدمے نے مجھے ماضی میں لوٹا دیا تھا۔ ایک یہ زینت خاتون ہے جو اپنے والدین کے کہنے میں آکر اپنے شوہر پر ایسے الزامات عائد کررہی ہے جو اس نے کیے ہی نہیں ہیں۔ ایک میری بیوی تھی جس نے مجھ سے شادی کرنے کی خاطر اپنے خاندان سے ٹکر لے لی تھی اور شادی کرکے ہی مانی تھی۔ میں نے وکالت کے شعبے میں بہت کمایا تھا۔ گھر والوں کی بڑی خواہش تھی کہ میں جلد سے جلد شادی کرلوں لیکن مجھے وکالت کے پیشے کا ایسا شوق ہوا تھا کہ میں ہوتا تھا اور قانون کی کتابیں ہوتی تھیں۔ اپنے بارے میں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ کچھ سوچوں' میرے ساتھ کے لڑکوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ ابا جان اور امی جان کو میرے چہرے پر سہرا سجانے اور میرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی بڑی آرزو تھی۔ انسان کے پاس جب بے تحاشا دولت آنے لگتی ہے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ میرا روزانہ مختلف قسم کے جرائم پیشہ افراد سے واسطہ پڑتا' ان جرائم پیشہ افراد میں خواتین بھی شامل تھیں۔ پیشہ ور خواتین کی مثال ایسی ہے کہ جیسے بہتا ہوا پانی جو بے اختیار لوگوں کو نہانے پر اکساتا ہے۔ میں بھی اس بہتے ہوئے پانی میں بہہ گیا۔ ہوش آنے پر مجھے پتا چلا کہ میں ایک لاعلاج مرض ایڈز میں مبتلا ہوچکا ہوں۔ یہ ایسا مرض تھا کہ میں اس کا کسی سے ذکر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' نقصان ہی تھا' لوگ مجھ سے ملنے کی بجائے دور ہوجاتے۔ اس لیے خفیہ طریقے سے زندہ رہنے کو علاج کرا رہا تھا۔ اس دوران میرے پاس مہناز نامی لڑکی وکالت کی پریکٹس سیکھنے کو آنے لگی تھی۔ وہ بڑی ذہین اور ہوشیار لڑکی تھی' کام کو فوراً سمجھ

لیتی تھی۔ استاد ہونے کے ناتے وہ میرا بڑا احترام کرتی تھی۔ کسی پرچے پر میرا نام لکھا ہوا اور وہ زمین پر گر جائے' یہ دیکھ کر مہناز بے چین ہو جاتی اور وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی عقیدت سے اس پرچے کو اٹھا کر رکھتی۔ کبھی غلطی سے میرے کسی اسسٹنٹ سے ایسا پرچہ گر جاتا جس پر میرا نام لکھا ہو تو وہ اس سے لڑ پڑتی۔

''دیکھتے نہیں اس پرچے پر کیا لکھا ہے؟''

''کیا لکھا ہے؟'' وہ حیرت سے پوچھتے۔

''اس پرچے پر سر قربان احمد ایڈووکیٹ لکھا ہے۔''

''پھر ہم کیا کریں؟'' وہ اس کو غصہ دلانے کو کہتے۔

''کاغذ کو اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دو۔'' وہ غصے سے چیختی۔

''تم رکھ دو' ہمیں ابھی فرصت نہیں ہے' جب فرصت ملے گی ہم اس پرچے کو اٹھا لیں گے۔''

مہناز غصے میں بھری اپنی کرسی سے اٹھتی اور پرچے کو اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دیتی۔ میرے اسسٹنٹ اس کے اس طرح کرنے پر خوب محظوظ ہوتے اور مہناز کی غیر موجودگی میں مزے لے لے کر مجھے پورا واقعہ سناتے کہ انہوں نے کس طرح جان بوجھ کر کاغذ زمین پر گرا کر غصہ دلایا۔ وہ بھی مہناز کی نفسیات سے واقف ہو چکے تھے۔

مجھے اس طرح کی باتیں سن کر حیرت بھی ہوتی اور خوشی بھی کہ وہ اپنے استاد کا اس طرح احترام کرتی ہے۔

ایک دن ایسی بات ہوئی کہ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ دوپہر کا وقت تھا میں گھر جانے سے قبل ایک نئے مقدمے کی فائل پڑھ رہا تھا۔ آفس میں اس وقت مہناز کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا' چپراسی کو اس نے کسی کام سے بھیج دیا تھا۔

''سر! مجھے آپ سے چند ذاتی سوال کرنا تھے اگر آپ مائنڈ نہ کریں؟'' مہناز نے بات کرنے کو تمہید باندھی۔

''بولو! میں سن رہا ہوں۔'' میں نے فائل پڑھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

''سر! آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے اپنی نظریں فائل سے اٹھا کر مہناز کی طرف دیکھا' اس نے اپنی نظریں نیچے کو جھکا لیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھئی شادی کو کوئی لڑکی تیار ہو جائے پھر شادی کر لیں گے۔''

''آپ سمجھ لیں کہ لڑکی تیار ہے' اب آپ بتائیں کیا ارادے ہیں؟''

''یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ جس لڑکی کو مجھ سے شادی کرنی ہے وہ تیار ہے اور وہ بے وقوف لڑکی ہے کون جو مجھ سے شادی کرے گی؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''سر! اگر میں کہوں کہ وہ لڑکی میں ہوں پھر آپ کا کیا خیال ہے؟''

''مہناز! تم سنجیدہ ہو یا مذاق کے موڈ میں......'' میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کو مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی ایک ایسی لڑکی نے مجھ سے شادی کی خواہش کی تھی جو مجھے بے حد پسند تھی لیکن میں یہ حقیقت بھی جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

''سر! میں بالکل سنجیدہ' ہوش و حواس میں یہ بات کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے مہناز کے گالوں پر لالی سی آ گئی تھی۔

''تم سنجیدہ ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ ایسا ممکن

نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے چہرے پر دکھ کی ایک لہر چھا گئی۔

''سر! مجھ میں ایسی کیا خامی یا کمی ہے جو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کیا میں خوب صورت اور سلیقہ شعار نہیں ہوں؟''

میرے انکار پر مہناز کا چہرہ اتر گیا تھا۔ آنکھیں بھر آئی تھیں شاید اس کو مجھ سے ہرگز ایسی امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح ٹھکرا دی جائے گی۔ اس کا خیال تھا میں فوراً شادی کو ہاں کر دوں گا۔ میرے انکار سے اسے بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔

''دیکھو مہناز! تم مجھ سے وجہ نہ پوچھو میرا دل دکھی ہو جائے گا۔'' میں نے خود کو قابو کرنے کی کوشش کی۔

حقیقت میں انکار سے میرا دل ٹوٹ گیا تھا اور میں قسمت کی ستم ظریفی کو دیکھ رہا تھا کہ قسمت نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا کہ میں اس سے شادی کرنے کی دل میں خواہش رکھتے ہوئے بھی شادی نہیں کر سکتا۔

''سر! آج آپ کو وجہ بتانا پڑے گی کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے۔ کوئی شادی کی بات کرے تو آپ آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ آخر آپ میں کون سی کمی ہے جو شادی نہیں کرتے۔'' مہناز نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

مہناز کی جگہ اور کوئی ہوتا تو میں اس کے اس طرح بدتمیزی کرنے پر تھپڑ رسید کر دیتا لیکن اس وقت میرے سامنے جو شخصیت تھی میرے دل میں اس کا بڑا احترام تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مہناز جب سے آئی تھی میں خود بھی اس کو چاہنے لگا تھا۔ اس کی غلطی بھی مجھے پیاری لگتی تھی۔

''ہمت سے کام لو' ایسے جذباتی ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' تم میری مجبوری کو سمجھو...... میرا بس چلتا تو میں ضرور تم سے شادی کر لیتا لیکن...... لیکن میں تم کو کس طرح سمجھاؤں۔'' یہ کہتے ہوئے میرے جذبات بھی بے قابو ہو گئے اور آنکھیں بھر آئیں' آواز بھرا گئی۔

''سر! آپ مجھے حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہے ہیں اور خود مرد ہو کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے۔'' مہناز نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''مہناز! میری زندگی کا یہ کڑوا سچ ہے جو میں کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔ میں ایسی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہوں جس کا علاج ناممکن ہے۔''

''سر! دنیا میں کوئی ایسا مرض نہیں جس کا علاج ممکن نہ ہو' سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہر مرض کا علاج ممکن ہو گیا ہے۔''

''یہ بات مجھے پتا ہے لیکن میں جس مرض میں مبتلا ہوں فی الحال اس کا علاج ابھی دریافت نہیں ہوا۔ دواؤں سے زندگی کو مزید کچھ عرصے کے لیے سانسیں مل جاتی ہیں لیکن مکمل علاج نہیں ہے۔ اگر تم میں حوصلہ ہے سننے کا تو بتا دوں کہ مجھے کیا مرض ہے؟''

''ہاں ہاں مجھ میں حوصلہ ہے آپ بتائیں؟''

''مجھے ایڈز ہے۔'' میں نے مہناز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

میرا خیال تھا کہ یہ بات سن کر مہناز کو حیرت کا جھٹکا لگے گا لیکن اس کو کچھ بھی نہیں ہوا۔

''لیکن سر یہ مرض آپ کو کیسے لگا؟''

''اپنی کچھ کوتاہی اور بے پروائی کے سبب یہ مرض لگ گیا ہے۔ یہ مجھے قدرت کی طرف سے سزا ملی ہے۔''

''سر! اس مرض کی وجہ سے آپ مجھ سے شادی نہیں کر رہے ہیں لیکن مجھے ہر صورت میں قبول ہے' آپ

ہاں کر دیں۔"

"مہناز! تم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟" میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا کہ یہ مہناز ہی ہے نا۔

"سر! میں سب جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں' میں بہت سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہوں۔"

"مہناز! یہ مذاق کی بات نہیں' تمہاری زندگی کا مسئلہ ہے۔ مجھے میرے اعمال کی سزا مل چکی ہے لیکن تم اپنی زندگی کو کیوں تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔"

"سر! احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

"احتیاطی تدابیر کے نتیجے میں تم کبھی ماں نہیں بن سکو گی جو ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔"

"مجھے بچوں سے زیادہ آپ پسند ہیں' مجھے آپ کے ساتھ گزارے لمحات اولاد سے زیادہ قیمتی ہوں گے۔" مہناز نے کہا۔

"یہ فلم یا ٹی وی کا ڈرامہ نہیں ہے تمہاری زندگی کا معاملہ ہے' عملی زندگی میں ایسی باتوں یا رومانوی باتوں کی حقیقت نہیں ہوتی۔ تم ایسا کرو جذبات میں آنے کی بجائے گھر جاؤ اور اس معاملے پر کم از کم تین ماہ غور وخوض کرو پھر مجھ سے بات کرنا۔"

"ٹھیک ہے سر! جہاں میں نے اتنا انتظار کیا کچھ اور سہی لیکن یہ بات آپ ذہن نشین کر لیں' تین ماہ بعد بھی میرا یہی جواب ہوگا۔" مہناز نے دوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

اس دن کے واقعے کو ایک ماہ' دو ماہ اور پھر تین ماہ گزر گئے۔ اس درمیان پھر ہماری اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میری بات مہناز کی سمجھ میں آ گئی ہے۔

ایک دن مہناز نے اپنا فیصلہ سنا کر مجھے حیران کر دیا۔ وہ اب بھی اپنے فیصلے پر قائم تھی۔ اس کے والدین اس رشتے کے سخت مخالف تھے لیکن انہیں اس نے جیسے تیسے منا لیا تھا۔ میں نے آخری بار بھی مہناز کو بہت سمجھایا کہ اپنا فیصلہ بدل دے اور اپنی اچھی زندگی گزارے۔ وہ کسی طور پر تیار نہ تھی۔ مجبوراً مجھے شادی کرنی پڑ گئی اس نے مجھے یہ کہہ کر لاجواب کر دیا تھا کہ میں سمجھ لوں گی کہ بانجھ ہوں اور تمام عمر ماں نہیں بن سکتی۔

ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے' میں مہناز کو اور مہناز مجھے پا کر دونوں بہت خوش تھے' اس نے مجھے حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانی دی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی وہ ہرگز بھی اس شادی پر تیار نہ ہوتی۔ احتیاطی تدابیر سے مہناز کو ایڈز نہیں ہو سکا تھا۔ ایک دن کار میں وہ مجھے لینے کے لیے کورٹ آ رہی تھی کہ اس کا ٹرک سے زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا وہ زخموں کی تاب نہ لا کر موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ اس کی موت کا مجھے بڑا صدمہ ہوا تھا۔ اس کی موت پر ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ جیتے جی کون خودکشی (حرام موت) کو ترجیح دیتا تھا' اس فیصلے سے مجھے کسی قدر تسکین محسوس ہوتی تھی۔ اپنی بقیہ زندگی میں' میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وکالت میں دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا تاکہ میری زندگی جو بچی ہے وہ کسی کے کام آ جائے۔

سرفراز کا مقدمہ میرے ایک دوست ملک اسماعیل راٹھور کی معرفت آیا تھا اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ وکیل کی فیس ادا کر سکے۔ میں اس کا مقدمہ بلا معاوضہ لڑ رہا تھا۔ ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی اور اس کا حل بھی آ گیا تھا۔ میں نے ان میں صلح کرانے کا پوری طرح سے سوچ لیا تھا۔

اس دن مقدمے کی ساعت تھی۔ مخالف پارٹی کے وکیل کی ہائی کورٹ میں مقدمے کی ساعت تھی'

اس لیے وہ ساعت پر حاضر نہیں ہو سکا۔ جج نے مقدمے کی نئی تاریخ پندرہ دن بعد کی رکھی تھی۔ میں بات کرنے کے بہانے زینت اور اس کے والد منور علی کو اپنے آفس میں لے آیا۔ میں نے زینت کے والد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ زینت کو طلاق کیوں دلانا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو معلوم نہیں سرفراز بہت چالاک انسان ہے۔ اس نے شادی کے وقت خود کو بڑا کاروباری ظاہر کیا تھا لیکن اب پتا چلا کہ وہ تو کتنے لوگوں کا مقروض ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کیا شکایت ہے آپ کو؟" میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکایت یہی ہے کہ وہ خرچے کی تنگی کرتا ہے۔ شروع میں اس نے بڑا خیال رکھا تھا لیکن اب اس نے میری بیٹی کا جینا حرام کر دیا ہے' چھٹانک بھر تیل بھی گھر میں لا کر نہیں دیتا ہے۔"

"آپ نے اپنی عمر گزاری ہے اچھا برا وقت سب پر آتا ہے' آپ پر بھی آیا ہوگا لیکن کیا کبھی برے وقت میں تمہاری بیوی کے والد نے اپنی بیٹی کو طلاق دینے پر تمہیں مجبور کیا۔"

"میری پوزیشن شادی کے وقت خستہ تھی' شادی کے بعد ہمارے حالات بہتر ہوتے چلے گئے تھے۔"

"آپ کے برے دن اچھے دنوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں پھر تمہارے داماد کے دن کیوں اچھے نہیں آ سکتے۔"

"آ سکتے ہیں میں نے کب کہا کہ اچھے دن نہیں آ سکتے' میں زینت کے بھلے کو یہ کر رہا ہوں اگر نیاز احمد کا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"اس طرح آپ کی بیٹی کا گلشن اجڑ جائے گا' ضروری نہیں کہ نیاز احمد سدھر گیا ہو' ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں پہلے سے زیادہ خراب ہو کر آیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پرانی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے آپ کی بیٹی کا گھر اجاڑنا چاہ رہا ہو۔"

"وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

"سوچیں اس کی جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے' انتقام بہت خطرناک حد تک انسان کو گرا دیتا ہے۔"

"آپ کی بات ہو سکتا ہے درست ہو لیکن زینت کے اچھے مستقبل کی خاطر یہ رسک لینا پڑے گا۔"

"آپ ایسا کیوں نہیں کر لیتے کہ اسے وقت سے پہلے آزما لیں جو بات طلاق کے بعد کرنی ہے وہ ابھی کر لیں۔ اسے یہی ظاہر کریں کہ تم نے اپنی بیٹی کو طلاق دلوا دی ہے' کوئی ڈیمانڈ ہو وہ بھی اس سے طے کر لیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں آپ درست کہتے ہیں یہ کام ہو سکتا ہے۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

دوسری ساعت پر جب منور علی آیا بڑا بجھا بجھا دکھائی دے رہا تھا' میں نے جب اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا۔

"وکیل صاحب! آپ کا اندازہ درست تھا' اس نے مجھے برادری اور خاندان میں ذلیل ورسوا کرنے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا تھا۔"

"اس نے کیا کہا؟"

"میں نے جب اسے بتایا کہ سرفراز نے غصے میں آ کر بھری عدالت میں زینت کو طلاق دے دی تو وہ خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ میں نے قہقہے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔" میں نے جو چاہا تھا وہ پا لیا' اپنی بے عزتی کا انتقام لے لیا ہے' مسٹر بڈھے! تم نے بڑے غصے میں میرے گھر والوں کو ذلیل کر کے گھر سے رخصت

کیا تھا تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری بیٹی سے شادی کروں گا تم ہوش و حواس میں ہو دو بچوں کی ماں سے شادی کر کے مجھے کیا ملے گا۔ مجھے برادری میں بے تحاشا کنواری لڑکیوں کے رشتے مل رہے ہیں، جس لڑکی پر ہاتھ رکھوں گا وہ میری ہو جائے گی۔ میرے انتقام کا اصل مزا اب آئے گا۔ تمہاری بیٹی کو کورٹ پہنچا کر بدنام کر ہی دیا تھا اب برادری کے لوگ تم پر انگلیاں اٹھائیں گے اور کہیں گے لالچی بڈھے نے اپنی بیٹی کا بسا بسایا گھر لالچ میں آ کر اجاڑ دیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور میرا ضمیر اندر سے مجھے کچوکے لگانے لگا تھا کہ دیکھ تو اپنی بیٹی کا آشیانہ خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑنے پر تلا ہوا تھا۔ تیری بیٹی کو حقیقت میں طلاق ہو جاتی تو کتنی بدنامی ہوتی برادری میں، وکیل صاحب میری ہمت نہیں ہوتی ہے سرفراز سے بات کرتے ہوئے آپ ہی کوئی ایسا وسیلہ نکالیں کہ زینت کو اس کا شوہر لے جائے۔"

"ٹھیک ہے سرفراز آجائے آپ اس سے کچھ نہ بولنا، جو بھی بولنا ہوگا میں ہی ان سے بات کر لوں گا۔"

سرفراز جب عدالت پہنچا میں اس کو ایک طرف لے گیا۔

"سرفراز! کیا تم چاہتے ہو تمہارا گھر بس جائے۔"

"میں کب نہیں چاہوں گا کہ میرا گھر بس جائے۔ گھر بسانے کی خاطر ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں پھر جیسا تمہیں کہوں وہ کرنا۔ میں جب تمہیں کہوں کہ سرفراز تم زینت کو گھر لے جاؤ، تم زینت کو چلنے کا اشارہ کرنا وہ تمہارے ساتھ چل دے گی لیکن دیکھو! گھر جا کر اسے کچھ مت کہنا اگر تم اپنا گھر آباد کرنا چاہتے ہو گلے شکوے پھر کبھی کر لینا۔ ایک ہفتے تک اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔"

"اس کے والد نے اگر اعتراض کیا تو پھر میں کیا کروں؟"

"وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔" میں نے کہا۔

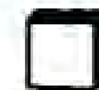
"ٹھیک ہے میں وہی کروں گا جیسا آپ کہیں گے۔" سرفراز نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

سرفراز کو جیسے ہی میں نے زینت کو لے جانے کو کہا۔ زینت اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ منور علی نے اس موقع پر گردن نیچے جھکا لی تھی۔

دو سال کا عرصہ گزر جانے پر ایک روز اچانک سرِ راہ میری ملاقات سرفراز سے ہو گئی۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے کہا۔

"وکیل صاحب! میرا ڈوبا ہوا پیسہ ملنے اور کچھ کاروباری دوستوں کے تعاون سے میرا کاروبار پھر سے چل پڑا ہے۔ زینت بھی اب خوش ہے۔ وہ نیاز احمد فراڈیا نکلا، سنا ہے کہ اس نے دبئی میں کوئی فراڈ کیا تھا اور اس کو وہاں سزا ہو گئی تھی۔ یہاں وہ اپنی قید کاٹ کر پاکستان لوٹا تھا لیکن اس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس نے باہر بہت کمایا ہے۔ اس نے برادری کے ایک نوجوان کو باہر ملک بھیجنے کے نام پر رقم لے کر اپنے خرچے میں استعمال کر لی تھی۔ پولیس نے نوجوانوں کے ساتھ دھوکا کرنے پر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا ہے۔ اس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ اس نے میرا گھر اجاڑ کر میرے سسر کو بدنام کرنا چاہا تھا لیکن آپ کی مہربانی سے وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہو سکا اور خود ہی بدنام ہو گیا اور اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔" سرفراز علی نے بتایا۔

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ میری کوشش سے ایک اور آشیانہ اجڑنے سے بچ گیا تھا۔



ادھورا انسان

محترم ایڈیٹر نئے افق!

السلام علیکم!

اللہ ہم سب کا اور ہمارے ملک کا حامی و ناصر ہو، آمین۔ 'نئے افق' مسائل اور واقعات کو منظرِ عام پر لانے اور ان کے متعلق آراء جاننے اور بحث و تمحیص کے ساتھ ساتھ کئی اہم معاملات کے متعلق معلومات اور رہنمائی فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے جو عموماً مصروف زندگی میں ہماری سوچ اور نظر سے اوجھل ہوتے ہیں اور عام معمولات زندگی میں ہم انہیں اتنا اہم تصور نہیں کرتے اور نہ ان کے متعلق سوچتے ہیں جتنا کہ ان کے متعلق غور و فکر کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے میری یہ معمولی سی بات، اک سوچ، اک نقطۂ نظر کسی کی نظر سے گزر کر خاص ہو جائے اور کسی کی زندگی پر اثر انداز ہو جائے یا پھر کسی کی سوچ کو بدل دے۔

دعا گو

فاخرہ سلطانہ

"اف! نہ جانے کب یہ مصیبت پیچھا چھوڑے گی؟ لوگوں کی مذاق اڑاتی نظریں اب مزید برداشت نہیں ہوتیں، گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا ہے۔" ملی جلی آوازوں کا شور تھکے تھکے اعصاب پر کوڑے برساتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن مزید بوجھل ہونے لگا۔

"نہیں...... نہیں پلیز پلیز مت مارو......" اس نے اضطراری انداز میں بازو پٹخے۔

"اسے درد ہوگا...... مت مارو...... یہ......" کئی آوازوں سے ملے جلے شور میں اسے اپنی آواز مبہم سی بھنبھناہٹ کی صورت سنائی دے رہی تھی، آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

"پلیز چھوڑ دو......" ایک بار پھر اسے اپنی مدہم سی سرگوشی سنائی دی۔ مسلسل بے چینی سے ہلتے، کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ وہ ہاتھ پاؤں کو اس طرح حرکت دے رہی تھی جیسے اسے اپنے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"مت مارو...... آخر یہ بھی انسان ہے...... بہت درد ہوگا...... مت......" بے ربط الفاظ اس کے خوابیدہ اعصاب کے ساتھ مسلسل جنگ کی کیفیت میں اس کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن تاریکی سے پیچھا چھڑانے کی بے پناہ کوشش کے باوجود مسلسل اس اتھاہ گہری سیاہی میں الجھتا ہی جا رہا تھا۔ اسے بہت حد سے سوا گھٹن ہو رہی تھی۔ تبھی اس نے اس ہٹے کٹے وجود کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کی نظر اس کے ہاتھ میں موجود اس سرنج پر گڑی تھی، جسے وہ اٹھائے اس وجود کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اضطراری انداز میں ہاتھ پاؤں چلانا چاہے اور بے اختیار اس ٹنڈ منڈ سے وجود کو اپنے پیچھے چھپانے کی سعی کی مگر اپنی تمام تر طاقت کو صرف کر کے بھی وہ ناکام رہی اور بے بسی سے ان دونوں کو اس کی طرف بڑھتے دیکھے گئی۔ اس کے ہونٹ مسلسل لرز رہے تھے۔ جیسے کچھ کہہ رہے ہوں، درحقیقت وہ پوری شدت سے چلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر کسی انجانی قوت نے اس کے بولنے کی طاقت کو سلب کر رکھا تھا۔ وہ پوری طاقت لگا رہی تھی بولنے کے لیے مگر اس کے ہونٹ بے بسی سے کپکپا کر رہ جاتے وہ دونوں اب اس ادھورے وجود کو جکڑے اس کے ٹنڈ منڈ سے بازو میں وہ سرنج گاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر

اپنی پوری طاقت لگا کر ان دونوں کو پرے دھکیل کر اسے اپنے پیچھے کرنا چاہا مگر وہ دونوں ہٹے کٹے طاقت ور وجود اسے اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دے رہے تھے اور بالآخر ان دونوں نے اس اڑھائی فٹ کے ٹنڈ منڈ ادھورے وجود تک رسائی حاصل کر لی اور ان میں سے ایک نے ہاتھ میں پکڑا انجکشن اس کے ٹیڑھے میڑھے سے بازو میں پیوست کر دیا۔

وہ وجود اضطرابی انداز میں تڑپا مگر دوسرے نے اسے بے دردی سے جکڑ لیا۔ آہستہ آہستہ ٹنڈ منڈ ادھورے وجود کی تڑپ اور حرکت سست پڑنے لگی۔ اک دل خراش چیخ اس کے لبوں تک آ کر دم توڑ گئی۔ اسے اپنا حلق چرتا ہوا سا محسوس ہونے لگا اور...... بے پناہ پیاس کی شدت کا یک دم احساس اس کے خوابیدہ اعصاب کو جھنجوڑنے لگا۔ شدید ترین خوف، بے چینی اور وحشت اس پیاس کے احساس پر غالب آئے اور اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا تنفس بے حد تیز چل رہا تھا جب کہ اس کے برعکس اس کے دل کی دھڑکن بہت مدہم اور جسم پسینے سے شرابور تھا۔ چند لمحے اس کا ذہن صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش میں تاریکی سے نبرد آزما رہا پھر اس کے تھکن اور خوف سے چُور اعصاب اس کے ذہن کو ایک بار پھر تاریکی کی سیاہ چادر میں لپیٹنے لگے اور وہ غافل ہو گئی۔

☆ ...... ۞ ...... ☆

پنسل کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے وہ مسلسل اپنی نظروں کو ایک ہی نقطے پر مرکوز کیے گہری سوچ میں ڈوبی اردگرد سے بالکل بے نیاز تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ پچھلے کئی دن سے اُس کا ذہن اس قدر الجھا الجھا کیوں رہتا ہے اور پچھلی چند راتوں سے اسے ایک ہی طرح کے خواب شکلیں بدل بدل کر کیوں اتنا مضطرب کر رہے ہیں۔ وہ جتنا ان خوابوں کا حقیقت سے موازنہ کرتی اتنا ہی مزید پریشان اور مضطرب ہو جاتی، وہ چاہ کر بھی اپنے ذہن کو ان پریشان کن سوچوں سے باہر نہ نکال پا رہی تھی۔ اس پر اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ دنیا ایک نارمل انسان کو بھی سکون سے جینے کی اجازت نہیں دیتی کجا کہ...... اس کے لبوں سے ایک گہرا سانس خارج ہوا اور تھک کر اس نے سر دیوار سے ٹکا دیا۔

☆ ...... ۞ ...... ☆

''نکولس جیمز......'' اس نے زیر لب دہرایا۔ آسٹریلیا میں پیدا ہونے والا ایک ادھورا انسان...... جس نے اپنے ادھورے پن کو اپنی کمزوری یا شکست کا سبب بننے دیا اور نہ قدرت کی دی ہوئی اس خامی اور اپنی معذوری کو اپنے اعصاب پر سوار ہونے دیا بلکہ اس نے ایک عزم کے ساتھ زندگی کو ایک ایسے رخ کی طرف موڑ دیا جس نے اس کی زندگی میں بے شمار کامیابیوں کے در کھول دیئے۔ ٹانگوں اور کاندھوں تک بازوؤں سے عاری ایک انسان کلی طور پر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے مگر جیمز نے نہ صرف اپنے روزمرہ کے کام خود کرنا سیکھے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ وہ دیگر سرگرمیوں اور مشاغل میں بھی بھرپور طریقے سے حصہ لیتا ہے۔ جس نے اکیس سال کی عمر میں آسٹریلیا کی ایک یونیورسٹی سے اکاؤنٹنگ اور فنانشل پلاننگ کی ڈگری حاصل کی۔ جس کی کامیاب زندگی اس کے عزم و حوصلے کے ساتھ ساتھ اس کی اور اس کی فیملی کی محنت و لگن کی زندہ تصویر ہے۔ وہ ڈائجسٹ ہاتھ میں پکڑے اس آسٹریلین شخص کی مختصر سی بائیوگرافی کو بغور پڑھ رہی تھی۔ جس کے ساتھ چھپنے والی اس ادھورے انسان کی تصاویر کو وہ بغور دیکھنے لگی، یک دم ان تصاویر میں ایستادہ اس آسٹریلین شخص کی بجائے اسے ایک اور ادھورے وجود کا عکس نظر آنے لگا۔ نقوش بدلتے گئے اور

پھر آہستہ آہستہ چہرہ واضح ہونے لگا۔ اب وہاں ایک بڑا سا سر اور ڈھائی فٹ کا ایک ٹنڈ منڈ وجود نظر آ رہا تھا۔ نجانے کتنی ہی دیر وہ ایک ہی زاویے پر بیٹھی ذہن کے پردے پر ابھرے عکس کو گھورتی رہی۔ اس کا تصور اسے اس کے لاشعور میں موجود ان تمام مناظر اور کرداروں کو بے حد واضح طور پر دکھا رہا تھا جو اس کے لاشعور کے پردے میں نا چاہتے ہوئے بھی کہیں دبکے، چھپے بیٹھے تھے۔ اتفاقاً اس کے سامنے ایسی چیزیں بار بار بذاتِ خود آ رہی تھیں۔ جن کا تعلق اس کی موجودہ فیلڈ سے تھا۔ دن بھر وہ انہی ساری چیزوں کا حصہ رہتی اور رات کو اس کی دن بھر کی مصروفیات اور خیالات، خوابوں کا لبادہ اوڑھ کر ایک بار پھر اس کے لاشعور سے ابھر کر سامنے آ جاتے۔ یہی سلسلہ مسلسل کئی راتوں سے اسے سکون سے سونے نہ دے رہا تھا۔ ہر روز ایک تھکن زدہ سی نیند کے بعد اس کا سارا دن بوجھل اور گھٹا گھٹا سا گزرتا۔ ایک انجانا سا بوجھ اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ وہ آتے جاتے جب جب اس کے ادھورے وجود کو دیکھتی۔ اسے وہ تمام خواب اپنے سامنے مجسم اور ہر خواب کے سب کردار اپنے اردگرد ناچتے محسوس ہوتے۔ جو وہ کئی راتوں سے مسلسل دیکھ رہی تھی۔

☆ ...... ۞ ...... ☆

ٹنڈ منڈ سے بازو کی صرف دو انگلیوں میں پنسل دبائے دوسرے بازو کی انگلیوں سے عاری ہاتھ سے نوٹ بک جکڑے وہ اپنا ہوم ورک لکھنے میں مگن تھا۔ یک دم اسے زور کا جھٹکا لگا اور وہ دونوں چیزیں جنہیں وہ بمشکل سنبھال کر پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گریں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، غصے نے اسے پل بھر میں بے قابو سا کر دیا۔ وہ اس کے بڑے سے سر پر ایک زوردار چپت رسید کرنے کے بعد اسے چڑانے کے لیے اس کے اسکول بیگ سے دیگر چیزیں نکال نکال کر اِدھر اُدھر اچھالتا جا رہا تھا، اس نے خود پہ قابو پاتے ہوئے خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنی شروع کر دیں۔ وہ ایک چیز اٹھاتا اور دوسری کی طرف لپکتا، اسے اٹھا کر جونہی واپس پلٹتا پہلی اٹھائی ہوئی چیز اسے کمرے کے کسی دوسرے کونے سے ملتی۔ کچھ دیر تک وہ نہایت تحمل سے چیزیں اٹھا اٹھا کر اکٹھی کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا دیکھ کر ایک کاٹتی ہوئی سی شاکی نظر اپنے بڑے بھائی پر ڈال کر وہ رینگتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ...... ۞ ...... ☆

''حماد! آپ نے صرف ایک بک کا ہوم ورک کیا، باقیوں کا کیوں نہیں ہوا؟'' وہ جس بات کو سوچ سوچ کر خوف و فکر میں مبتلا تھا وہی ہوا۔ اس نے بنا کچھ کہے سر جھکا لیا۔ ''میں نے کچھ پوچھا ہے؟'' جواب نہ ملنے پر اس نے ذرا سخت لہجہ اپنایا مگر جواب پھر ندارد......

''حماد......'' اس کی خاموشی کو اس کی ڈھٹائی تصور کرتے ہوئے اس کی آواز میں درشتی در آئی۔

''ٹیچر وہ......'' اسپیشل بچوں کی کلاس میں بولنے سننے کی صلاحیت رکھنے والے صرف تین بچے تھے۔ جو جسمانی معذوری کا شکار تھے مگر دیگر بچوں کی نسبت بول سن سکتے تھے۔ حماد ان میں سے ایک تھا، وہ نہ صرف بول سن سکتا تھا بلکہ کلاس میں اس کی کارکردگی بہت بہتر تھی اس کے اعضاء مکمل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی لکھائی باقی بچوں سے کہیں خوب صورت اور عمدہ تھی۔ ایک ہاتھ کی دو انگلیوں سے وہ نہایت نفاست اور عمدگی سے لکھتا۔ اسے دیکھ کر اس کے دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ یہ بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے اور اپنی جسمانی کمیوں کے باعث معاشرے پر بوجھ نہ بنے مگر پچھلے کئی دن سے بہترین ہوم ورک کی جگہ خالی صفحات اس کو

مایوس کن حد تک بے زار کر رہے تھے۔ شروع کے دو تین دن اس نے تنبیہہ کر کے ہوم ورک باقاعدگی سے کر کے لانے کی تلقین کی۔ کلاس ورک میں اس سے کوئی غلطی نہ ہوتی تھی مگر اب...... وہ زچ ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اسے عجیب لگتے۔ کبھی کبھی وہ ان بچوں کو دیکھتے دیکھتے ایک عجیب انجان سا خوف محسوس کرتی۔ کبھی کسی بچے کی کوئی بات اس کے ذہن کو اتنا جکڑ لیتی کہ کئی کئی دن وہ اس کے اثر سے نہ نکل پاتی۔ راتوں کو اس کو وہی بے ضرر سے بچے عجیب و غریب، خوف ناک روپ دھارے خوابوں میں ہراساں کرتے۔ وہ خود کو پھر بھی پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتی، یہ کہہ کر کہ خواب تو خواب ہیں مگر...... وہ خود کو پُرسکون نہیں رکھ پا رہی تھی۔ حد سے زیادہ حساس ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک انجانا سا خوف، جس کی کوئی معقول وجہ، درحقیقت اس کو نظر نہ آ رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے بے پناہ غصہ آنے لگتا پھر وہ بلاوجہ چڑنے لگتی، کبھی کبھی وہ بالکل نارمل ہو جاتی۔ ان دنوں اس کی طبیعت اور مزاج میں ٹھہراؤ کا فقدان تھا۔

﴾☆﴿......❁......﴾☆﴿

کئی بار سختی سے باز پرس کرنے پر حماد نے اسے اپنے کام کی بُری کارکردگی کا جو سبب بتایا اس نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔ ایک پل کو وہ متحیر سی اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ ایک دم سے اس کی طبیعت بوجھل سی ہونے لگی۔ اس کا کوئی کام کرنے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔ اس کا دل کلاس چھوڑ کر گھر جانے کو چاہ رہا تھا۔ اسے تنہائی کی شدید خواہش ہوئی، مگر پھر کسی طرح خود پر قابو پاتے ہوئے وہ بچوں کو کام کرواتے ہوئے اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی جس میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی اور وقت کٹ گیا۔

﴾☆﴿......❁......﴾☆﴿

"کون سے اسکول میں پڑھاتی ہو......؟" خاتون اس کا ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔ مریم رک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جی...... اسپیش......" اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ ان کے ساتھ موجود خاتون نے اس کی بات اچک لی۔

"اے یہ جو لولے لنگڑوں کا اسکول ہے وہیں تو پڑھاتی ہے۔" اس خاتون کی معلومات پر اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی جب راستے میں ان دونوں خواتین نے اسے بلاوجہ روک کر تفتیش شروع کر دی تھی، وہ سخت متاسف ہوئی ان کے الفاظ پر۔

"لولے لنگڑے......" اس نے زیر لب دہرایا۔

"اسے سمجھ آ جاتی ہے ان کی باتوں کی؟ کیسے پڑھاتی ہو ان کو؟" اسے جواب کا موقع دیئے بغیر وہ مسلسل آپس میں تبصرے بازی کے ساتھ ساتھ اسے بھی مخاطب کر رہی تھیں، وہ مروتاً وہاں رکی ہوئی تھی اگرچہ دل تو چاہ رہا تھا آگے بڑھ جانے پر......

"یہ بھی نارمل بچوں کی طرح سب کاموں کو سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر اللہ نے ان کو کسی بھی طرح کی کسی کمی کے ساتھ پیدا کیا تو کیا ہوا، بدلے میں اللہ نے انہیں اور بہت سی خصوصیات سے نواز دیا، یہ لوگ عام لوگوں سے کمتر اور ترس و ہمدردی کے محتاج نہیں۔" اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی خاتون پھر سے بے تکان بولنا شروع کرتی، اس نے تیز لہجے میں کہا اور آگے بڑھنے کے ارادے سے مڑی۔

"اونہہ! ہوتے تو پھر بھی بھک منگے ہی ہیں۔" جس خاتون نے سب سے پہلے اسے مخاطب کیا تھا، انتہائی نخوت و تکبر سے کہہ کر واپس پلٹ گئی۔

"اُف میرے اللہ! انہیں ہدایت عطا فرما۔" اس نے بے ساختہ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

﴾☆﴿......❁......﴾☆﴿

"حماد بہت دنوں سے غیر حاضر ہے، کیوں نہیں آ رہا وہ......؟" اس نے بولنے کی صلاحیت رکھنے والے ایک بچے کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"ٹیچر! وہ کہہ رہا تھا، اسکول چھوڑ دے گا۔"

"کیوں......؟" بچے کی بات پر بے ساختہ سر اٹھا کر اس نے اچنبھے سے پوچھا۔ یک دم اسے لگا اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

"ٹیچر وہ کہہ رہا تھا اس کے امی ابو اسکول آنے سے منع کرتے ہیں۔"

"پر کیوں......؟" بوکھلاہٹ میں اس نے بچے سے بے تکا سا سوال کیا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ ابو کہتے ہیں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اس کے اسکول جایا کرنا اب......"

"پر وہ اس کے ساتھ جنرل ایجوکیشن میں کیسے پڑھے گا وہ تو......" وہ الجھ کر پریشان سی گویا ہوئی۔ جب کہ بچے نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر کاندھے اچکائے، وہ گم صم سی رہ گئی۔

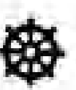
﴾☆﴿......❁......﴾☆﴿

نجانے کیوں حماد کی ذات اس کے ذہن پر سوار ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کے شہر سے ملحقہ ایک گاؤں سے آتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ خاندان جہاں خصوصی بچہ ہو، ان کے لیے اس خصوصی بچے کی معذوری کو تسلیم کرنا، اس کا علاج کروانا اور سب سے اہم بات اس بچے کی معذوری پر خاندان کے کچھ افراد کا معاشرے کے افسوس ناک رویئے کا سامنا کرنا، یہ سب بہت مشکل مراحل ہوتے ہیں، جن پر قدم قدم پر دل آزاری ہوتی ہے انسان کی۔ بعض اوقات ابنارمل بچوں کی وجہ سے ایسے خاندان معاشرے سے بالکل کٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

لیکن بہت کم لوگ اس بات پر غور کرتے ہوں گے کہ ابنارمل نظر آنے والے لوگ معاشرے کے جن چند افراد کی وجہ سے معاشرے سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے صحت مند اور نارمل افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا رویہ غیر صحت مندانہ اور ابنارمل ہوتا ہے۔ جو دوسروں پر تنقید کرتے اور ان کی توہین و تضحیک بڑے شدومد کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ لوگ بذاتِ خود کسی نہ کسی طرح سے معذوری کا شکار ہوتے ہیں "ذہنی معذوری" کا شکار...... بیمار ذہنوں کے حامل سطحی سوچ رکھنے والے "ذہنی معذور...... جو معاشرے کا ناسور ہیں۔ حماد اور اس جیسے لوگ بھی جی ہی لیں گے، یہ زندگی تو گزر ہی جانی ہے۔ چاہے جس طرح سے گزرے۔ خصوصی بچے کسی بھی خاندان اور افراد کی آزمائش ہوتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کے ایسے لوگ جو "اس خاص ذہنی معذوری" کا شکار ہیں۔ بیمار سوچ رکھتے ہیں وہ بھی ایک آزمائش میں مبتلا ہیں مگر وہ جانتے نہیں......۔

ایسے ہی لوگوں کی "ذہنی معذوری" کے سبب حماد جیسے نجانے کتنے خصوصی افراد مایوسی کا شکار ہو کر گمنامی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذرا کوئی سوچے تو سہی ہمارے معاشرے میں کوئی حماد "نکولس جیمز" کیوں نہیں بن سکتا......؟ کیوں......؟



قسط نمبر 11

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

عشرت زمین پر دو زانو بیٹھی ہاتھ جوڑے سر جھکائے رو رہی تھی اور نفیسہ مسلسل اسے اکسا رہی تھی کہ عشرت نے حویلی میں جو کچھ بھی دیکھا ہے وہ سب بیان کردے۔

تھوڑی دیر ماحول میں شدید ٹینشن کی فضا طاری رہی۔ میرے دماغ کی رگیں پھٹ رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے کبھی یہ خیال آتا کہ نفیسہ سچ کہہ رہی ہے کیونکہ سطوت کی جو شخصیت کھل کے اب میرے سامنے آئی تھی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ نفیسہ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے' دوسری جانب میرے دل میں جو سطوت کی محبت تھی وہ مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہی تھی کہ سطوت ایسے نہیں ہوسکتے۔ میں سوچوں میں گم تھی کہ عشرت کی آواز سن کر میں حال میں واپس آگئی وہ کہہ رہی تھی۔

''بی بی ہوسکتا ہے کہ اپنی زبان کھول دینے کے جرم میں مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں لیکن آج میں چپ نہیں رہوں گی۔ میں ایک بار پھر اپنی فرحت کو مرنے نہیں دوں گی۔ میری معصوم فرحت بھی حویلی والوں کی درندگی کا شکار ہوئی تھی اس کی عمر تو صرف سولہ برس کی ہی تھی نہ جانے کس نے اس کے ساتھ ظلم کیا کہ مارے خوف کے اس نے اپنی زبان ہی نہیں کھولی میں تو صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ بڑی بیگم نواب صاحب کی پہلی بیوی کی ملازمہ تھی۔ بڑی سندر بڑی شوخ ہر وقت ہنستی رہتی تھی یا پھر ان کی بچیوں کا خیال رکھتی تھی۔

نہ جانے کب اور کس نے ان کے کمرے میں اس پر ظلم کیا کہ اس کا پاؤں بھاری ہوگیا۔ میں تو آج بھی یہ بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ میری بیٹی نے اس رات کا واقعہ مجھے سنایا تھا۔'' اتنا کہہ کر عشرت خاموش ہوگئی اور وحشت زدہ نگاہوں سے نفیسہ کی جانب دیکھنے لگی۔

''تو گھبرا کیوں رہی ہے' اصل مجرم کا نام بتاتی کیوں نہیں۔ مت گھبرا شاباش روشن آرا کو اپنے دکھ کی

ساری داستان سنا۔'' نفیسہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''تو کیا تمہیں معلوم تھا کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ زیادتی کس نے کی تھی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔ دہشت اور وحشت ایک ساتھ اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

''میں کئی روز سے دیکھ رہی تھی کہ فرحت بالکل گم صم ہوکر رہ گئی تھی نہ کھاتی پیتی تھی اور نہ بات کرتی تھی۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوتی اور میں اگر اچانک چلی جاتی تو وہ اچھل پڑتی اور خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتی تھی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا میں جب کمرے میں گئی تو میری آہٹ سنتے ہی وہ خوف سے اچھل کر کھڑی ہوگئی اور تھر تھر کانپنے لگی۔

''ارے کیا ہوا تجھے؟ تُو تو اس طرح ڈر کر اچھلی ہے جیسے کوئی بھوت کمرے میں آگیا ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا تو اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گئی اور اپنے وجود کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنے گھٹنوں کو سمیٹ کر اپنے بازوان کے گرد کس دیے۔ مگر اس کے باوجود وہ کپکپا رہی تھی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی اور اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے پوچھا۔

''کیا بات ہے فرحت تو اتنی ڈر کیوں رہی ہے؟ میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں تو بالکل گم صم ہوکر رہ گئی ہے۔ نہ کھانا کھاتی ہے نہ ہنستی بولتی ہے کیا بات ہے میری بچی مجھے تو بتا۔''

''اماں۔'' فرحت کے لبوں سے ایک دبی دبی سی چیخ نکلی اور وہ میرے گلے لگ کر بری طرح رونے لگی۔

''ارے...... رے...... رے کیا ہوا؟'' میں اور زیادہ پریشان ہوگئی۔

لیکن وہ بنا کوئی جواب دیے دیر تک میرے گلے لگ کر روتی رہی اور میں پیار سے اس کی پشت سہلاتی رہی۔ میں یہ سمجھ رہی تھی کہ بڑی بی بی نے اسے کسی بات پر ڈانٹا اور مارا ہے جب ہی یہ اتنی ڈری ہوئی اور خوفزدہ ہے۔ یا پھر حویلی میں اس کے ہاتھوں کسی چیز کا نقصان ہوگیا ہے اور بڑی بی بی نے اس کو مارا ہے۔ دیر تک رونے کے بعد وہ خود ہی میرے گلے سے ہٹ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

''اماں تجھے پتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''اری ہاں میں جانتی ہوں تجھے بڑی بی بی سے مار پڑی ہے۔ جب ہی تو اتنا رو رہی ہے۔ اری میری بچی اس میں اتنا رونے کی کیا بات ہے' ہم تو جدی پشتی ان کے خادم ہیں غلام ہیں۔ ان کا جو دل چاہے ہمارے ساتھ سلوک کریں۔ اس میں اتنا رونے کی کیا بات ہے۔'' میں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''کاش اماں بڑی بی بی مجھے مارتی اور اتنا مارتی کہ میرا دم نکل جاتا تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔'' فرحت نے روتے ہوئے کہا۔

''اری تو پھر کیا ہوا؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اماں وہ...... اماں وہ میں......!'' اس سے بولا ہی نہیں جارہا تھا۔

''کیا وہ میں' وہ میں کی رٹ لگائی ہوئی ہے صاف صاف کیوں نہیں بتاتی کہ کیا ہوا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر جھنجلا کر کہا کیونکہ میں ابھی حویلی سے کام سے فارغ ہوکر لوٹی تھی۔ پورے دو گھنٹے بڑی بی بی کے پاؤں دبائے تھے۔ میری خود ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔

''اماں میں رات کو بڑی بی بی کے لیے دودھ کا گلاس لے کر گئی تھی تو وہاں پیر سائیں بیٹھے تھے۔ اماں وہ بوتل سے گلاس میں ڈال ڈال کر کوئی شربت پی

رہے تھے۔ بڑی بی بی کمرے میں موجود نہیں تھی تو میں گلاس مسہری کے برابر والی میز پر رکھ کر پلٹنے لگی تو پیر سائیں نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ تو میں رک گئی۔

''ادھر آ لڑکی۔'' انہوں نے کہا تو میں ڈرتی کانپتی ان کے نزدیک چلی گئی مجھے انہیں دیکھ کر بہت ڈر لگا اماں ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں۔ وہ مجھ سے بولی۔

''کدھر جاتی ہے ادھر آ ہمارے پاؤں دبا۔''

اماں میں کھڑے کھڑے ان کے پاؤں دبانے لگی تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس میز پر رکھ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کھینچ لیا اور اماں......اور اماں ان کے منہ سے بڑی خراب بو آرہی تھی میرا جی متلانے لگا۔

اتنے میں بڑی بی بی کمرے میں آگئیں تو پیر سائیں نے انہیں ڈانٹ کر کمرے سے نکل جانے کو کہا تو وہ فوراً ہی واپس پلٹ گئیں اور جاتے جاتے دروازہ بھی بند کر گئیں اور اماں...... ان...... انہوں نے...... مجھے برباد کر ڈالا......!'' یہ کہہ کر وہ پھر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

''یہ تو کیا کہہ رہی ہے فرحت......!'' میرا تو دماغ ہی بھک سے اڑ گیا اور میں نے جھٹ اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ پھر دیر تک ہم ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر روتی رہیں۔ میں نے فرحت کو سختی کے ساتھ منع کیا کہ خبردار یہ بات کسی کے آگے مت کہنا ورنہ نہ تو زندہ رہنے گی اور نہ میں۔

''لیکن اماں پیر سائیں تو ہمارے سائیں ہیں۔ وہ ہم سب کے سروں پر سایہ ہیں ہم تو ایک باپ کی نگاہ سے انہیں دیکھتے ہیں۔ کتنے لوگ ان کے پاس دعا کے لیے آتے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک غریب اور یتیم کے ساتھ ایسا برا کام کیوں کیا۔'' فرحت نے روتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''بس میری بچی یہ بات تو وہی جانیں بس اب تو اپنے ہونٹ سی لے صبر کرلے جو ہونا تھا ہوچکا ہماری اتنی اوقات نہیں ہے کہ ہم اس ظلم کی شکایت کسی کے پاس لے کر جائیں ہم تو ان کے غلام ہیں اور غلام کو کچھ کہنے سننے کا حق نہیں ہوتا۔ اسے تو صرف برداشت کرنا ہوتا ہے چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

''اماں آج بھی پیر سائیں حویلی میں آئے ہوئے ہیں اس لیے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' فرحت نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں تو حویلی مت جانا میں بڑی بی بی سے کہہ دوں گی کہ تجھے تپ چڑھی ہوئی ہے۔'' میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹالیا۔

اس ساری رات مارے دکھ اور صدمے کے میں سو نہیں سکی میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں تو اپنے رب سے شکوہ بھی نہیں کرسکتی تھی کہ مجھے حویلی کے غلام شوکت کے گھر کیوں پیدا کیا اور اگر مجھے پیدا کر بھی دیا تھا تو مجھے بیٹی کیوں دی تھی اللہ تعالیٰ ایک بیٹا ہی دے دیتا جو ساری عمر حویلی کی غلامی کرکے ایک دن مرجاتا۔

اور پھر اگلے ماہ فرحت کو الٹیاں آنے لگیں۔ بڑی بی بی بڑی عقابی نگاہ رکھتی تھی شاید اس لیے بھی وہ فرحت کا کڑی نگاہوں سے جائزہ لے رہی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ اس کے سائیں نے فرحت کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس نے ڈپٹ کر مجھ سے کہا۔

''عشرت فرحت کو الٹیاں کیوں آرہی ہیں۔''

''پتا نہیں بڑی بی بی شاید کچھ الٹا سیدھا کھالیا ہوگا ٹھیک ہوجائے گی خود ہی لوٹ پوٹ کر۔'' میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ کیوں کہ میرا دل انجانے خدشوں میں گھر گیا تھا۔

''مگر مجھے تو اس کی چال ہی بدلی ہوئی لگ رہی ہے۔ سچ سچ بتا کیا بات ہے؟'' انہوں نے تیز نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا ان کی تیز نگاہیں مجھے اپنے اندر کسی برچھی کی مانند اترتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں یا پھر وہ یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ فرحت نے مجھے کیا بتایا ہے۔

''جا جا کے دائی حکیمہ کو تو بلا کر لا۔'' انہوں نے مجھے حکم دیتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیوں......؟'' میں نے بری طرح چونک کر خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''میں فرحت کو اسے دکھاؤں گی مجھے تو کوئی اور ہی شک ہورہا ہے۔ اس کی رنگت تو دیکھ کیسی ہلدی کی طرح زرد ہورہی ہے۔'' بڑی بی بی نے رعونت بھرے لہجے میں کہا۔

بڑی بی بی کی باتیں سن کر بہت سارے اندیشے ناگ کا سا پھن اٹھا کر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی کہ ایسی ویسی بھی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ اب اگر حقیقت میں ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ بڑی بی بی ہر بات جانتے ہوئے بھی حشر برپا کردے گی اور فرحت کو اس گناہ کی جس میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی بہت بری سزا دے گی اور میں میں کیسی مجبور اور بے کس ماں تھی کہ اپنی بیٹی پر ہونے والے ظلم پر آواز بھی نہیں اٹھاسکتی تھی۔ میری تو جنم گھٹی میں ہی پیر سائیں اور ان کے خاندان والوں کی خدمت اور ادب کا سبق گھول کر پڑھایا گیا تھا۔ ہم اپنے ماں باپ سے تو تو تکار کرسکتے تھے لیکن ان لوگوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

''آپ کو غلط فہمی ہورہی ہے بڑی بی بی فرحت تو کنواری بچی ہے پھر ایسی بات۔''

''بکواس نہ کر۔'' بڑی بی بی نے میری بات کاٹ کر دہاڑ لگائی۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ کنواری ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کے ساتھ منہ کالا کر بیٹھی ہو۔ پیروں کی حویلی میں ایسی گناہ کی بات توبہ توبہ چل جا تو جا کر حکیمہ کو بلا کر لا اور اپنی لونڈیا کو بھی بلا کر لا۔ جلدی کر......!'' بڑی بی بی نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا ہر طرف سے جائزہ لیا تو میں لرزتی کانپتی اٹھی اور لرزاں قدموں سے حکیمہ کو بلانے چلی گئی ساتھ ہی میں فرحت کو بھی لے آئی۔

ہم دونوں ماں بیٹی مجرموں کی طرح سر جھکائے فرش پر بیٹھی تھیں کہ حکیمہ تیز تیز چال چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی مگر ایک دم اس کے قدموں کو بریک لگ گئے بڑی بی بی کو دیکھ کر وہ مؤدب انداز میں سر جھکا کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''آپ نے بلایا تھا بڑی بی بی۔''

آ گئی تو! ادھر آ اور ذرا اس عشرت کی لونڈیا کو دیکھ کر بتا کہ اس کو بار بار متلی اور قے کیوں ہورہے ہیں کہیں ایسی ویسی بات تو نہیں ہے۔'' بڑی بی بی نے کہا تو حکیمہ چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگی اور بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

''یہ تو کنواری ہے۔''

''زیادہ بڑبڑ نہ کر اس کو دیکھ۔'' بڑی بی بی نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا پھر فرحت کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''چل لڑکی ادھر حکیمہ کو دکھا۔''

''کک...... کیوں میں نہیں......!'' میری بچی تڑپ گئی۔

''پہلے گل کھلاتی ہے اب جان کیوں نکل رہی ہے۔'' بڑی بی بی اپنی جگہ سے اٹھی اور آ کر فرحت

کے پہلو میں اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

اور پھر حکیمہ نے ذرا ہی دیر میں وہ روح فرسا خبر سنادی جس کو سن کر مجھے بڑے زوروں کا چکر آنے لگا۔ بڑی بی بی بے پناہ مغلظات بک رہی تھی۔ وہ بار بار فرحت سے اس کا نام پوچھ رہی تھی تب فرحت نے کراہتے ہوئے کہا۔

”بڑی بی بی وہ آپ......اس روز......!“

”خاموش نانہجار......آوارہ......کمینی......پیروں کی حویلی میں ایسے گناہ کرے گی۔“ وہ زور سے دہاڑی شاید فرحت اسے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ آپ ہی تو اس رات دروازہ بند کرکے مجھے اپنے ظالم شوہر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

”اس سے پہلے کہ حکیمہ یہ بات کل ساری حویلی میں گردش کرے اور پیر سائیں کے کانوں میں پڑے اس حرام کے تخم کو ختم کردے اور ہاں عشرت میں نے فضل دین کو بلایا ہے وہ اکیلا زندگی گزار رہا ہے میں فرحت کا اس سے نکاح کردوں گی۔ اچھا ہے اس کا عیب چھپ جائے گا اور فضل دین کا بڑھاپا سنور جائے گا۔“ بڑی بی بی نے حکم صادر کیا اور پھر ہمیں اپنے کمرے میں چلے جانے کا حکم دے دیا۔ حکیمہ فرحت کو لے کر اپنے ساتھ چلی گئی اور میری بچی روتے ہوئے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی رہی میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

پھر میرے کانوں نے اپنی بچی کی گھٹی گھٹی چیخیں سنی۔ تھوڑی دیر بعد حکیمہ گھبرائی ہوئی باہر نکلی اور دوڑتے قدموں سے حویلی کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے فرحت کی دبی دبی چیخیں اور کراہیں سنائی دیتی رہیں پھر یہ آوازیں آنا معدوم ہوگئیں۔ میں کمرے کے باہر فرش پر سر نیوڑہائے بیٹھی تھی۔

پھر میں نے دیکھا کہ بڑی بی بی حکیمہ کے ساتھ تیز تیز قدموں سے آرہی ہیں وہ حکیمہ کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلیں ذرا دیر کو میرے پاس رکیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کہتے کہتے رک گئیں۔ پھر آگے بڑھ گئیں مگر پھر پلٹ کر آئیں اور بولی۔

”وہ مرگئی ہے مگر خبردار جو ایک لفظ بھی کسی کے آگے بکا سب سے یہی کہنا کہ اسے ہیضہ ہوگیا تھا۔“ اور پھر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئیں۔ میں آنکھیں پھاڑے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ یہ بڑی بی بی کیا کہہ گئیں۔ میری فرحت میری بیٹی مرگئی۔ میری ویران زندگی میں ایک یہی تو روشنی کی کرن تھی میری شادی بھی حویلی کے پرانے اور بوڑھے خدمت گزار عبدالرشید سے کردی گئی تھی جو ایک بیٹی کا تحفہ دے کر بلغم تھوک تھوک کر مرگیا تھا۔

میری معصوم بچی رات کے اندھیرے میں دفنادی گئی۔ میں غم سے نڈھال تھی کہ بڑی بی بی نے مجھے حویلی بلوایا اور کہا۔

”زیادہ افسوس کرنے کی ضرورت نہیں وہ بدکار تھی اچھا ہوا قدرت نے خود ہی اس کا پردہ ڈھک دیا۔ شکر کرو کسی کو بھی اس کے گناہ کے بارے میں نہیں معلوم۔“

”بڑی بی بی اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بچہ......!“ میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”خاموش۔“ بڑی بی بی نے قہر آلود لہجے میں آنکھیں نکال کر کہا۔ ”ایک لفظ بھی آگے منہ سے مت نکالنا۔ تو کیا چاہتی تھی وہ پیر سائیں کی اولاد پیدا کرتی۔ تم جیسے کمی کمینوں کو اس کا کیا حق ہے۔“ اس نے فرعونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”چل دفع ہوجا یہاں سے۔“

اور پھر جب سائیں حویلی آئے تو مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میری بیٹی کہاں ہے تو میں نے جواب دیا کہ وہ گزر گئی۔ تو انہوں نے آگے سے کچھ نہیں کہا۔

آپ بھی میری فرحت کی طرح مظلوم ہو۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ اگر آپ کے گھر بیٹا نہ ہوا تو یہ لڑکی کو ماردیں گے آگے سے دو بیٹیاں موجود ہیں۔“

اتنا کچھ بتا کر عشرت خاموش ہوگئی اور نہ جانے کیوں میرا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ نفسہ تو چلی گئی لیکن میری طبیعت بہت خراب ہونے لگی۔ مجھے رات میں بہت بے چینی رہی تھی۔ بار بار بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ عشرت کی داستان الم سن کر ہی میں خوف و دہشت کا شکار ہوگئی تھی اور بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اگر میری بیٹی پیدا ہوئی تو وہ ظالم انسان اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ دے گا اس نے اس آس میں ابھی تک اس کو زندہ رکھا ہوا ہے کہ میرے ہاں بیٹا پیدا ہونے والا ہے۔

عشرت میری بے قراری کو دیکھ رہی تھی وہ میرے پاس بیٹھی مجھے تسلیاں دے رہی تھی۔ میرے پہلو میں درد کی ایک تیز لہر اٹھتی اور میں نڈھال ہوجاتی۔ بچے کی پیدائش میں ابھی ٹائم تھا اس لیے میں سمجھ نہ سکی عشرت نے کہا کہ صبح ہوجائے تو اسپتال جا کر دکھا دیجیے گا۔ لیکن صبح ہونے ہی نہیں پائی اور میری بچی دنیا میں آگئی۔

اس وقت میرے پاس صرف عشرت تھی اس نے ہی سب کچھ سنبھالا۔ میرے جب ہوش و حواس بہتر ہوئے تو عشرت نے بیٹی کی پیدائش کی خبر سنائی۔

میں نے تڑپ کر اپنی بانہیں عشرت کے سامنے پھیلائیں اور اپنی بچی کو سینے سے اس طرح لگالیا جیسے مرغی اپنے بچے کو اپنے پروں میں چیل کے ڈر سے چھپالیتی ہے۔

”اب کیا ہوگا عشرت نواب صاحب تو اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں کس طرح سے اس کی جان بچاؤں۔“ میں نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کہوں بی بی اگر آپ مانیں تو۔“ عشرت نے پراسرار انداز میں کہا۔

”ہاں بولو۔“ میں نے بچی کو اپنے سینے سے لگائے لگائے کہا۔

”آپ اس کو یہاں سے لے کر کہیں دور چلی جائیں اتنی دور جہاں پیر سائیں کا سایہ بھی آپ تک نہ پہنچے اور ابھی انہیں اس کی پیدائش کے بارے میں بھی نہیں بتایئے گا۔ ابھی تو وہ ملک سے باہر ہیں ان کے آنے سے پہلے پہلے آپ یہاں سے نکل جائیں۔“ اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔

”لیکن کیسے؟ کہاں؟ میں یہاں سے کیسے باہر نکل سکتی ہوں باہر تو پہرہ ہے اگر میں گیٹ پر اس کو لے کر جاؤں گی تو گارڈ اس کو دیکھ لے گا۔“ میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”میں نے اس کی ترکیب بھی سوچ لی ہے۔ بس آپ اپنے دل اور ارادے کو مضبوط رکھیں۔“ عشرت نے کہا۔

”وہ کیا؟“ میں نے تیز اور اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”بچی کو ہم کپڑوں کی باسکٹ میں چھپادیں گے میں گارڈ سے جا کر کہوں گی کہ بی بی کی اچانک بہت زیادہ طبیعت خراب ہوگئی ہے ہمیں فوراً اسپتال جانا ہے وہ ہمارے لیے ٹیکسی لادے۔ وہ ذرا دیر کے لیے گیٹ سے ہٹے گا اور ہم یہاں سے فرار ہوجائیں گے۔“ عشرت نے اپنا پلان میرے سامنے رکھا تو میں اس کی عقل پر حیران رہ گئی۔ پلان تو واقعی بہت

اچھا تھا یہاں پر کوئی گاڑی نہیں تھی کیونکہ مجھے کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس ایک مسئلہ تھا کہ جیسا ہم سوچ رہے تھے ویسا ہی ہونا چاہیے تھا کہیں گارڈ ادھر ادھر فون نہ کرنے لگے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں سطوت نے اسے کچھ اور ہی ہدایات دے رکھی ہوں۔

بہرحال ہم نے فوراً ہی کام شروع کردیا میں نے ساری نقدی سمیٹی۔ اس کے علاوہ سطوت نے مجھے اپنے بیٹے کے لیے جو چیزیں لاکردی تھیں بقول اس کے جو اس کے خاندان کی نشانیاں تھیں۔ میں نے وہ بھی ساتھ رکھ لیں پھر میں نے سطوت کے نام ایک خط لکھا اور اسے بتایا کہ اس کے ہاں بیٹے کی نہیں بیٹی کی ولادت ہوئی ہے اور میں اپنی بچی کو اس کے ظالم اور سفاک ہاتھوں کی پہنچ سے بہت دور لے کر جارہی ہوں۔ کیونکہ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ اس کے باپ کے ہاتھ اس کے سر پر شفقت سے رکھنے کے لیے اس کی جانب کبھی نہیں بڑھیں گے۔ بلکہ اس کی زندگی کو ختم کرنے اور اس کا گلا دبانے کے لیے بڑھیں گے۔

پھر عشرت نے سوتی ہوئی بچی کو احتیاط کے ساتھ باسکٹ میں لٹایا اور میں نے وہ سارا سامان جو اس کے باپ نے اس کے لیے نہیں بلکہ بیٹے کے لیے مجھے دیا تھا میں نے احتیاط سے باسکٹ میں رکھ دیا اور ایک ہلکی سی چادر بچی کے اوپر ڈال دی' میں نے بڑی سی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو اچھی طرح سے کور کرلیا۔ تب اللہ کا نام لے کر عشرت گھبرائے ہوئے انداز میں باہر نکلی اور گارڈ کو جا کر ایمرجنسی کے بارے میں بتایا۔

گارڈ نے عشرت سے کہا کہ وہ کسی کو فون کرکے یہ بات بتادے گا۔ کیونکہ پیر سائیں کا یہی حکم ہے تب عشرت نے کہا کہ اگر دیر ہوگئی تو بہت بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔ تم فوری طور پر ٹیکسی لا دو تاکہ ہم بروقت اسپتال پہنچ جائیں تم بعد میں انہیں فون پر اطلاع دیتے رہنا یہ بات سن کر گارڈ سوچ میں پڑ گیا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو جلدی کرو اگر ماں یا بچے کو کوئی نقصان پہنچا تو پیر سائیں تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' عشرت نے تیزی سے کہا تو وہ فوراً ہی گیٹ سے ہٹ کر روڈ کی جانب چل دیا۔ عشرت نے باہر جا کر گارڈ کے جانے کی سمت کا اندازہ لگایا اور بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بولی۔

''چلیے بی بی جلدی کیجیے گارڈ چلا گیا ہے۔ پانچ منٹ میں وہ آتا ہی ہوگا۔ ہمیں فوراً ہی یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے سطوت کے نام لکھا ہوا پرچہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی مجھے چلنے سے چکر آنے لگے۔ میں بہت کمزوری محسوس کررہی تھی لیکن یہ ایک ماں کی اپنے بچے کے لیے محبت ہی تھی کہ جس نے مجھے اتنی ہمت دی اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

گیٹ سے باہر آ کر عشرت نے بتایا کہ گارڈ دائیں جانب گیا ہے تو ہم بائیں جانب چلنے لگے۔ رات کا وقت تھا آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا بالکل بند تھی۔

میں نے تیز تیز قدموں سے بنگلوں کی اس لائن کو عبور کیا تو میرا سانس بری طرح پھولنے لگا۔ میں نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا دو تین گہری گہری سانسیں لیں اور پھر چلنا شروع کردیا۔ ہم گلیوں گلیوں میں چل رہے تھے یہاں سے سڑک نہ جانے کتنی دور تھی۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا تو میں نے بچی کو باسکٹ سے نکال کر گود میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ میں باسکٹ تھام لی اور عشرت سے کہا کہ اب وہ مجھے تنہا چھوڑ دے اور اپنی راہ لے بالفرض اگر گارڈ کی دور سے بھی ہمارے اوپر نگاہ پڑ گئی تو وہ ہمیں ساتھ دیکھ کر فوراً پہچان لے گا۔ اگر ہم تنہا ہوں گے تو آسانی سے اپنے آپ کو چھپا سکتے ہیں اور ویسے بھی میری گود میں تو بچی ہے اور میں اپنا چہرہ چادر سے چھپالوں گی اس طرح اسے مجھ پر شبہ نہیں ہوگا۔

عشرت مجھے اس طرح تنہا چھوڑنے پر راضی نہیں ہورہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ بی بی آپ بہت کمزور ہیں بچی اور باسکٹ اٹھا کر پیدل کہاں تک چلیں گی۔ مجھے اپنی جان کی فکر نہیں ہے زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا پیر سائیں مجھے گولی ماردیں گے تو ماردیں میرا بھی اب کون سا جینے کو دل چاہتا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر ہم پکڑے گئے تو بچی بھی تو زندہ نہیں بچے گی اور مجھے اس کی جان اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔

عشرت کی سمجھ میں میری بات آگئی پھر میں نے پرس سے ہزار ہزار کے جتنے بھی نوٹ میرے ہاتھ میں آئے میں نے نکالے اور عشرت کو دے دیے اور اسے اللہ حافظ کہا اور اس سے الگ ہوگئی۔

میں بڑی مشکل سے قدم اٹھا پارہی تھی کمزوری اور نقاہت سے برا حال تھا جس کی وجہ سے گھٹن بھی ہو رہی تھی اچانک ہی سارے علاقے کی بجلی چلی گئی تو میں ایک جگہ بیٹھ گئی مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جارہا تھا۔ سارے جسم کی جان میرے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تھی جس سے میں نے اپنی بچی کو مضبوطی کے ساتھ سینے سے لگایا ہوا تھا۔

اچانک زور سے بادل گرجے تو بچی نیند سے بیدار ہوگئی اور زور زور سے رونے لگی۔ میں اسے کندھے سے لگا کر ہلانے لگی تب ہی موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہوگئیں۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوگئی کہ اس بارش سے اپنی معصوم بچی کو کیسے بچاؤں۔

میں نے اسے اپنی چادر میں چھپالیا اور پھر ہمت کر کے کوئی جگہ تلاش کرنے لگی جہاں میں اور میری بیٹی اس بارش سے بچ سکیں۔

میں بے تابی کے ساتھ بنگلوں کے گیٹ دیکھ رہی تھی ایک تو اندھیرا اور دوسرے بارش' دور دور کسی انسان کا نام و نشان نہیں تھا میرے قدموں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کردیا اور میں لڑکھڑانے لگی۔ اچانک ہی میں تیز روشنی میں نہا گئی۔ ایک کار میرے سامنے آ گئی اور میں گھبرا کر لڑکھڑا کر زمین بوس ہوگئی۔

مجھے بس کار کے بریک چرچرانے کی آواز سنائی دی پھر اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔ آنکھ کھلی تو حلق پیاس کے مارے چیخ رہا تھا۔ کمزوری اتنی زیادہ تھی کہ آنکھیں کھولنے پر بھی اندھیرے کی چادر آنکھوں کے سامنے آرہی تھی۔

''پا......نی......!'' میں کراہی۔

''تب مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے چمچے سے میرے منہ میں پانی ڈالا ہے۔ میں نے بے تابی سے اپنا حلق تر کیا۔ چند چمچوں کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک بہت مہربان صورت کو اپنے قریب پایا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' وہ دھیرے سے مسکرائی اور تب مجھے اپنی بچی کا خیال آیا اور میں نے تیزی سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر چکرا کر دوبارہ تکیے پر گر پڑی۔

''لیٹی رہو' تمہیں بہت تیز بخار ہے۔'' اس نے کہا۔

''میری بچی کہاں ہے؟'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری بچی بھی ہمارے پاس ہے اسے بھی بخار ہے تم دونوں بارش میں بھیگ گئی تھیں اس لیے بخار ہوگیا ہے تمہیں بہت کمزوری ہورہی ہے۔ اگر

کچھ کھالوگی تو میں دوا دے دوں گی۔'' اس نے کہا۔
''نہیں پہلے میری بچی مجھے دکھاؤ۔'' میں نے ضدی لہجے میں کہا تو اس نے آواز لگائی۔
''ذرا بچی کو لے کر آئیے۔''
اور فوراً ہی ایک عورت میری بچی کو لے کر آ گئی۔ میں اس عورت کی مدد سے اٹھ کر بیٹھی اور اس ننھی سی جان کو جو بخار میں تپ رہی تھی اپنے سینے سے لگا لیا اور بے تحاشا چومنے لگی۔
''تم اپنی بچی کو اپنے پاس ہی لٹا لو لیکن کچھ کھا ضرور لو۔'' اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اس عورت کو جو بچی کو لے کر آئی تھی اشارہ کیا کہ وہ میرے کھانے کے لیے کچھ لے آئے۔ وہ عورت میرے لیے ایک پیالے میں دلیہ اور ایک کپ یخنی لے کر آئی اور بچی کو میری گود سے لے لیا۔ اس مہربان عورت نے اپنے ہاتھوں سے مجھے دلیہ کھلایا۔ میں نے تھوڑا سا کھایا۔ میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دل کو پریشانی لگی ہوئی تھی میں سوچنے لگی کہ گارڈ جب واپس آیا ہوگا اور اس نے ہمیں وہاں نہیں پایا ہوگا تو کیا ہوا ہوگا اور یہ کہ عشرت اللہ جانے کہاں گئی ہوگی۔ کوئی اس کا جاننے والا ہے بھی یا نہیں۔ کہیں وہ گارڈ کے ہاتھ نہ لگ گئی ہو، ساری رات گزر چکی تھی اور دوپہر ہو رہی تھی۔
اس نیک عورت نے میری اتنی دیکھ بھال کی کہ دوسرے دن میرا اور میری بچی کا بخار اتر گیا اور کمزوری بھی کم ہوگئی تھی۔
جب میری طبیعت بہتر ہوئی تب اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے اس سے خود سوال کر ڈالا کہ وہ کون ہے۔
''میں بھی تمہیں اپنے گھر والوں کے بارے میں ضرور بتاؤں گی لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو، تمہارے رشتے دار اور گھر والے کہاں ہیں اور تم یوں تنہا برسات کی اس اندھیری رات میں بچی کو لے کر کہاں جا رہی تھیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''آپ جتنی باہر سے دیکھنے میں حسین و جمیل ہیں اس سے زیادہ آپ کا باطن اچھا ہے آپ ایک نیک اور رحم دل خاتون ہیں۔ آپ نے میری اور میری بچی کی جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں تمام عمر نہیں اتار سکتی۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔
''جان بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے میں نے تو تمہیں راستے سے بے ہوش پا کر اٹھایا ہے۔ تم اچانک ہی میری کار کے آگے آ کر گر کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔ شکر ہوا کہ میں نے فوراً ہی بریک لگا دیے ورنہ تمہیں نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ہاں اب بتاؤ اپنے بارے میں تاکہ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع دے سکوں۔'' انہوں نے پھر نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''میرا کوئی گھر نہیں ہے میرا شوہر ایک ظالم انسان ہے۔ اسے بیٹا چاہیے تھا اور اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر بیٹی ہوئی تو وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ اس لیے میں اس سے جان بچا کر رات کے اندھیرے میں بچی کو لے کر نکل کھڑی ہوئی۔'' میں نے سچ بتا دیا۔
''تمہارے شوہر کو بیٹی سے اتنی نفرت کیوں ہے کیا تمہاری اور بھی بیٹیاں ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔
''میری تو یہ پہلی اولاد ہے البتہ اس کی پہلی بیوی سے بیٹیاں موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔
''اوہ اب سمجھی۔'' انہوں نے تاسف کا اظہار کیا اور بولیں۔ ''یہ مرد بھی کتنے نادان ہوتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر عورت پیدا نہ ہو تو مرد بھی تو پیدا نہیں

ہو سکتے کیونکہ ایک عورت ہی مرد کو جنم دیتی ہے۔''
''اور آپ کون ہیں کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔ میں نے آپ کو ناحق کتنی پریشانی میں مبتلا کر دیا آپ نے بالکل اجنبی ہوتے ہوئے بھی میرا اتنا خیال رکھا، ضرور کسی نیک والدین کی اولاد ہیں۔ آپ نیک بھی ہیں اور بے حد حسین ہیں۔'' میں نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ کہا۔
''ہنہ! نیک...... نیک والدین کی اولاد۔'' وہ ایک تلخ سی ہنسی ہنس دی اور ایک تاریک سا سایہ ان کے چہرے پر لہرا گیا۔
''کیا ہوا باجی؟'' میں نے حیرانی سے دھیمے لہجے میں پوچھا۔
''کچھ نہیں!'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولیں۔ ''تم نے ابھی مجھے نیک کہا اور نیک والدین کی اولاد کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ کیونکہ میں نہ تو کوئی نیک عورت ہوں اور نہ ہی نیک والدین کی اولاد ہوں۔ بلکہ مجھے تو اپنے باپ کا نام بھی نہیں معلوم۔''
''کک کیا مطلب؟'' میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔
''میرا نام سرمئی ہے اور میں ایک طوائف ہوں اور یہ جگہ جہاں تم اس وقت موجود ہو ایک کوٹھا ہے۔''
باجی کے منہ سے طوائف کا لفظ سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور مجھے سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ میں انجانے میں ایک بہت ہی بری جگہ آ گئی ہوں اور یہ عورت مجھے اپنے ساتھ اس لیے لے کر آئی ہے کہ مجھے بھی اس کوٹھے پر بٹھا دے۔
''آ...... آپ...... طوا...... ئف...... ہیں...... اور مجھے اسی لیے اپنے ساتھ لے کر آئی ہیں کہ مجھے بھی......!''
میں نے ہکلاتے ہوئے کہا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولیں۔
''تم پریشان مت ہو، یہ کوٹھا ضرور ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ایک طوائف ہوں لیکن اب یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں طوائف تھی کیونکہ یہ کام چھوڑ چکی ہوں کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم یہ کام چھوڑ دو تو میں تم سے شادی کر لوں گا۔ لیکن وہ جھوٹا نکلا اور وہ بغیر نکاح کے میرے ساتھ تعلق بنانا چاہتا تھا لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ میں ناچنے اور گانے کا کام کرتی تھی، جسم فروشی نہیں۔''
وہ کہہ رہی تھیں اور میرے دماغ میں ان کا نام گونج رہا تھا۔ سرمئی...... سرمئی...... میں نے یہ نام کہاں اور کس سے سنا تھا۔ میں دماغ پر زور دینے لگی اچانک ہی مجھے یاد آ گیا سطوت کی بیوی نفیسہ نے بتایا تھا کہ سطوت نے ایک سرمئی نامی طوائف سے بھی نکاح کر رکھا ہے۔
''کیا سوچنے لگیں میں نے کہا ناں تم بے فکر رہو، تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔'' انہوں نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔
''کیا آپ نے نواب سطوت سے نکاح نہیں کیا ہے؟'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔
''میں اسی ظالم باپ کے چنگل سے اپنی بچی کی جان بچا کر بھاگی ہوں۔'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کیا......؟'' وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئیں۔ میں نے واضح طور پر ان کے جسم پر لرزش کے آثار دیکھے۔ وہ نہ جانے کیا سوچے جا رہی تھیں اور میں انہیں دیکھ رہی تھی پھر وہ بے قراری کے سے عالم میں اپنی جگہ سے چند قدم آگے بڑھیں۔ مگر پھر تیزی سے واپس اپنی جگہ بیٹھ گئیں اور مجھ سے بولیں۔
''تم کیا اس کی خاندانی بیوی ہو؟''

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی خاندانی بیوی سے اس کی دو بیٹیاں موجود ہیں۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اپنے باپ کا سجادہ نشین ہے اگر اس کا بیٹا نہ ہوا تو وہ اپنی نسل کیسے آگے بڑھائے گا۔ اپنا سجادہ نشین کسے بنائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی خاندانی بیوی مزید بچے پیدا نہ کرسکتی ہو۔" میں نے کہا تو وہ توجہ سے میری بات سنتی رہیں پھر بولیں۔

"تم اپنے بارے میں مزید بتاؤ کہ تمہاری اس کے ساتھ شادی کیسے ہوئی۔"

تب میں نے ساری کہانی انہیں سنادی۔ نفیسہ کے بارے میں عشرت کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ پھر میں نے اپنا سابقہ سوال دوبارہ دہرایا کہ انہوں نے سطوت سے نکاح کیا تھا یا نہیں تو انہوں نے نفی میں سر ہلادیا بلکہ اللہ کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

"کیا آپ سطوت سے محبت کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آج سے پہلے شاید کرتی تھی مگر آج کے بعد نہیں بلکہ اب تو میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہوں گی۔" انہوں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"کیا وہ آپ سے ملنے کے لیے آتا ہے؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"یہاں نہیں آتا بلکہ کہیں اور ملنے کے لیے بلاتا ہے لیکن آج کے بعد میں اس سے نہیں ملوں گی۔" انہوں نے قطعی لہجے میں جواب دیا پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولیں۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے اور تم کیا سمجھتی ہو کہ سطوت تمہیں یوں آسانی سے اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے گا یہ جاننے کے بعد کہ تمہارے پاس اس کی اولاد موجود ہے خواہ بیٹی کی صورت میں اور کل گمشدہ رہنے کے بعد تم اچانک اپنی بیٹی کے ساتھ آکر اپنی بیٹی کے حق کا جو اس کی جائیداد میں جائز بنتا ہے۔ مطالبہ نہیں کروگی کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ تم اس کی بیوی ہو میرا مطلب ہے نکاح نامہ وغیرہ......!"

"نہیں میرے پاس نکاح نامہ نہیں ہے نہ اس نے مجھے دیا اور نہ مجھے اس سے مانگنے کی ضرورت ہوئی بلکہ جس وقت اس نے مجھ سے شادی کی تھی میں اس کی اصلیت سے ناواقف تھی اور سرتاپا اس کی محبت میں غرق تھی پہلی مرتبہ میری محبت کے شیشے میں بال اس وقت آیا جب اس نے مجھ سے ابارشن کرانے کے لیے کہا اور پھر وہ بتدریج کھلتا چلا گیا۔ اس کے اندر کا حیوان آہستہ آہستہ باہر آنے لگا اور آج یہ نوبت آگئی کہ میں اپنی اور اپنی بچی کی جان بچا کر وہاں سے نکل آئی۔ آج میرے سامنے صرف میری بچی ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے نہ سطوت کا نام اور نہ ہی اس کی جائیداد۔ جب باپ ہی بیٹی کی جان کے درپے ہو تو دوسری چیزیں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ رہی بات اس کی کہ میں اب کیا کروں گی تو میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ کس کونے میں جا کر چھپ جاؤں۔" میں نے بے بسی سے کہا اور میری آواز بھرا گئی۔

کئی دن ہوگئے تھے مجھے ان کے گھر رہتے ہوئے تب ایک دن مجھے سرمئی باجی نے بتایا کہ سطوت آج کل بہت زیادہ پریشان ہے اس نے انہیں ملنے کے لیے بلایا تھا لیکن اپنی پریشانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی انہوں نے اسے میرے بارے میں کچھ بتایا انہوں نے یہ بھی بتایا کہ سطوت کی والدہ کی حالت بہت خراب ہے اس لیے وہ حویلی گیا ہوا ہے اور ہمارے پاس یہی موقع ہے

جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس طرح کا فائدہ؟" تو انہوں نے کہا کہ ہم خاموشی سے یہ شہر چھوڑ دیں گے اور کراچی چلے جائیں گے اور بالکل گم نامی کی زندگی بسر کریں گے۔ تم میرے ساتھ ہی رہنا۔

پھر پتا چلا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تو وہ مزید کچھ دنوں کے لیے حویلی میں ہی رہا اور اس عرصہ میں سرمئی باجی نے سارے انتظامات کرلیے اور ہم ایک رات خاموشی سے کراچی آگئے۔

لیکن یہاں آکر بھی میرے دل کو قرار نہیں آتا تھا راتوں کو چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی بس یہ خیال آتا تھا کہ ابھی اچانک ہی کہیں سے سطوت نمودار ہوگا اور میری بیٹی کو مار ڈالے گا کیونکہ سرمئی باجی اور سطوت کا تعلق تو تھا ہی پھر ایک دن صرف اپنی بچی کی زندگی کی خاطر میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ایک بہت کڑا اور جاں گسل فیصلہ کیا اور سرمئی باجی سے کہا۔

"باجی میں نے ایک اہم فیصلہ کیا ہے اور آپ سے میری ایک آخری التجا ہے کہ آپ میرا فیصلہ مان لیں گی۔"

"کیسا فیصلہ؟" انہوں نے پوچھا۔

یہی کہ میں اپنی بچی کو ہمیشہ کے لیے آپ کو سونپنا چاہتی ہوں۔ میں اب آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ بے شک میری بچی میری جان میرے جگر کا ٹکڑا ہے لیکن اس کی زندگی اور جان کی سلامتی کی خاطر میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر کبھی زندگی میں سطوت مجھ تک پہنچ گیا تو وہ صرف میری جان ہی لے سکتا ہے میری بچی تو زندہ رہے گی اور اگر سطوت نے کبھی اس کو آپ کے پاس دیکھ بھی لیا تو اسے یہ تھوڑی معلوم ہوگا کہ یہ اس کی اپنی بیٹی ہے مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے کہ آپ ماں بن کر اس کی پرورش کریں گی اور اس کو کبھی یہ بات نہیں بتائیں گی کہ یہ سطوت کی بیٹی ہے میرے منہ میں خاک اگر کبھی ایسا وقت آیا کہ موت اور زندگی کا تو کسی کا بھی بھروسا نہیں ہے اگر آپ کو ایسا لگا کہ آپ دنیا سے رخصت ہونے والی ہیں تو چاہے اس کو یہ بتادیجیے گا کہ آپ اس کی ماں نہیں ہیں۔ اس کی بدنصیب ماں نے اس کی زندگی کی خاطر اسے خود سے جدا کیا تھا اور آپ اس کے باپ کی نشانیاں اسے دے دیجیے گا۔"

پھر میں نے سطوت کی وہ چیزیں جو اس کی خاندانی تھیں اور وہ اپنے ہونے والے بیٹے کے لیے لایا تھا میں نے سرمئی باجی کے حوالے کردیں اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو زیورات سطوت نے مجھے دیے سارے کے سارے ان کے حوالے کردیے۔

"ایک بات بتاؤ۔" باجی نے میری باتیں اطمینان سے سننے کے بعد کہا۔

"جی پوچھیے۔" میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ تم اپنی بیٹی ایک طوائف کے حوالے کر رہی ہو اور کہیں میں اسے بھی جوان کر کے......!"

میں نے جھٹ اپنا ہاتھ باجی کے منہ پر رکھ دیا اور کہا۔ "اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہیے گا۔ میں کسی طوائف کو نہیں جانتی۔ میں نے سرمئی کو ایک بہت ہمدرد اور خدا ترس عورت کے روپ میں دیکھا ہے۔ جو احسان کرنا جانتی ہے مجھے پتا ہے کہ آپ گناہوں سے بھری اس گندی زندگی کو چھوڑ چکی ہیں۔ ایک نیک عورت ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی پرورش بہت اچھی طرح سے کریں گی۔ میری دعا ہے کہ کبھی ایسا وقت نہ آئے کہ آپ کو اسے یہ بتانا

پڑے کہ آپ اس کی حقیقی ماں نہیں ہیں۔“ میں نے کہا اور باجی کے گلے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

باجی بھی دیر تک میرے ساتھ آنسو بہاتی رہیں اور میری بیٹی کو گود میں لے کر میرے ہاتھوں کو تھام کر بولیں۔

”میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے اس اندھے اعتماد کو جو تم نے مجھ پر کیا ہے کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی بلکہ میں تو اس بات کے لیے تمہاری احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے ایک بیٹی کی ماں بننے کی عزت اور شرف دیا ہے۔ لیکن تم جاؤ گی کہاں......؟“

”اللہ کی زمین بہت وسیع ہے باجی کہیں بھی چلی جاؤں گی اللہ تعالیٰ تو مجھے پناہ دے گا۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بھی بے یارو مددگار نہیں چھوڑتا۔ میں اس کے بھروسے یہ گھر اور اپنی بچی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں نے تو ابھی تک اس کا نام بھی نہیں رکھا ہے اب اس کا نام آپ ہی رکھیے گا۔“

میں نے رخصت ہوتے وقت اپنی بچی کو جی بھر کے پیار کیا اور وہاں سے نکل گئی۔ پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھا کہ کہیں اس کی من موہنی صورت میرے ارادے کو متزلزل نہ کر دے۔

میں بنا منزل کے تعین کے تیز تیز قدموں سے چلی جا رہی تھی انجانا شہر انجانے راستے نہ کوئی شناسا اور نہ کوئی ہمدرد بس چلتی جا رہی تھی دل میں آیا کہ اب جی کے کیا کرنا ہے اچھا ہے مر جاؤں یہ سوچ کر سڑک پر قدم رکھ دیے اور پھر کسی چیز سے ٹکر کھا کر روڈ پر گر پڑی۔

ہوش میں آئی تو اس گھر میں تھی۔ ایک مرتبہ تقریباً تین سالوں کے بعد اپنی بچی سے ملنے کی تڑپ میں سوچا کہ جا کر مل کر آ آؤں۔ لیکن مجھے یاد ہی نہیں تھا کہ وہ گھر کہاں ہے اب تو اتنے سال بیت چکے ہیں۔ اب وہ جوان ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ باجی نے اس کی شادی بھی کر دی ہو اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ہمیشہ خوش رکھے اس کا شوہر بہت اچھا ہو محبت کرنے والا خیال رکھنے والا عزت کرنے والا۔“

اپنی داستان ختم کرنے کے بعد وہ گہری خاموشی میں ڈوب گئیں۔ کچھ سوچنے لگیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ ان کی داستان سنتے سنتے خاصی رات ہو چکی ہے اچانک ہی کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تو ہم دونوں ہی چونک پڑے۔

”شاید وہ لوگ پھر آ گئے۔“ انہوں نے کہا۔

”کون لوگ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی لوگ جو مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔ پتا نہیں مجھ سے کیا چاہ رہے ہیں لیکن میں کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔“

”آپ دروازے پر مت جائیں اور نہ ہی پوچھیں کہ کون ہے خود ہی تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

لیکن وہ ناکام ہو کر نہیں گئے اور مسلسل دروازہ بجاتے رہے پھر انہوں نے آہستہ آہستہ آوازیں دینا بھی شروع کر دیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لوگ دروازہ توڑ کر یا دیوار پھاند کر اندر آ جائیں گے۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس گھر کی دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے۔

”چلیں اٹھیں آپ میرے ساتھ اس گھر سے چلیں ورنہ یہ لوگ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دیوار پھاند کر اندر گھس آئیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہم جائیں گے کیسے دروازے پر تو وہ لوگ کھڑے ہیں۔“ انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

”اس گھر کی پچھلی جانب سے یہاں بھی تو گلی ہے ہم یہاں سے دیوار پھاند کر باہر کود جائیں گے۔ گلی کے سرے پر میری گاڑی کھڑی ہے گاڑی یہاں لے آؤں گا اور ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ تیار ہو گئیں۔

میں نے انہیں سہارا دے کر دیوار پر چڑھایا اور پھر خود چڑھ کر انہیں سہارا دے کر دوسری جانب اتارا اور کود کر تیزی سے گلی کے سرے کی جانب بھاگا اور ان سے کہا کہ وہ میرے پیچھے آئیں۔

میں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور گلی کے سرے پر لے گیا وہ اندھیرے میں کھڑی تھیں۔ گاڑی کے نزدیک آتے ہی وہ تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئیں اور میں نے تیزی سے گاڑی آگے کو بھگانا شروع کر دیا۔ شاہ فیصل کالونی کے قریب ایک لڑکی کی گاڑی سے میری گاڑی کی ٹکر ہو گئی اس سے میری تکرار ہو گئی بعد میں میں نے اسے پہچان لیا وہ ایک صحافی تھی اور ٹی وی اینکر تھی۔ میں نے خاتون کو اس کے حوالے کر دیا اور خود کلفٹن آ گیا۔



”یہ تمہیں کہاں مل گئیں؟“ اماں حمیدہ نے جو انہیں بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ انہیں جانتی ہیں جو یہ سوال کر رہی ہیں؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نن...... نہیں تو...... میرا مطلب ہے کہ یہ کون ہیں؟“ اماں نے گھبرا کر کہا۔

”یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی یا پھر آپ ان سے خود ہی پوچھ لیجیے گا فی الحال تو میرے سر میں درد ہے آپ مجھے چائے پلائیں اور آنٹی کو بھی کھانے اور پانی کا پوچھیں اور ہاں ان کو اپنے برابر والے کمرے میں ٹھہرا دیں۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ مجھے بہت اہم نیوز دیکھنی ہے۔“ یہ کہہ کر میں آنٹی کی جانب مڑی اور کہا۔

”سوری آنٹی آپ مائنڈ مت کیجیے گا آپ اماں کے ساتھ جائیں اور بے فکر ہو کر ان سے باتیں کریں۔ ابھی مجھے بہت اہم نیوز ٹی وی پر دیکھنی ہے۔ آپ سے ان شاء اللہ صبح تفصیلی بات ہوگی۔ مجھے امید ہے اماں آپ کا خیال بھی رکھیں گی اور آپ کو بور بھی نہیں ہونے دیں گی۔ آپ کی ہم عمر ہیں نا۔“ آخری فقرہ کہہ کر میں ہنس دی اور انہیں مسکراتا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کمرے میں آتے ہی میں نے ٹی وی آن کیا اپنا نیوز چینل لگایا دراصل نواب سطوت کی نیوز دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس وقت کوئی دوسری نیوز رپورٹ آ رہی تھی اس لیے میں کپڑے چینج کرنے اور فریش ہونے واش روم میں چلی گئی۔

منہ دھوتے ہوئے اچانک میرا خیال آنٹی کی جانب چلا گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے ان کے خدوخال مجھے شناسا سے دکھائی دیے لیکن دماغ پر زور دینے پر بھی یاد نہیں آیا کہ میں کبھی ان سے ملی ہوں یا کہیں دیکھا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی شکل میری لیے انجان نہیں ہے۔ میں مسلسل سوچ رہی تھی کہ اچانک میرے کان میں نیوز ریڈر کی آواز آئی۔ میری مطلوبہ خبر پر تفصیلی رپورٹ شروع ہو چکی تھی۔ میں سارے خیالات جھٹک کر تیزی کے ساتھ روم سے باہر نکل آئی۔

میں نے ریموٹ ہاتھ میں لیا اور ٹی وی کی آواز تیز کر دی ٹی وی پر نواب سطوت کے حوالے سے نیوز رپورٹ آ رہی تھی کہ نواب سطوت کا تعلق کس خاندان سے ہے۔ اس کے دادا اور باپ کون تھے یہ سارے

پیر سلطان شاہ کے گدی نشین چلے آرہے تھے لیکن نواب سطوت کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے اس لیے اب ان کے بعد یہ گدی کس کو نصیب ہوگی۔ پھر اس کی جوان بیٹی کی ناگہانی موت کے بارے میں بتایا جانے لگا۔

اب کیمرہ نواب سطوت کی حویلی کے اندر کا منظر دکھارہا تھا۔ حویلی میں لاتعداد لوگ موجود تھے جو اس کی بیٹی کی تدفین کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین، کارکنان اور دوسری سیاسی شخصیات، ملکی وزراء کے علاوہ دوسرے ممالک سے بہت سے معززین اور عمائدین شرکت کے لیے آنے والے تھے۔ خبر میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں تھا کہ نواب سطوت کی بیٹی نے خودکشی کی ہے بلکہ یہ بتایا جارہا تھا کہ وہ ایک مہلک بیماری میں مبتلا تھی۔

کیمرہ لوگوں کے اژدہام کو دکھانے کے بعد نواب سطوت کے اوپر رک گیا۔ وہ سوگوار صورت لیے بیٹھا تھا اور تب ہی میں نواب سطوت کو دیکھتے ہوئے بری طرح چونک اٹھی اور میرے منہ سے چیخ کے انداز میں ''اماں'' نکل گیا۔

اماں میرے لیے چائے لے کر آرہی تھیں۔ میری چیخ سن کر وہ مزید تیزی سے کمرے میں داخل ہوئیں اور چائے کا مگ ٹیبل پر رکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھیں۔

میں جو آنکھیں پھاڑے ٹی وی کو تک رہی تھی تو خود بخود اماں کی نگاہیں بھی ٹی وی اسکرین پر آکر ٹھہر گئیں۔

''اماں، اماں آپ دیکھ رہی ہیں۔'' میں نے بے قراری کے عالم میں اماں کا ہاتھ پکڑ کر بری طرح ہلا ڈالا۔

''کک...... کیا...... میری بچی؟'' اماں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں آنٹی بھی کمرے میں داخل ہوئیں اور میرے اوپر ایک نگاہ ڈال کر وہ بھی ٹی وی کی جانب دیکھنے لگیں اور اپنی جگہ سن کھڑی رہ گئیں۔

ان کی موجودگی کو محسوس کرکے میں نے اماں سے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اماں نے کچھ کہا میں ایک اجنبی عورت کے سامنے وہ بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ ٹی وی پر کیا دکھارہے ہیں؟'' انہوں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں آنٹی۔ ایسے ہی ایک بڑے آدمی کی بیٹی مرگئی ہے۔ اس کو دکھارہے ہیں۔'' میں نے بھی اپنے اچھلتے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''خوش نصیب ہے یہ لڑکی کہ بڑے آدمی کی بیٹی ہے اور ساری دنیا اس بات سے واقف ہے کہ وہ اس کا باپ ہے ورنہ تو بہت سے باپ اتنے بدبخت اور بیٹیاں اتنی بدنصیب ہوتی ہیں کہ لوگوں کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیٹی کس کی ہے۔'' مجھے ان کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ارے آیئے بہن آپ میرے ساتھ آیئے۔ یہ تو یوں ہی جذباتی ہوجاتی ہے۔'' اماں حمیدہ نے آنٹی کا ہاتھ تھاما اور تیزی کے ساتھ انہیں باہر لے گئیں اور جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کرتی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کردیا پھر ریموٹ خود بخود میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر اس طرح گر پڑی جیسے نہ جانے کتنی لمبی مسافت پیدل چل کر آرہی ہوں۔ میری آنکھوں میں بہت سے کانچ چبھ رہے تھے۔ پیروں میں کانٹوں کی چبھن محسوس ہورہی تھی۔ مجھے اپنے جوڑ جوڑ میں تھکن کا احساس ہورہا تھا، میں نے اپنی ٹانگیں یوں سکیڑ لیں گویا اپنے آبلہ آبلہ پیروں کی تکلیف کو کم کررہی ہوں۔ میں سکڑی سمٹی تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ ڈھیر سارے آنسو خود بخود میری آنکھوں سے نکل کر میرا تکیہ بھگونے لگے۔

میرا دل چیخ چیخ کر مجھے ایک حقیقت بتارہا تھا اور میں بے دردی کے ساتھ اس حقیقت سے انکار کررہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کرپارہی تھی پھر آنٹی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجے۔ جب انہوں نے کہا کہ بہت سے باپ تو اپنی بیٹیوں کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور ان کی آنکھوں کے آنسو اور اماں حمیدہ کا تیزی کے ساتھ انہیں کمرے سے باہر لے جانا۔

میں نہ جانے کتنی دیر اسی طرح لیٹی رہی پھر اٹھی اور اپنا سیل فون اٹھایا اور حشام کا نمبر ملایا۔ کئی بیل بج چکی تھیں لیکن حشام فون ریسیو نہیں کررہا تھا میں جانتی تھی کہ وہ اس وقت گہری نیند سورہا ہوگا میں نے لائن کاٹ کر دوبارہ نمبر ملایا تو تب مجھے حشام کی بھاری آواز سنائی دی۔ وہ نیند کے خمار سے پر آواز میں بولا۔

''بولو یار کون ہے؟''

''حشام...... حشام میں ہوں سرمئی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے نیند سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''تم شاید گہری نیند میں تھے سوری میں نے تمہیں جگا دیا اچھا سوجاؤ صبح بات کریں گے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کون سرمئی ارے سرمئی یہ تم ہو۔ خیریت تو ہے رات کے اس وقت۔ میرے خیال میں ساڑھے تین بج رہے ہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ اب پوری طرح بیدار ہوگیا تھا اس لیے تیزی سے بولا۔

''حشام میں یہ دیکھ رہی تھی کہ ہمارے چینل سے بھی ایک ٹیم شاداب نگر نواب سطوت کی حویلی میں ان کی بیٹی کی تدفین کے سلسلے میں کوریج کے لیے جائے گی ناں۔ تو میں سوچ رہی تھی کہ میں اور تم اس ٹیم میں شامل ہوسکتے ہیں۔ دراصل میں بھی وہاں جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کمال ہے اتنی رات کو تم نے یہ بات کہنے کے لیے مجھے فون کیا ہے کیا بات ہے کوئی خواب وغیرہ دیکھ لیا ہے کیا۔ یہ بات تو صبح بھی ہوسکتی تھی۔'' اس نے ایک طویل اور اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ ناں کہ ہم اس ٹیم میں شامل ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اندر خواتین کے حصے میں جاکر نواب سطوت کی بیوی اور بیٹی کو دیکھ سکوں۔'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن خواتین کے حصے میں کیمرہ لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس قسم کے لوگوں سے تو تم اچھی طرح سے واقف ہو، دنیا بھر کی عورتوں کو اپنی جاگیر سمجھنے والے اپنی عورتوں کو سات پردوں میں رکھتے ہیں۔ تاکہ کسی غیر کی نگاہ بھی ان پر نہ پڑے۔'' حشام نے کہا۔

''ہاں تو میں کیمرے کے بغیر ہی جاؤں گی۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''تم اتنی جذباتی کیوں ہورہی ہو آخر بات کیا ہے۔ اگر چینل کی جانب سے جانے والی ٹیم میں تمہیں منتخب نہ کیا گیا تو میں تمہیں ذاتی طور پر وہاں

لے جاسکتا ہوں۔" حشام بولا۔

"نہیں میں اپنے چینل کے توسط سے جانا چاہتی ہوں تاکہ ایک اینکر کی حیثیت سے خواتین والے حصے تک رسائی آسان ہو۔ ورنہ ممکن ہے کہ مجھے اندر خاص حصے تک جانے کی اجازت نہ ملے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں بات کرلوں گا۔ صبح تو ہونے دو اور اب تم بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔" حشام نے جان چھڑانے والے لہجے میں کہا۔

"نہیں، نہیں تم ابھی چینل فون کر کے بات کرو، کہیں ایسا نہ ہو پہلے ہی ٹیم منتخب کرلی جائے۔" میں نے ضدی لہجے میں کہا۔

"تمہاری بھی ناں میری کچھ سمجھ نہیں آتی۔ اچھا بابا ابھی بات کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔" حشام نے میرے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی بہت بحث مباحثے کے بعد ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا کہ حشام میری بات مان جاتا تھا۔

میں فون رکھ کر بے صبری سے حشام کے فون کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد حشام کی کال میرے پاس آئی۔

"خوش ہوجاؤ کہ ہم صبح اپنی ٹیم کے ہمراہ شاداب نگر جارہے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے حسینی صاحب کو راضی کیا ہے۔ ورنہ انہوں نے تو روحی اور شمس کو بھیجنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔" حشام نے کہا۔

"تھینک یو حشام تھینک یو ویری مچ، یو آر سو سوئیٹ" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ایک بار پھر بہت بہت معذرت کہ میں نے تمہاری نیند خراب کردی اچھا اب تم سو جاؤ گڈ نائٹ۔" میں نے کہا اور فون بند کرنے لگی تو حشام کی آواز سنائی دی۔

"اے...... اے محترمہ سنیں، اب تو آپ نے میری نیند خراب کر ہی دی ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ دو چار باتیں میرے دل کو بھی خوش کرنے والی کردیں۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"شٹ اپ حشام تم پھر پٹری سے اتر رہے ہو۔" حشام سے بات کر کے میں ہمیشہ ہلکی پھلکی ہوجایا کرتی تھی اس لیے ہنس کر کہا۔

"یار کبھی تو پٹری سے پوری طرح اترنے دیا کرو، فوراً ڈانٹ دیتی ہو۔ میں فوراً پٹری پر چڑھ جاتا ہوں اور اگر کبھی ٹرین آ گئی تو......!" اس نے معصومانہ لہجے میں کہا۔

"جس دن تم پوری طرح پٹری سے اتر گئے اس دن واقعی ٹرین آجائے گی۔" میں نے کہا۔

"تو پھر آتی رہے میں تو پٹری سے اتر ہی چکا ہوں گا میرا کیا بگڑے گا۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اگر تم یہ جملہ کہتے ہوئے میرے سامنے ہوتے تو تمہاری کمر پر میرا ایک زوردار مکا پڑ جاتا۔ شکر کرو کہ دور بیٹھے ہو۔"

"اور یہ دوری ہی تو مجھے تڑپاتی ہے۔" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

"شٹ اپ حشام۔" میں نے دھیرے سے کہہ کر فون بند کردیا۔

پتا نہیں کیوں حشام کا لہجہ اور اس کے الفاظ کی گہرائی کو محسوس کر کے میرے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی وہ کبھی کبھی باتوں باتوں میں اس طرح کی بات کرو یا کرتا تھا اور میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوجایا کرتی تھیں۔ دل میں گدگدی سی ہونے لگتی اور میں اپنی ہی حالت سے گھبرا کر صرف ایک ہی جملہ کہہ پاتی۔ شٹ اپ۔

جب راتوں کی تنہائیوں میں حشام کے ایسے ہی جملے مجھے گدگدایا کرتے تو امی کی تنبیہ اور ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگتے اور میں پھر اپنے

دل کو سخت کرلیتی۔

حشام کی باتوں کے حصار سے باہر نکلی تو ایک بار پھر میرے سامنے نواب سطوت کی تصویر آ گئی۔ میں نے ابھی اسے ٹی وی پر دیکھا تھا کیسا حزن و ملال تھا اس کے چہرے پر اپنی جوان بیٹی کی موت پر۔ میرا دل چاہا کہ میں بھاگ کر جاؤں اور اتنے سارے معززین کی موجودگی میں اس کا گریبان پکڑ کر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ "لوگو دیکھو یہ شخص جس کو تم اپنا دین و ایمان اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو اور جوانی ہی جوان بیٹی کی موت پر یوں رونی صورت بنا کر بیٹھا ہے اصل میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہوگا کہ مجھے بیٹی جیسی نحوست سے نجات مل گئی۔ اس شخص کو نفرت ہے عورت سے اگر وہ بیٹی کی صورت میں ہو۔ ویسے اسے اپنی عیاشیوں کے لیے کسی ایک عورت کی نہیں بلکہ ڈھیر ساری عورتوں کی ضرورت رہتی ہے۔"

ٹی وی کیمرہ جس وقت نواب سطوت کے اوپر فوکس ہوا تھا اس وقت میں نے غور سے دیکھا تھا اور اس کے اوپر نگاہ پڑتے ہی میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے تھے کیونکہ اس کی نفیس سی سفید شیروانی کے اوپر پتھر کا وہ سفید تعویذ جس کے درمیان میں بلیک کلر سے کچھ لکھا تھا بہت واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا اور کرسی پر بیٹھے ہونے کے باوجود اس نے جس سنہری اسٹک کا سہارا لیا ہوا تھا وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی میرے باپ کی تھی۔ اس کے ہینڈل والے حصے پر دو شیر بنے ہوئے تھے۔

اور میں گھڑی کی چوتھائی میں یہ بات سمجھ گئی تھی کہ نواب سطوت الاسلام ہی وہ ذلیل شخص ہے جو بدقسمتی سے میرے وجود کو دنیا میں لانے کا سبب بنا ہے۔ میری ماں نے یہ نشانیاں شمسو بابا کے حوالے کی تھیں۔ کسی کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی کہ یہ نامی گرامی شخص ہی میرا باپ ہے اور اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اس کی حویلی میں جاؤں گی اور اس کی بیوی اور بیٹی کو دیکھوں گی لیکن پھر مجھے حشام کے والد کی بات یاد آئی کہ انہوں نے رات ہی مجھے یہ بات بتائی تھی کہ نواب سطوت کے اپنے زمانے کی مشہور طوائف سرمئی سے بھی تعلقات تھے کتنی عجیب سی بات ہے کیا امی یہ بات جانتی تھیں کہ میں نواب سطوت کی اولاد ہوں۔ پھر انہوں نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی اور پھر کیا یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ برسات کی اس اندھیری رات میں میری ماں کو شمسو بابا ہی ملے تھے اور انہوں نے بلا سوچے سمجھے اپنی بیٹی کو یوں ایک غیر آدمی کے حوالے کردیا اور وہ بھی اتنی قیمتی چیزوں کے ساتھ۔ نہیں اصل کہانی کچھ اور ہی ہے، نہ جانے کیوں مجھے امی کی ڈائری میں لکھی ہوئی باتیں جھوٹ لگنے لگیں۔ میری امی ضرور میری اصل ماں سے واقف تھیں۔ کہیں میری اصل امی کی کوئی بہن یا ساتھی تو نہیں تھیں کہیں میں بھی کسی طوائف کے بطن سے تو نہیں پیدا ہوئی اور میں نواب سطوت کی ناجائز اولاد ہوں۔

اس بات کا خیال آتے ہی مجھے اپنے وجود سے کراہیت محسوس ہونے لگی میرے دل نے گواہی دی کہ اصل بات یہی ہے۔ میری ماں نے امی کے حوالے خود مجھے کیا ہوگا ہوسکتا ہے کہ مرگئی ہوں اور مرنے سے پہلے امی کی گود میں مجھے دے دیا ہو، یہ بات جانتی نہیں کہ میں نواب کی ناجائز اولاد ہوں۔ اس لیے وہ کبھی بھی میرے باپ کے بارے میں نہ بتا سکیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ نواب کی معاشرے میں کیا حیثیت ہے کہیں میں جذبات میں آ کر نواب کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔

بہت سی زہریلی سوچوں نے میرے دماغ میں ڈنک مار مار کر میرا سارا جسم مفلوج کردیا۔ ایک بار پھر

میرے ذہن میں ڈھیروں سوالات جنم لینے لگے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں اب بھی ایک ایسی اندھیری کوٹھری میں کھڑی ہوں جہاں کہیں کسی روزن سے روشنی کی ایک بھی کرن اندر نہیں آرہی میں بے شناخت ہوں۔

پھر میرا ذہن شمسو بابا اور اماں حمیدہ کی جانب چلا گیا کہ یہ دونوں ہستیاں امی کے ساتھ شروع ہی سے ہیں۔ یہ ضرور میرے باپ اور ماں کے بارے میں جانتی ہوں گی۔ ابھی تو یہ آنٹی میرے گھر آئی ہوئی ہیں۔ شمر نامی شخص جب نہیں آکر یہاں سے لے جائے گا' تب میں ان لوگوں سے بات کروں گی اور انہیں مجبور کردوں گی کہ وہ مجھے میری اصلیت سے آگاہ کریں۔ یہ سوچے بنا کہ اصلیت جان کر مجھے دکھ ہوگا یا خوشی۔ میں تو ہر طرح کی بات سننے کے لیے تیار تھی۔

فی الحال تو صبح مجھے شاداب نگر جانا ہے۔ وہاں سے آؤں گی تب تک شمروز بھی شاید آنٹی کو آکر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

میرا سر درد کی شدت سے پھٹا جارہا تھا۔ زہریلی سوچیں اور اندیشے کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے میرے دماغ میں کنڈلی مار کر بیٹھ گئے تھے۔

رات گزرتی جارہی تھی اچانک میرے کانوں میں فجر کی اذان کی آواز آنے لگی۔ تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی ٹیبل پر میری نگاہ پڑی اماں جو چائے رات کو میرے لیے لے کر آئی تھیں وہ جوں کی توں رکھی تھی میں پینا بھول گئی تھی۔

اذان کے الفاظ سنے تو احساس ہوا کہ میرا ربّ مجھے پکار رہا ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ اگر اس کا ساتھ مل جائے تو انسان اکیلا نہیں رہتا۔ وہ کہہ رہا ہے آؤ میرا شکر ادا کرو میں نے تمہیں انسان بنایا تمہیں ہاتھ پاؤں دیے تمہیں سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت دی۔ بہت سی قوتیں۔ اور صلاحیتیں عطا کیں۔ تو آؤ میرے آگے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کھڑے ہو جاؤ۔ جب تمہیں میری بڑائی اور کبریائی کا احساس ہونے لگے تو میرے آگے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک جاؤ اور پھر جب اسے اپنا معبود مالک اور ربّ تسلیم کرو تو اپنی جبیں اس کے آگے ٹیک کر اس کا شکر ادا کرو۔

میں اللہ کو اپنا مالک اور معبود تسلیم کر کے وضو کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یکا یک اکیلے پن اور تنہائی کا احساس کہیں دور جانے لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ دنیا کو بنانے اور سنبھالنے والی سب سے بڑی طاقت اللہ جو ربّ العالمین ہے میرے ساتھ ہے۔ وہ کبھی مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا میرا وجود اس دنیا میں کس طرح آیا اس کی ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میرے رب نے جس طرح چاہا مجھے دنیا میں بھیجا پھر میں کیوں خود کو کمزور سمجھوں۔

میں پوری عاجزی اور دل کی سپردگی کے ساتھ اللہ کے آگے کھڑی ہوگئی۔ اس کی حمد و ثنا دل کی گہرائی سے بیان کرنے لگی مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا جیسے میرا ربّ میرا مالک میرے سامنے ہے میں اس کی بندی اس کے آگے کھڑی ہوں۔

پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر کے فارغ ہوئی تو ذہن کا سارا بوجھل پن رفع ہو چکا تھا۔ میں اپنے اندر ایک نئی طاقت اور اعتماد محسوس کر رہی تھی۔ البتہ سر میں تھوڑا درد باقی تھا۔ ساری رات گزر چکی تھی اور میں لمحہ بھر بھی نہیں سوئی تھی۔ پہلے دل چاہا کہ کچن میں جا کر چائے بنا کر پیوں اماں بھی نماز سے فارغ ہوگئی ہوں گی لیکن پھر سوچا کہ تھوڑی دیر کے لیے سو جاتی ہوں۔ میرے ربّ نے میرے دل کو ایک عجیب سا اطمینان بخش دیا تھا میں نے رو رو کر اور گڑگڑا کر اپنے ربّ سے اپنا ساتھ دینے کی دعا جو کی تھی۔ میں نے تکیے پر سر رکھا اور ذرا ہی دیر میں گہری نیند میں چلی گئی۔

موبائل فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی میں نے بمشکل آنکھیں کھول کر موبائل تکیے کے قریب ٹٹول کر اٹھایا اور نیند کے خمار سے بوجھل لہجے میں ہیلو کہا۔

''واہ بھئی واہ بلکہ سبحان اللہ محترمہ ابھی تک محو استراحت ہیں کیا شاداب نگر نہیں چلنا ہے۔'' میرے کانوں میں حسام کی چہکتی ہوئی آواز آئی تو میری آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور بوکھلا کر کہا۔

''کیا ٹائم ہوا ہے؟''

''ساڑھے سات بج چکے ہمیں بس تھوڑی ہی دیر میں نکلنا ہے۔ تم ابھی تک چینل پر نہیں آئیں تو میں نے فون کرلیا۔ مگر یہاں تو محترمہ بے فکری سے گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اوکے حسام جسٹ تھرٹی منٹس میں پہنچ رہی ہوں۔ پلیز ویٹ......!'' میں نے فون بند کر کے بیڈ پر پھینکا اور کمرے کا دروازہ کھول کر آواز لگائی۔

''اماں پلیز پانچ منٹ کے اندر چائے ناشتہ......!'' الماری سے اپنا لباس سلیکٹ کیے بغیر ہی ہینگر سمیت نکال لیا اور واش روم میں گھس گئی۔

میرے لباس کا خیال اماں ہی رکھتی تھیں۔ انہیں دھلوا کر پریس کروا کے وہی الماری میں ہینگر کروایا کرتی تھیں۔

میں نے پانچ منٹ میں نیم گرم پانی سے شاور لیا اور باہر آ گئی اماں چائے اور سلائس انڈا لیے کمرے میں موجود تھیں۔

''اے ہے یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار کہاں جارہی ہو اتنی صبح صبح...... تسلی سے بیٹھ کر ناشتہ تو کرلو۔ رات کو چائے بنوائی وہ بھی جوں کی توں پڑی ہے۔'' اماں نے مجھے جلدی جلدی بالوں میں برش پھیرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''اماں میں شاداب نگر جارہی ہوں نواب سطوت کی بیٹی کی تدفین کے سلسلے میں ہمارے چینل کی ٹیم کے ہمراہ۔'' میں نے اماں کے ہاتھ سے چائے کا مگ لے کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''نواب سطوت کی حویلی میں......!'' اماں نے حیرانی سے کہا اور مجھے متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

''ہاں! لیکن آپ پریشان مت ہوں میں وہاں اپنی ٹیم کے ہمراہ جارہی ہوں۔ فی الحال اس سے اس کی بیٹی ہونے کا دعویٰ نہیں کروں گی۔'' میں نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے ان کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو میں تمہیں وہاں جانے نہیں دوں گی۔ دوسرے لوگ جا تو رہے ہیں۔ پھر تم کیوں جارہی ہو۔'' اماں نے گھبرا کر کہا۔

''میں نے کہا تو ہے کہ آپ بے فکر رہیں۔ میں وہاں سے آکر آپ سے تفصیلی بات کروں گی۔''

میں نے آدھا پیا ہوا چائے کا مگ ٹرے میں رکھا' پلٹ کر ٹیبل سے اپنا بیگ اٹھایا اور موبائل اٹھا کر پرس میں رکھا۔

''بیٹا میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ کہیں کچھ ایسا ویسا نہ ہو جائے۔'' اماں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا رات جو میں نے نواب سطوت کو دیکھتے ہی چیخ مار کر اماں کو بلایا تھا اور نواب سطوت کی جانب اشارہ کیا تھا تو میں نے انہیں وہی دونوں چیزیں دکھائی تھیں۔ جن سے اماں بھی واقف تھیں۔ نواب سطوت کے گلے میں پڑا

پتھر کا تعویذ اور ہاتھ میں تھامی ہوئی اسٹک ویسی ہی تھیں جیسی میرے پاس موجود تھیں۔ اماں بھی جان چکی تھیں کہ میں نے نواب سطوت کو اپنے باپ کی حیثیت سے پہچان لیا ہے اور ان کی گھبراہٹ کا سبب بھی یہی بات تھی۔

میں نے بیگ کندھے پر ڈالا اور کار کی چابی اٹھا کر تیزی سے کمرے سے باہر نکلی تو اماں میرے پیچھے پیچھے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھامے چلی آئیں۔

"ارے بیٹا کم از کم ایک سلائس ہی کھا لیتیں وہاں تم کہاں کچھ کھا سکو گی۔"

"یہ میرا نام لے کر آپ کھا لیجیے گا' سمجھیں میں نے کھا لیا۔" میں نے پلٹ کر اماں کو پیار کیا اور باہر نکلتے ہوئے آواز لگائی۔ "آپ فکر نہ کریں میں شاداب نگر جاتے ہوئے راستے میں کچھ کھا لوں گی۔"

میں کار کو ہوا میں اڑاتی ہوئی چینل پر پہنچ گئی وہاں سب جانے کے لیے تیار تھے صرف میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔

"کمال ہے یار کتنی دیر سے مسلسل تمہیں کالز کر رہا ہوں کم از کم بندہ ایک مرتبہ تو فون ریسیو کر ہی لیتا ہے۔" حسام مجھے دیکھتے ہی بھڑک اٹھا۔

"سوری...... سوری...... آئی ایم لیٹ' اب چلیں۔" میں نے تحمل کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اس سے معذرت کی اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا۔

"اٹس او کے' لیکن بائی دی وے جب تم نے خود ہی وہاں جانے کا پروگرام بنایا تھا تو کیوں اتنی بے پروائی دکھائی' تمہیں پتا ہے صرف تمہاری وجہ سے مجھے کتنی ساری باتیں سننا پڑیں ہیں۔" اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

"اچھا بابا سوری کر تو لی اب کیا جان لو گے۔" میں نے بھی بگڑے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ ہمیشہ کی طرح فوراً ٹھیک ہو گیا۔ پھر تیز قدموں سے وین کی جانب اس کے ہمراہ قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اس سے سرگوشی میں کہا۔

"وہاں سے واپس آنے کے بعد تمہیں ایک بہت اہم بات بتانی ہے مجھ پر رات ایک بہت اہم انکشاف ہوا ہے۔ اس وجہ سے میں ڈپریشن کا شکار ہو گئی اور رات کو سو نہیں سکی۔ بس ابھی دو گھنٹے قبل ہی آنکھ لگی تھی۔"

"کیوں کیا ہوا' خیریت تو تھی۔" اس نے چلتے چلتے اچانک رک کر پوچھا۔

"نہیں' اب سب ٹھیک ہے۔ ابھی ٹائم نہیں ہے اس لیے میں کچھ نہیں بتا سکتی ویسے ہو سکتا ہے کہ وہاں جا کر تمہیں خود ہی میری ٹینشن کا سبب معلوم ہو جائے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"وہاں جا کر۔" اس نے حیرت سے کہا اور پھر رک گیا۔

"ارے بابا چلو بھی دیکھو سب ہمیں گھور رہے ہیں۔" میں نے بے پروائی سے جھنجلا کر کہا۔

"ایک تو تم سسپنس بہت پھیلاتی ہو پتا نہیں تمہارے ساتھ میری زندگی کیسے گزرے گی۔" اس نے روا روی سے کہا تو میں اسے گھورنے لگی۔

"کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے ویسے بھی آج امی کہہ رہی تھیں کہ میرا بچہ نظر لگنے کی حد تک اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"خوش فہمی ہے ماں بیٹے کی۔ نظر لگے گی اور تمہیں کم از کم روزانہ منہ ہی دھو لیا کرو۔" میں نے اس کی بڑھی ہوئی شیو اور سانولے رنگ پر چوٹ کی۔

"ارے اس مردانہ وجاہت پر تو لڑکیاں مرتی ہیں اگر روزانہ منہ دھونے لگا تو اللہ خیر ہی کرے۔" اس

نے مسکراتے ہوئے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اس ہلکی پھلکی نوک جھوک کے درمیان ہم پارکنگ میں کھڑی وین تک پہنچ گئے۔ ہماری کیمرہ ٹیم پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی ہم بیٹھ گئے تو وین روانہ ہو گئی۔

ہمیں شاداب نگر پہنچنے میں تقریباً سات گھنٹے لگے۔ راستے میں ہم نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے لی تھیں۔ جیسے جیسے شاداب نگر نزدیک آ رہا تھا میرے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ میں خود ہی اپنے آپ کو ریلیکس کر رہی تھی۔ ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ کیا واقعی نواب سطوت میرا باپ ہے اور آج اپنی پچیس سالہ زندگی میں آج پہلی مرتبہ میں اس سنگ دل شخص کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھوں گی۔ ہم کیسے باپ بیٹی تھے کہ ہم نے ایک مرتبہ بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔

ہم شاداب نگر پہنچے تو وہاں لوگوں کو ہٹاتے ہوئے ہماری وین حویلی کی جانب بڑھی اور حویلی سے خاصے فاصلے پر ہی ہمیں وین کو روک کر اتر جانا پڑا کیونکہ لوگوں کے رش کی وجہ سے وین کو آگے بڑھانا ممکن ہی نہیں تھا۔

وہاں سطوت کی حویلی کے بہت سے ملازمین جگہ جگہ کھڑے لوگوں کی رہنمائی کر رہے تھے کہ انہیں کس جانب جانا ہے۔ یہ سب یہاں کی انتظامیہ کے لوگ تھے۔ ہمارے علاوہ یہاں اور دوسرے نیوز چینلز کی ٹیمیں بھی آئی ہوئی تھیں۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر ہم سب سے بات کی اور ہمیں ایک دوسرے شخص کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں حویلی کے اس مردانہ حصے میں لے جایا جائے جہاں پیر سائیں تشریف رکھتے ہیں۔ تب میں نے کہا کہ میں حویلی میں اندر خواتین کے حصے میں

جانا چاہتی ہوں۔

"بی بی اندر پردے والی بیبیاں ہیں ادھر کیمرہ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں کیمرے کے ساتھ اندر نہیں جاؤں گی تنہا وہاں جاؤں گی اور بڑی بی بی یعنی نواب صاحب کی بیگم سے بات کروں گی۔" میں نے کہا۔

"لیکن بی بی ادھر پیر سائیں کا سختی سے حکم ہے کہ میڈیا کا کوئی بندہ اندر نہیں جائے گا۔" اس نے سختی کے ساتھ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟" میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

"پردہ بی بی پردہ۔ وہ پاک بیبیاں ہیں پیر سائیں کے حرم سے ہیں تمہاری طرح تھوڑی یوں منہ اٹھا کر ہر جگہ چلی جاتی ہو۔" اس نے کچھ اس طرح سے کہا کہ مجھے غصہ آ گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" میں نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا لیکن وہ دوسری جانب متوجہ ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔" جاؤ بی بی ہمارے ساتھ مغز ماری مت کرو ویسے بھی آج اس حویلی پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہمارے پیر سائیں کی لخت جگر ان سے جدا ہو گئی ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں بھر آئیں۔

"لعنت ہے تم جیسے اندھے عقیدت مندوں پر جو ایسے شیطان نما لوگوں کی اصلیت سے ناواقف ہوتے ہوئے انہیں اپنا سب کچھ مان لیتے ہیں۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

ہاتھ میں مائیک لیے اپنے کیمرہ مین کے ہمراہ وہاں روتے بلکتے لوگوں سے بات چیت کرتی رہی۔ وہاں موجود ہر شخص سے بات کر کے اندازہ ہوا کہ یہ جاہل اور سادہ لوح لوگ نواب سطوت سے کتنی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔

نماز جنازہ میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ تب میں اور حشام اپنے کیمرہ مین کے ہمراہ نواب سطوت کی جانب بڑھے۔ اندر بہت سخت سیکیورٹی تھی۔ بہت سی سیاسی جماعتوں کے لوگ اور صوبائی اور وفاقی وزراء وہاں موجود تھے۔ ہم کافی دور تھے۔ ہماری یہ ساری کوریج لائیو ہمارے نیوز چینل پر نشر کی جا رہی تھی۔

اس وقت میں نے مائیک حشام کے ہاتھ میں دے دیا اور خود ایک طرف کھڑے ہو کر نواب سطوت کو دیکھنے لگی۔ سطوت سے زیادہ میری نگاہیں اس کے گلے کے تعویذ اور اسٹک پر تھیں اور پھر حشام بھی ایک دم چونک پڑا شاید اس نے بھی ان چیزوں کو پہچان لیا تھا اس کی نگاہیں لمحہ بھر کو میری نگاہوں سے ملیں اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم نے کچھ غور کیا۔"

"ہاں......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" میں نے رات کو ٹی وی پر ہی دیکھ لیا تھا۔" میرے منہ سے سرسراتے ہوئے لہجے میں نکلا۔

اور پھر ہم مزید کوئی بات کرتے کہ وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ جنازہ اٹھنے کا وقت ہو گیا تھا نواب سطوت کے خاص مریدین میں سے دو آدمی آگے آئے اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہنے لگے تو وہ اٹھ کر اندر حویلی کے زنانے حصے کی جانب جانے لگا اور جاتے ہوئے وہ اتفاق سے بالکل میرے نزدیک سے ہو کر گیا۔ تب میں نے نزدیک سے اس تعویذ اور اس کے ہاتھ میں تھامی ہوئی اسٹک کو غور سے دیکھا۔

میں اس وقت آن ڈیوٹی تھی اس لیے فی الحال ساری باتیں بھول کر اپنی ڈیوٹی میں مصروف ہو گئی۔

ذرا دیر کے بعد اندر سے جنازہ برآمد ہوا۔ نواب سطوت جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ باہر ایک

بڑی ایمبولینس میں جنازہ رکھ دیا گیا اور نماز جنازہ کے لیے ایک بڑے گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔ سارے بڑے بڑے لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ایمبولینس کے ساتھ چلنے لگے اور ہم پیدل ہی چلنے لگے۔ سڑک کے دونوں اطراف میں بہت سے لوگ عورتیں اور مرد کھڑے تھے اور دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے گویا وہ اپنے پیر سائیں کے غم میں برابر کے شریک تھے اور آنسو بہا کر اپنے دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔

نماز جنازہ اور تدفین کے مراحل طے ہوتے ہوتے مغرب کا وقت ہو گیا اور ایک تھکا دینے والے دن کے اختتام پر ہم نے وین میں بیٹھ کر واپسی کی راہ لی۔ بھوک اور تھکن سے برا حال تھا۔ میں تو رات بھر کی جاگی ہوئی تھی حشام خلاف معمول بہت خاموش اور سنجیدہ تھا وہ کسی سے بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ بس سر جھکائے خاموش بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ میں اس کی خاموشی اور سنجیدگی کی وجہ جانتی تھی اس لیے کوئی استفسار نہیں کیا البتہ کیمرہ مین عبدالحق حشام کو چھیڑنے لگا کہ" کیا بات ہے لگتا ہے نواب سطوت کی جوان بیٹی کی موت کا تمہیں بہت دکھ ہوا ہے۔ بالکل خاموش اور سنجیدہ بیٹھے ہو۔"

"ارے نہیں یار میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔" حشام نے ایک گہری نگاہ میرے اوپر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں واقعی تھکن تو مجھے بھی بہت ہو رہی ہے۔ وہاں اتنا رش تھا کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ملی بلکہ میں تو اندر حویلی میں عورتوں میں جانا چاہ رہی تھی لیکن مجھے جانے ہی نہیں دیا گیا۔" میں نے نارمل لہجے میں کہا تو حشام چونک کر حیرانی سے دیکھنے لگا۔ وہ میرے اتنے نارمل انداز پر یقیناً حیران ہو رہا تھا۔

"کیوں تمہیں اندر کیوں نہیں جانے دیا۔" عبدالحق نے پوچھا۔

"بھئی اندر پردے والی بیبیاں تھیں ناں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" حالانکہ میں نے کہا بھی کہ میں اندر کیمرہ نہیں لے جاؤں گی۔ پھر بھی......!"

"دراصل ہم سے پہلے "چڑھتا سورج" نیوز چینل کی نوشابہ نے اندر تنہا جانے کی اجازت مانگی لیکن اندر جا کر اس نے اپنے موبائل سے اندر کی ویڈیو بنالی تھی۔ اس کو ایسا کرتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا اور اس سے اس کا موبائل فون چھین کر اسے وہاں سے باہر نکال دیا بعد میں مووی ڈیلیٹ کر کے اس کا موبائل واپس بھی کر دیا اس کے بعد میڈیا کے کسی بھی بندے کی اندر جانے کی سختی سے ممانعت کر دی۔" عبدالحق نے تفصیل بتائی پھر بولا۔

"ارے اس نواب سطوت کی ایک دو ایسی باتیں مجھے معلوم ہیں کہ اگر وہ میں میڈیا پر بتا دوں تو اس کی کیا عزت رہ جائے لیکن بھائی یہاں معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کے خاندان کے خاندان ختم ہوتے دیکھے ہیں اور میں تو یوں بھی اپنی بیوہ ماں اور تین جوان بہنوں کا اکلوتا سہارا ہوں۔ بس اسی وجہ سے زبان کو تالا لگا ہوا ہے۔"

"کیا بات ہے مجھے تو بتا دو میں کس سے کہوں گی۔" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"رہنے دو بات جب تک اپنے اندر ہے محفوظ ہے ایک بار باہر نکل گئی تو راز داری کی کوئی گارنٹی نہیں رہتی۔" اس نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری بات کو الم نشرح کرتی پھروں گی۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ارے یار بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ اسلام الدین کہیں کوئی ڈھابہ دیکھ کر وین کو روک دینا۔" اس نے میری بات کو سنی ان سنی کر کے ڈرائیور کو مخاطب کر

کے کہا۔

"چھوڑو ناں کیوں ضد کر رہی ہو وہ نہیں بتائے گا۔" حشام نے آہستگی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی کی۔

"پھر بھی کچھ تو پتا چلے۔" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا عبدالحق پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر وہ بات باہر نکال لوں جو اس نے اپنے پیٹ میں چھپا رکھی ہے۔ میرا دل اندر سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو عبدالحق کو بھی نواب سطوت اور سرمئی بیگم کے تعلقات کا علم ہے اور یہ اس حوالے سے یہ بات کہہ رہا ہے حالانکہ حشام مجھے مسلسل روک رہا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ میں اس بات کو رہنے دوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے بھی ضد سی ہو گئی تھی۔

"کہیں تم نواب سطوت اور سرمئی بیگم کے تعلق کی بات تو نہیں کر رہے......!" میں نے بالآخر عبدالحق کی جانب جھکتے ہوئے یہ بات سرگوشی میں کہہ ہی دی۔ تو وہ ہونق سا میری جانب دیکھنے لگا اور منہ پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کرنے لگا۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں کر رہے ہو کیا یہاں کوئی نواب سطوت کا بندہ بیٹھا ہے۔" میں نے بدستور سرگوشی میں کہا۔

"اس کے خلاف تو ہوائیں بھی سن گن لے لیتی ہیں اور بات اس تک پہنچا دیتی ہیں۔ اس لیے میرا کہنا مانو اور خاموش بیٹھو۔" اس نے سخت لہجے میں سرگوشی کی۔

"اچھا اب تو بتا دو کہ تم اس بات کے لیے کہہ رہے تھے۔" میں نے اٹھلیے لہجے میں کہا تو اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ بات تو مجھے پہلے سے ہی معلوم تھی۔" میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اس موضوع کو اب ختم کر دو دیکھو وہاں روشنی نظر آ رہی ہے۔ شاید وہاں کھانے پینے کا سامان مل جائے۔ حشام نے کہا اور ڈرائیور کو اس جانب گاڑی موڑنے کے لیے کہا۔

وہ ایک ڈھابہ ہی تھا ڈرائیور اتر گیا۔ باقی ہم لوگ گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ ہماری ٹیم کے دوسرے لوگ بھی ساتھ ہی اتر گئے اور کھانے پینے کا سامان لے آئے باقی راستے ہم نے دوبارہ نواب سطوت کے موضوع پر ہر کوئی بات نہیں کی۔

بارہ بجے کے قریب ہم اپنے نیوز چینل پر پہنچے۔ وہاں رپورٹ کی اور پھر میں نے گھر فون کر کے اماں حمیدہ کو اپنے واپس آنے کی اطلاع کر دی۔

یہاں سے نکلتے نکلتے رات کا ڈیڑھ بج گیا تھا۔ واپسی کے لیے جب میں گاڑی میں بیٹھنے لگی تو حشام نے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا تو میں نے کہا کہ میری گاڑی کون لے کر جائے گا اور اگر گاڑی یہیں کھڑی رہی تو صبح میں کیسے آؤں گی تو وہ بولا۔

"جب میں تمہیں اس وقت گھر چھوڑ سکتا ہوں تو کل صبح لینے بھی آ سکتا ہوں۔"

"لیکن حشام رات میں اگر اچانک گاڑی کی ضرورت پڑ گئی تو......!"

"رات میں کیا ضرورت پڑ سکتی ہے ویسے بابا کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے کہا۔

"لو......!" میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ کل رات کچھ ایسی صورت حال ہوئی کہ میں بابا کے کمرے کی جانب گئی ہی نہیں، پتا نہیں ان کا کیا حال ہے۔"

"اچھا ایسا کرو کہ تم اپنی کار میں جاؤ میں تمہارے ساتھ ساتھ اپنی کار میں تمہارے گھر تک جاؤں گا اور تمہیں وہاں چھوڑ کر گھر واپس آ جاؤں گا۔" حشام نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"سرمئی مجھے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے لیکن اس وقت نہیں، کل اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تو حشام نے جھک کر میری جانب کھڑکی میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں کہ تم کیا بات کرنا چاہتے ہو ان شاء اللہ کل ملتے ہیں پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" یہ کہہ کر میں نے کار کی چابی اگنیشن میں ڈال کر گھما دی۔

"میری سمجھ میں تمہاری شخصیت نہیں آتی اتنی بڑی بات سامنے آ گئی اور تمہارا اطمینان قابل تعریف ہے۔ تمہیں ذرا بھی ایکسائٹمنٹ نہیں ہے۔" حشام نے کہا۔

"آخر بیٹی کس کی ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "بڑے بڑے جرم کرنے کے بعد بھی اندر ٹھنڈ ہی ٹھنڈ رہتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا کر لے گئی۔ میں نے حشام کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور گاڑی کو تیزی سے مین روڈ پر لے آئی تب میں نے حشام کی گاڑی کو پیچھے آتے ہوئے دیکھا وہ زور زور سے ہارن بجا رہا تھا۔ روڈ پر اس وقت ٹریفک قدرے کم ہو گیا تھا بسیں وغیرہ تو بالکل ہی نہیں تھیں اس لیے میں روانی سے گاڑی بھگا رہی تھی لیکن حشام کی گاڑی کا ہارن سن کر میں نے اپنی گاڑی کی اسپیڈ ہلکی کر دی اور میری اسپیڈ ہلکی ہوتے ہی حشام تیزی سے میرے برابر میں گاڑی لایا اور کھڑکی سے منہ نکال کر چیخا۔

"ہوش میں رہ کر ڈرائیو کرو، کیوں پاگلوں کی طرح بھاگی جا رہی ہو۔"

"اوکے اوکے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر معذرت کا اظہار کیا اور گاڑی کی رفتار ہلکی کر لی۔ گھر آ کر میں نے گاڑی روکی تو حشام اتر کر آ گیا اور بولا۔

"کیوں کھلم کھلا میرے قتل کا سامان کرتی رہتی ہو۔"

"کیا ہوا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ کیوں اتنی تیز ڈرائیونگ کر رہی تھیں۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرا کیا ہوتا" اس نے مسکین سی صورت بنا کے کہا۔

"اچھا اب جاؤ، مجھے زبردست نیند آ رہی ہے۔" میں نے کہا اور زور زور سے ہارن بجانے لگی۔ حشام اپنی گاڑی بیک کرنے لگا تو میرے گھر کا گیٹ کھل گیا اور میں تیزی سے گاڑی اندر لے گئی۔ میں گاڑی پارک کر کے اندر گئی تو اماں اور آنٹی پریشان شکل لیے کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا ہے میں نے فون کر تو دیا تھا کہ میں آ گئی ہوں۔" میں نے دونوں کے چہروں پر شدید پریشانی کے آثار دیکھے تو کہا۔

"شمسو کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اس کا سانس رک رک کر آ رہا ہے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا ہو گا۔" اماں نے کہا۔

"بابا......!" میں ایک چیخ مار کر تیزی سے بابا کے کمرے کی جانب بڑھی۔

❁......☆......❁

آنٹی کو میں اس صحافی اور ٹی وی اینکر سرمئی کے حوالے کر کے کلفٹن نواب کی کوٹھی میں لوٹ آیا۔ حالانکہ نہ تو اس نے مجھے فون نمبر دیا اور نہ ہی اپنے گھر کا ایڈریس بتایا لیکن مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ بس یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہ مظلوم عورت اس

کے پاس محفوظ ہے اور اس نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ مجھ سے خود فون کے ذریعے رابطہ کرے گی۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن کم از کم میں اسے اتنا ضرور جانتا تھا کہ نیوز چینل کے حوالے سے میرے علاوہ سارا پاکستان بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں یہ نیوز چینل دیکھا جارہا ہے لوگ اس سے واقف ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک دو دن میں اس کے فون کا انتظار کروں گا پھر اس کے نیوز چینل پر جا کر خود اس سے ملوں گا۔ لیکن اس سے پہلے اور نواب کے واپس لوٹ کر آنے سے قبل مجھے ایک دو بہت ضروری کام کرنے تھے۔ ایک کام تو یہ تھا کہ ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کرنا تھا اور اس میں ضروریات زندگی کی کچھ ضروری چیزیں بھی ڈالنی تھیں۔ تاکہ میں ان آنٹی کو اس فلیٹ پر رکھ سکوں۔ جو کہانی انہوں نے مجھے اپنی سنائی تھی اس کو لے کر نواب سے انتقام کے لیے ان کا ساتھ مجھے عطیہ خداوندی نظر آرہا تھا۔

میں یہ بات بھی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ نواب کتنا پاورفل آدمی ہے کسی کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس کا ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے لیکن میں اس کے بہت نزدیک تھا۔ میں پس پردہ رہ کر اس کے لیے وہ کرسکتا تھا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ تو میں اسی بھیدی کا کام انجام دینے والا تھا جو نواب کی لنکا کو ڈھانے کا مصمم ارادہ کرچکا تھا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا مختلف نیوز چینل پر نواب کی بیٹی کی موت کی خبر آرہی تھی اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

نتھیا گلی میں مجھے راکھی نے بتایا تھا کہ نواب کی اولاد میں دو بیٹیاں ہیں اور ان دونوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ پھر یہ کون سی بیٹی ہے جس کی موت ہوئی ہے۔ ٹی وی پر تو یہی بتایا جارہا ہے کہ مرحومہ کی عمر اٹھائیس سال تھی اور ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر غصہ آنے لگا کہ راکھی نے یہ بات مجھے جھوٹ کیوں بتائی اور اس جھوٹ سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہونے والا ہے اگر وہ اتنی سی بات مجھے جھوٹ بتا سکتی ہے اور بھی نہ جانے اس نے کون کون سے جھوٹ بولے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے میں نے راکھی کا سیل فون نمبر ملایا جو اس نے چند بیلوں کے بعد اٹھالیا۔ وہ شاید کمرے میں تنہا تھی اور سو رہی تھی کیونکہ اس کی آواز مجھے نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہاں شمروز بولو کیا بات ہے؟"

"کیا تم سو رہی تھیں۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" میرے لہجے میں برہمی کا عنصر غالب تھا۔

"ہاں بولو میں سن رہی ہوں۔" اس نے ایک جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ بات فون پر کرنے والی نہیں ہے کیا تم اس وقت میرے پاس آسکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس وقت۔" وہ چونک گئی۔ "کیوں خیریت؟"

"ہاں بس خیریت ہی ہے۔" میں نے گول مول لہجے میں کہا۔

"کیا میری یاد ستا رہی ہے۔" اس کا لہجہ خمار آلود ہوگیا اور میں اس کا مطلب سمجھ کر بری طرح تپ گیا اور جھنجلا کر کہا۔

"اگر آسکتی ہو تو آجاؤ ورنہ میں آجاتا ہوں۔"

"کیا بات ہے ڈیئر بہت موڈ آف لگ رہا ہے بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے میں تو یہ سوچ کر خوش ہوگئی تھی کہ شاید تمہیں میرے قرب کی یاد ستا رہی ہے۔

لیکن تم تو غصے میں لگ رہے ہو کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔"

"تم مسلسل فضول باتیں کرکے اپنا اور میرا وقت برباد کررہی ہو مجھے صرف اتنا جواب دو کہ آرہی ہو یا نہیں۔" اس کی بکواس سن کر میرا دماغ بری طرح گھوم گیا اور میں نے کہا۔

"اگر نہیں آسکتیں تو دفع کرو مجھے صرف اتنا بتادو کہ میں آجاؤں۔"

"ارے نہیں ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ یہاں بہت سی نگراں آنکھیں ہیں جو ہمہ وقت ہماری نگرانی کرتی رہتی ہیں اور رات کے اس سمے اگر میں اور تم ملے تو یہ بات نواب سے چھپی نہ رہ سکے گی۔ وہ میری اور تمہاری اس ملاقات کو کبھی پسند نہیں کرے گا وہ لوگ یا چیزیں جو نواب کی دسترس میں رہ چکی ہیں انہیں اپنے آپ سے ریجیکٹ کرنے کے بعد بھی وہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی انہیں ہاتھ بھی لگائے وہ انہیں ضائع تو کرسکتا ہے لیکن کسی اور کو بخش دے ناممکن ہے یہ بات اس کی سرشت ہی میں شامل نہیں ہے۔" راکھی نے تفصیل سے نواب کی کمینی فطرت کے بارے میں مجھے بتایا میں خاموشی سے سنتا رہا پھر اس کی بات سے ایگری کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو سوری میں بھول گیا تھا اچھا یہ بتاؤ کہ میں فون پر تم سے کوئی بات کرسکتا ہوں۔"

"ہاں بولو میں تنہا ہوں۔" اس نے پرسکون سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ نواب کی دو بیٹیاں ہیں اور دونوں کی شادیاں وہ کرچکا ہے۔ لیکن اس کی تو کنواری لڑکی کی ڈیتھ ہوئی ہے اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھ سے غلط بیانی سے کام لیا...... آخر کیوں؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا جو میرے علم میں تھا میں نے تمہیں بتادیا' ہوسکتا ہے مجھ سے ہی غلط بیانی کی گئی ہو۔ کیا تم اس بات کو لے کر مجھ سے ناراض ہو۔" راکھی نے کہا۔

"ہاں بس یہی بات تھی میں نے سوچا کہ اگر تم مجھے یہ بات غلط بتاسکتی ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم نے مجھے اور باتیں بھی غلط بتائی ہوں۔ میں تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں تم صرف سچ بولنا ورنہ جھوٹ بولنے کا انجام تو تم جانتی ہی ہو کہ تمہاری عبرت ناک موت۔" میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ریلیکس شمروز ڈارلنگ ریلیکس تم جو بھی پوچھنا چاہتے ہو پوچھو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں ہر بات سچ ہی بتاؤں گی کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور یاد رکھو کہ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک بار اور ایک ہی مرد سے اپنا سب کچھ مان کر پیار کرتی ہے۔ میری زندگی میں آنے والے تم وہ پہلے اور آخری مرد ہو میں تمہیں کبھی بھی ناراض نہیں کرسکتی۔ چاہے میری جان ہی چلی جائے میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں میری جان کہ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ نواب اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں کرچکا ہے لیکن حقیقت مجھ پر اب کھلی ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کی تھی بلکہ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنی دوسری بیٹی کی بھی شادی نہیں کی ہوگی۔ نواب جیسے لوگ اپنی بیٹیوں کو بوڑھا کرکے مار تو سکتے ہیں لیکن انہیں دوسرے کے حوالے نہیں کرتے۔ ہاں اب پوچھو کہ اب اور کون سی بات تمہارے دل میں کھٹک رہی ہے۔" اس نے بہت میٹھے اور پیار بھرے لہجے میں بات ختم کی۔

"تم نے جو بات میری بہن اور نواب کے حوالے سے کہی تھی کیا واقعی وہ سچ ہے۔" میں اتنی شرمناک

بات پوچھتے ہوئے بھی سرتاپا کانپ رہا تھا۔
''ہاں ہاں بالکل سچ ہے۔ان دنوں شیر افضل نے نواب کو نتھیا گلی بلایا ہوا تھا اور اس بات کا اقرار نواب نے خود میرے سامنے کیا تھا اور تمہاری بہن کے حسن اور جوانی کے قصیدے......!''

''بس......!'' میں بری طرح دہاڑا۔''میں مزید اور کچھ نہیں سننا چاہتا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت ان اذیت ناک لمحوں کے بارے میں سوچ کر ہی میری کیا حالت ہو رہی ہے اب نواب کو میرے غیظ وغضب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں اسے کتے سے بھی بدتر موت دوں گا۔'' میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا میرے جسم کا سارا خون جمع ہو کر میری کنپٹیوں میں ٹکریں مار رہا تھا۔ میں غصے کی شدت سے لرز رہا تھا۔ پھر میں نے راکھی سے مزید کوئی اور بات نہیں کی اور فون بند کردیا۔

میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا لیکن میں نے پانی گلاس میں ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور جگ ہی اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ میرے حلق سے چند گھونٹ ہی اترے ہوں گے باقی کا پانی میری قمیص کو تر کر گیا تھا۔ میں نے باقی کا بچا ہوا پانی اپنے کھولتے ہوئے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سر پر انڈیل لیا۔

مجھے اپنے آپ کو نارمل حالت میں لانے میں کافی ٹائم لگ گیا۔ ایک بار پھر سے میری آنکھوں کے سامنے فائزہ کی ان بدمعاشوں کے ہاتھوں بے حرمتی اور اس کی سسکتی اور نوحہ کرتی بے لباس لاش آ گئی۔ پھر جس طرح اس کی تدفین میں نے کی وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ جس طرح میں نے شیر افضل سے بدلہ لیا تھا اس کی بیٹی کو برباد کر کے کاش میں نواب کی زندہ رہ جانے والی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی بدلہ لے سکوں لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اس کی حویلی تک رسائی ناممکن تھی۔

جب میں ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا اور وہ فیصلہ تھا نواب کی دردناک اور اذیت ناک موت کا تو میں ریلیکس ہو گیا۔

رات دھیرے دھیرے بیتی جا رہی تھی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر اس مظلوم عورت کی کہانی گردش کرنے لگی جو نواب کے ظلم کا شکار ہوئی تھی جسے میں اس جرنلسٹ لڑکی کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ ایسی اور بھی نہ جانے کتنی کہانیاں ہوں گی۔ نواب کی زندگی سے وابستہ جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں اور جن میں نواب نے ظلم وبربریت کا بازار گرم کر رکھا ہوگا۔

میں نے ٹی وی آن کیا اور نیوز چینل لگا لیا تقریباً ہر نیوز چینل سے وقفے وقفے سے نواب کی بیٹی کی موت کی خبر آ رہی تھی کہیں کہیں نواب کی جاگیر کے بارے میں بتایا جا رہا تھا نواب کی ویڈیو بھی دکھائی جا رہی تھی۔ وہ غمزدہ صورت بنائے لوگوں میں گھرا بیٹھا تھا۔

نواب کی صورت دیکھ کر جتنی فحش گالیاں مجھے آتی تھیں میں نے دے ڈالیں اور ایک انگلش مووی لگا کر دیکھنے لگا اور مووی دیکھتے دیکھتے کب میری آنکھ لگ گئی مجھے پتا نہیں چلا۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی تو میں ناشتے کے لیے باہر آ گیا۔ یہاں لاؤنج میں چالیس انچ کی بڑی اسکرین کا ٹی وی آن تھا اور ایک نیوز چینل جس پر لائیو کوریج آ رہی تھی لگا ہوا تھا اور کوٹھی کے سارے لوگ یہاں جمع اس لائیو کوریج کو دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے اس جرنلسٹ لڑکی کو بھی دیکھا جو مائیک ہاتھ میں لیے وہاں موجود لوگوں کے تاثرات اس جوان موت کے بارے میں جان رہی تھی۔

میں نے خاموشی سے کچن کا رخ کیا اور خود چائے بنا کر پی لی کیونکہ آج کچن خالی پڑا تھا۔ کوٹھی میں بھی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا۔

چائے پی کر میں چپکے سے کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ صحافی لڑکی کی جانب سے تو میں یوں مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ شاداب نگر گئی ہوئی ہے اس لیے آج تو اس کی کال نہیں آئے گی۔ میں اس وقت آنٹی روشن آراء کے لیے ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کلفٹن میں ہی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کر لیا۔ فلیٹ چھوٹا تھا لیکن فرنشڈ تھا۔ ایک آدمی کے لیے بھی کافی تھا میں نے اسٹیٹ ایجنسی والے کو اس کی مطلوبہ رقم ادا کی ایگریمنٹ سائن کیا اور چابی لے لی۔ میں نے دو موبائل فون بھی خریدے اور دو نئی سیم بھی مختلف ناموں سے لیں پھر کچھ اشیاء خورد ونوش خریدیں۔

میں رات تک ان سارے کاموں میں مصروف رہا۔ کھانا وغیرہ بھی باہر ہی کھایا اور رات گیارہ بجے میں کوٹھی میں واپس آ گیا۔

اس وقت ساری کوٹھی میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے گئے تھے سوائے گارڈز کے جو مجھے ہمیشہ کی طرح چوکس نظر آ رہے تھے میں بھی سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا اور کپڑے چینج کر کے سو گیا۔ دونوں موبائل فون میں نے فلیٹ میں ہی چھوڑ دیے تھے اور وہ موبائل فون اور سمز میں نے ایک اہم مقصد کے لیے خریدے تھے۔

راکھی نے میرے ان زخموں کو کرید ڈالا تھا جن پر وقت کی گردش نے کھرنڈ جمانا شروع کر دیا تھا۔ ایک بار پھر میں نتھیا گلی اپنے تصورات کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اماں یاد آئیں بابا جان یاد آئے ارمان کی شرارتیں اور اس کا چلبلا پن یاد آیا۔ فائزہ کی وہ چھوٹی چھوٹی شکایتیں جو وہ ارمان کے ستانے کے بعد مجھ سے کرتی تھی اور اس کی معصوم سی فرمائشیں...... مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا میرا تکیہ میرے آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

خیالات کا رخ بدلا اور ایک اور چہرہ میرے تصور کی اسکرین پر لہرایا۔ اس کی گہری آنکھوں میں ڈھیروں نمکین پانی تھا اور اس کے کانپتے لب مجھ سے شکوہ کناں تھے کہ میں نے اسے بھلا دیا آخر کیوں؟ میں نے ایسا کیوں کیا' کیا میں بے وفا تھا؟

وہ جذبہ کیسا سرکش جذبہ تھا مجھے کبھی کہیں سے بھی اس جذبے کا سراغ نہیں ملتا۔ جو دل کی سنگلاخ زمین پر خود بخود کسی سرکش چشمے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے وہ ایک غیر مرئی سی ڈور ہوتی ہے جو دو روحوں کو ایک بے عنوان بندھن میں باندھ دیتی ہے۔ اب تو وہ سب کچھ ایک خواب سا لگتا ہے۔

اب تو وہ بھی مجھے رو دھو کر خاموش ہو گئی ہو گی کسی اور کی دلہن بن کر ڈولی میں سوار ہو گئی ہو گی۔ پتا نہیں کسی اور کے ساتھ نکاح کے بندھن میں خود کو باندھتے وقت اس کی کیا کیفیت ہو گی۔ کیا اس نے مجھے یاد کیا ہو گا۔ کیا آج بھی ان گزرے بیتے لمحات کی کسک اس کے دل کو تڑپاتی ہو گی۔ جو ہم نے ساتھ گزارے تھے۔

وہ بہت حسین تھی گہری آنکھیں اور ان پر گھنی پلکوں کی جھالر' شولڈر پر لہراتے ہوئے اس کے تراشیدہ ریشمی بال' ستواں ناک کے نیچے نازک سے گلابی ہونٹ اور اس سے نیچے تھوڑی پر ننھا سا گڑھا۔

مجھے جب اس پر بہت پیار آتا تو میں انگلی کی پور سے اس گڑھے کو چھوتا اور میری آنکھوں میں محبت کا ڈھیر سارا خمار اتر آتا۔ وہ بہت بولڈ تھی۔ عام شرمیلی

لڑکیوں کی طرح نہیں شرماتی تھی اور میں کبھی اس کو چھیڑتے ہوئے کہتا۔

''مہوش تم کبھی تو میری نگاہوں کی وارفتگی سے شرما جایا کرو' میں تمہارے چہرے پر حیا کی لالی دیکھنا چاہتا ہوں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور کہتی۔

''پتا نہیں شاہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر کس طرح شرماتی ہیں۔'' اور میں اسے پیار بھری نگاہوں سے تکتا رہتا۔

کبھی میں اس سے فرمائش کرتا کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح شلوار قمیص اور دوپٹا کیوں نہیں پہنتی۔ وہ ہمیشہ مجھے جینز اور شرٹ یا کبھی جینز کے ساتھ چھوٹی کرتی میں ملبوس دکھائی دیتی تھی۔ مجھ سے گھبرا کر کہتی۔

''میں سوچتی ہوں شاہ' جب میں تمہارے ساتھ نتھیا گلی تمہارے بابا اور ماں کے گھر ان کی بہو بن کر جاؤں گی تب تو مجھے ایسا ہی لباس پہننا ہوگا۔ پتا نہیں میں پہن پاؤں گی بھی یا نہیں۔

وہ ایک امیر باپ کی لاڈلی بیٹی تھی لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ وہ مجھے دل وجان سے چاہتی ہے۔ کالج میں اسے پسند کرنے کے باوجود میں نے کبھی اس کی جانب پیش قدمی یہ سوچ کر نہیں کی کہ وہ ایک امیر باپ کی بیٹی ہے اور میرے بابا ایک غریب آدمی ہیں۔

لیکن وہ خود میری جانب کھنچی چلی آئی اور بڑے دھڑلے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کردیا۔ میں اس کا ساتھ پا کر بے حد مسرور تھا۔

مجھے رنگ برنگی کانچ کی نازک چوڑیاں بے حد پسند تھیں۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے فرمائش بھی کی تو اس نے کہا۔ کبھی کوئی ایسا موقع ہوگا تو پہن لوں گی۔

اس کی برتھ ڈے پر میں نے اسے سبز اور سرخ کانچ کی چوڑیاں اور کانوں کے جھمکے دیے تھے۔ اپنا تحفہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اور اس کے منہ سے سرگوشی میں نکلا۔

''شاہ کیا واقعی تمہیں چوڑیاں بہت پسند ہیں۔''

''بے حد۔'' میں نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔''اور مہندی بھی۔''

''پتا ہے شاہ میں نے آج تک اپنے ہاتھوں پر مہندی نہیں لگائی۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''آج کے بعد تم اپنے ان ہاتھوں کو صرف میرے لیے حنائی کرو گی۔ ان گوری اور سڈول کلائیوں کو کانچ کی چوڑیوں سے میرے لیے سجاؤ گی۔'' میں نے اس کے مخروطی ہاتھوں کو آہستگی سے تھام کر لبوں سے لگالیا۔

پھر بہت سارا وقت گزر گیا میں یہ سوچ کر اداس ہوگیا کہ مہوش کو میرے دل کے ان نازک احساسات کی کوئی پروا نہیں ہے۔

اس دن شام سات بجے تھے میں فلیٹ پر تنہا تھا اتفاق سے مہوش کی بے پروائیوں کے بارے میں سوچ کر آزردہ ہو رہا تھا کہ کال بیل بجی۔ میں نے بے دلی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے مہوش ہاتھوں میں شاپرز لیے کھڑی تھی۔

''اب سامنے سے ہٹو بھی کیا اندر بلانے کا ارادہ نہیں ہے۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ تو میں جیسے ہوش میں آگیا اور جلدی سے دروازے کے آگے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی ایک شاپر تو اس نے ٹیبل پر رکھ دیا اور ایک ہاتھ میں لے کر تیزی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

اور میں کرسی پر بیٹھ کر اس کو دیکھنے لگا۔ آج اسے دیکھ کر اپنے دل کو قابو کرنے میں بڑی دشواری پیش آرہی تھی۔ جس انداز سے آج وہ سج سنور کر آئی تھی ایسے حلیے میں' میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

سرخ ستاروں بھرا جالی کا جھلملاتا ہوا کرتا اور سرخ ہی جھلملاتا ہوا بڑا سا دوپٹہ اور مہندی کلر کا چوڑی دار پاجامہ' ہاتھوں میں مہندی اور کلائیوں میں میری دی ہوئی چوڑیاں تھیں۔

میں اس کے حسین روپ کے تصور میں کھویا ہوا تھا تب ہی اس کی شوخ آواز میرے کانوں میں آئی۔

''ہیپی برتھ ڈے ڈیئر شاہ۔''

وہ دونوں ہاتھوں میں کیک اٹھائے برتھ ڈے کا گیت گنگناتی ہوئی آ رہی تھی۔ کیک پر موم بتیاں جل رہی تھیں اور موم بتی کے شعلے کے پیچھے اس کا ملیح چہرہ جھلملا رہا تھا۔

اس نے کیک ٹیبل پر رکھا اور وہاں رکھا ہوا شاپر اٹھا کر اس میں سے پیک کیا ہوا گفٹ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''بہت بہت مبارک ہو اللہ کرے' ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنی زندگی کا یہ اہم دن گزاریں۔''

''آمین۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔''تمہیں یاد تھا یہ دن؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی بھلا کوئی بھولنے والی بات ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور چھری میری جانب بڑھائی۔ لیکن میری نگاہیں اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں بس اس کے چہرے کا طواف کرتے ہوئے ہزاروں بلائیں لے رہی تھیں۔

میری آنکھوں کا والہانہ پن اور ان سے جھانکتی ہوئی محبت کی شدتوں کو محسوس کر کے وہ گڑبڑا گئی۔ چھری نیچے رکھ کر اس نے اپنے حنائی ہاتھ گود میں رکھ لیے اور نگاہیں جھکالیں۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اس کے عارض حیا سے دہکتے ہوئے دیکھتے تھے۔

اس کی دودھیا کلائیاں کانچ کی سرخ اور سبز چوڑیوں سے بجی ہوئی تھیں۔ گود میں رکھے اس کے حنائی ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم کھنک سے مجھے سریلے نغمے سنائی

دے رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ان نغموں کے بول ہمارے ملن کی دعا بن گئے ہوں۔ مجھے ان نغموں میں شہنائی کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے نیچی نگاہ سے حیا آلود لہجے میں کہا۔

''تم آج صرف میرے لیے سجی ہو۔'' میں نے پرشوق لہجے میں پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''آخر تمہیں میری خواہش پوری کرنے کا خیال آ ہی گیا۔ میں نے نرمی سے اس کی چوڑیوں کو یوں چھیڑا جیسے وہ کوئی رباب ہو۔

''میں نے تمہاری اس خواہش کی تکمیل آج کے دن کے لیے رکھ چھوڑی تھی تمہیں اچھا لگا۔'' اس نے کہا۔

''بہت زیادہ۔'' میں نے ایک جذب کے عالم میں آنکھیں بند کرکے دھیرے سے کہا تو اس نے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا۔

کتنے ہی لمحے بیت گئے ہم ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے ہم نے محبت کے کتنے ہی عہد کر ڈالے پھر وہ کچھ سمٹ کر میرے سینے میں سما گئی۔ میری کلائیوں کی گرفت اس کی کمر کے گرد اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے اپنی سرمئی آنکھیں اٹھا کر میری جانب دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی محبت کی تکمیل کی پیاس تھی۔ پھر میرے لبوں نے اس کے چہرے کے حسین نقوش کو خراج تحسین پیش کیا۔ میں مزید گستاخ ہو جاتا اگر وہ تڑپ کر میری بانہوں سے نکل نہ جاتی۔

''نہیں شاہ...... ابھی تک......!'' اس نے تیز تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''آ...... آئی...... ایم...... سوری......!'' میں نے اپنے خشک ہو جانے والے حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اٹس او کے۔'' اس نے لمحہ بھر میں اپنے آپ کو نارمل کرلیا اور بولی۔

''بھئی جلدی سے کیک کاٹو میری نیت اس کیک پر بہت دیر سے خراب ہو رہی ہے۔''

''تمہاری کیک پر نیت خراب ہو رہی ہے اس لیے تم کیک کھالو گی اور میں کیا کروں کہ میری نیت جو تمہارے اوپر خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں اتنی آسانی سے ہڑپ ہو جانے والی شے نہیں ہوں۔ مسٹر شاہ زمان۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا اور میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس نے کتنا سچ کہا تھا کہ وہ آسانی سے میری بننے والی نہیں تھی اس کا باپ راجہ صرف الیکشن جیتنے اور شیر افضل کا ساتھ دینے کی وجہ سے میرا دشمن ہو گیا۔ حالانکہ مہوش اس کی مرضی کے خلاف میرے گھر آئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر کٹوانے کے لیے میرے ساتھ تک گئی تھی۔ پھر راجہ نے زبردستی اسے بلوالیا۔ وہ اس دن کی گئی اور پھر آخری ملاقات میری اس کی کوٹھی میں چند لمحوں کے لیے ہوئی تھی۔ جب اس نے مجھے بتایا تھا کہ اندر شیر افضل شیر زادہ اور اس کے باپ کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس میٹنگ میں میرے علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او بھی شامل ہے۔ اس نے مجھے فوری طور پر وہاں سے چلے جانے کا کہا کہ وہاں رکے رہنے کی صورت میں میری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس نے رو رو کر مجھ سے اس بات کی معافی بھی مانگی کہ وہ میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی۔

اس آخری ملاقات کے بعد میری مہوش سے کوئی

ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ حالات اتنی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئے کہ میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میں سردار شیر افضل سے انتقام لینے کے چکر میں ہمیشہ کے لیے اپنے گھر سے نکل آیا اور ان لوگوں کے شیطانی چکر میں پھنس گیا۔ ڈاکٹر شاہ زمان تو کب کا مر گیا آج صرف شمروز زندہ ہے۔ ایک قاتل ایک بدکار دھوکے باز شمروز......!

میرے اندر بے تحاشہ زہر بھرا ہوا تھا۔ میرا وجود اس زہر سے اس وقت تک خالی نہیں ہو سکتا تھا جب تک میں یہ سارا زہر اپنے دشمنوں کی رگوں میں نہیں اتار دیتا۔

میں جاگتا رہا اپنے ماضی کی یادوں میں کھویا رہا۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان میرے کانوں میں آنے لگی۔ اگر میں اپنے پچھلے وقت میں ہوتا تو اذان سنتے ہی نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہو جاتا لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ ساری رات گزر گئی اب تو صبح ہونے والی ہے اب مجھے سو جانا چاہیے حالانکہ میرا دماغ اس وقت پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مجھے اس وقت بہت پرسکون نیند کی ضرورت تھی جس طرح کے حالات میں میں جی رہا تھا اس میں ٹینشن اور ڈپریشن کا شکار میں زیادہ ہی رہنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی دوائیں ہر وقت میرے پاس موجود رہتی تھیں۔

میں نے دراز کھول کر ریلیکس کرنے والی دوا کا پیکٹ نکالا اور ایک گولی پانی کے ساتھ حلق میں اتار لی۔ ریلیکس کرنے والی دواؤں میں ہلکی سی نیند کی دوا بھی شامل ہوتی ہے۔ دوا پینے کے بعد تھوڑی دیر تک میں اپنے ذہن کو بالکل فری کرکے لیٹا رہا۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں اور سیل فون اٹھا کر اس کی اسکرین پر نگاہ ڈالی تو ایک ان نون نمبر دکھائی دیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ رہنے دوں پھر خیال آیا کہ کہیں یہ فون اس جرنلسٹ لڑکی کا نہ ہو۔ وال کلاک پر نگاہ ڈالی دن کا ایک بج رہا تھا میں نے پوری طرح آنکھیں کھول کر فون ریسیو کرنے کا بٹن پش کیا اور ہیلو کہا۔

دوسری جانب میری توقع کے مطابق وہی تھی۔ میری آواز نیند کے خمار کی وجہ سے بھاری ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں سو رہا تھا بولی۔

''لگتا ہے کہ آپ سو رہے تھے آپ نے فون بھی دیر سے ریسیو کیا ہے میں بند کرنے ہی والی تھی خیریت تو ہے آپ اس وقت سو رہے تھے۔''

سنہری حروف

❖ زندگی کے آدھے غم انسان دوسروں سے غلط توقعات کرکے خریدتا ہے۔

❖ اچھے دوست کا ساتھ مت چھوڑو۔ خواہ وہ تمہیں چھوڑ دے۔

❖ ہر گم شدہ چیز اسی جگہ ملتی ہے جہاں گم ہوتی ہو سوائے محبت کے۔

❖ اپنا مزاج درویشانہ رکھو مضائقہ نہیں اگر تمہارا لباس شاہانہ ہے۔

❖ صرف خدا پر بھروسہ رکھو لیکن اپنی کوشش اور محنت کو نہ چھوڑو۔

❖ خدا کی تلاش میں بھٹکنے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھنے کی نظر میں دیکھو۔ خدا شہ رگ سے زیادہ قریب تم کو ملے گا۔

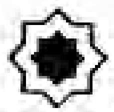
❖ اہمیت دکھ کی نہیں دکھ دینے والی کی ہوتی ہے۔

❖ زندگی سے پیار کریں کیونکہ یہ صرف ایک بار ملتی ہے۔

(کنیز فاطمہ، بورے والا)

میں نے انجان بننے کی اداکاری کی اور کہا۔
"سوری محترمہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں آپ کون بات کر رہی ہے۔"
"اگین سوری، مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا میں سرمئی بول رہی ہوں۔ نیوز چینل سے آپ کو اگر یاد ہو تو آپ نے اپنی کوئی امانت میرے سپرد کی تھی۔ اسی سلسلے میں بات کرنی تھی۔" مجھے اس کے لہجے میں ہلکے سے طنز کی جھلک محسوس ہوئی۔
"او......! اچھا یاد آیا، سرمئی صاحبہ بات کر رہی ہیں۔ جی بالکل یاد ہے میں آپ سے کونٹیکٹ کرنا چاہ رہا تھا لیکن آپ نے اپنا نمبر دینا مناسب ہی نہیں سمجھا اس لیے لامحالہ مجھے آپ کی کال کا انتظار تو کرنا تھا۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے ایک بالکل اجنبی ہونے کے باوجود ایک مظلوم عورت کی مدد کی۔ اللہ آپ کو اس کا صلہ دے گا......!" میں ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ وہ درمیان میں بول اٹھی۔
"یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے کہ اللہ ہمیں اس کا اجر دے گا یا نہیں۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ ان خاتون کو لینے کب آ رہے ہیں اور اس کے علاوہ میں آپ سے ان کے بارے میں تفصیل سے بات بھی کرنا چاہ رہی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے میرے چینل پر آ کر ملاقات کر لیں۔" وہ بہت مہذب لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔
"جی جی ضرور مجھے آنٹی کو آپ کے پاس سے لانا تو ہے۔ کل میں نے ان کے لیے ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لیا ہے۔ کل اس سلسلے میں مصروف تھا۔ پھر میں نے ٹی وی پر آپ کی مصروفیت بھی دیکھ لی تھیں۔ آپ شاداب نگر گئی ہوئی تھیں۔ رہی بات ان آنٹی کے بارے میں بات کرنے کی تو میں خود آپ سے ان کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ دراصل وہ ایک مظلوم عورت ہیں ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے سلسلے میں آپ کی مدد کی ضرورت پڑے اور آپ کو پہچان کر میں نے بڑے اعتماد سے انہیں آپ کے حوالے کیا تھا۔ ویسے وہ کیسی ہیں؟" میں نے بھی مہذب لہجے میں دوستانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر ٹھیک ہے آپ شام کو چار بجے ہمارے چینل پر آ جائیں میرے ساتھ حشام صاحب بھی ہوں گے۔ وہیں ہم ملاقات کر لیتے ہیں۔ پھر جہاں آپ کہیں گے میں آنٹی کو وہیں لے کر آ جاؤں گی۔ ویسے وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ہماری اماں سے ان کی بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"بہت بہت شکریہ۔ بس میں ایک گھنٹے میں یہاں سے نکلتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"سوری مسٹر آپ نے شاید ٹھیک سے سنا نہیں میں نے آپ کو چار بجے آنے کے لیے کہا ہے چار بجے کا مطلب ہے چار بجے۔" اس نے خاصے خشک لہجے میں کہا۔
"لگتا ہے آپ وقت کی بہت پابند ہیں؟" مجھے اس کا خشک لہجہ ناگوار لگا تو طنزیہ لہجے میں کہا۔
"وقت کی پابندی کرنا ہماری مجبوری ہے یہ نیوز چینل ہے میں یہاں جاب کرتی ہوں اور بے حد مصروف رہتی ہوں۔ چار بجے کا ٹائم اس لیے دیا ہے کہ اس وقت میں فری ہوتی ہوں۔" اس مرتبہ اس نے نرم لہجے میں کہا۔
"او کے اینڈ گڈ بائے۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔
میں سرمئی کے بارے میں سوچنے لگا کہ خاصی اسٹک لڑکی ہے اتنے سخت لہجے میں ٹو دی پوائنٹ بات کرتی ہے۔ اس کا تعلق میڈیا سے ہے اس سے کافی سوچ سمجھ کر اور محتاط رہ کر گفتگو کرنی پڑے گی۔

بہرحال آنٹی کے بارے میں تو اس کو بتانا ہی پڑے گا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ کاش اس سے پہلے میری آنٹی سے ایک ملاقات ہو جاتی اور ان سے یہ بات پوچھ لیتا کہ سرمئی کو بات کس حد تک بتائی جائے لیکن فی الوقت ایسا ممکن نہیں تھا۔ آنٹی سرمئی کے گھر میں تھیں اور میرے پاس نہ تو سرمئی کے گھر کا پتا تھا اور نہ ہی کوئی کونٹیکٹ نمبر تھا۔ سرمئی کی احتیاط کا اندازہ میں نے اس بات سے بھی لگایا کہ اس نے فون تک مجھے اپنے موبائل سے نہیں کیا بلکہ اپنے نیوز چینل کے نمبر سے کیا تھا۔
میں نے اٹھ کر غسل کیا اور ناشتہ کرنے کے لیے باہر آ گیا۔ کوٹھی میں مجھے خاصی گہما گہمی دکھائی دی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ آج نواب کی بیٹی کا سوئم ہے۔ اسی سلسلے میں قرآن خوانی اور کھانا تقسیم کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا یہ سب کوٹھی میں ہوگا تو مجھے بتایا گیا کہ نہیں یہاں بہت سے خیراتی ادارے ہیں۔ وہاں یہ انتظامات کرائے ہیں۔ اس سلسلے مجھے کئی نئے چہرے بھی دکھائی دیے۔ ایک جوان لڑکے کے بارے میں، میں نے گارڈ سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے بتایا کہ اس کا نام سلمان ہے اور کوٹھی کے جملہ امور اس کی نگرانی میں اس کے ذمے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی یہ بات جان کر کہ اتنے دن ہو گئے مجھے یہاں رہتے ہوئے مگر میں نے کبھی اس کو اس کوٹھی میں دیکھا نہیں۔
ابھی میں گارڈ کے پاس کھڑا اس کے بارے میں بات کر رہا تھا کہ وہ میرے قریب چلا آیا۔ گھنگھریالے بالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والا سلمان چھوٹا قد اور مختصر وجود رکھتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چیل کی سی چمک تھی۔
"آپ میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" اس نے میرے نزدیک آ کر ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔
"جی ہاں، میرا نام......!" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا تعارف کرانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر میرا جملہ مکمل کر دیا۔
"شمروز ہے آپ شمروز خان ہیں ناں، جانتا ہوں میں اور اس پہلے دن سے جانتا ہوں جب آپ نے اس کوٹھی میں قدم رکھا تھا۔"
"اچھا حیرت ہے مگر میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔
"اب دیکھ لیا ہے ناں تو دیکھتے رہیں گے۔" اس نے کہا اور دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک جانب لے کر چل دیا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔
"فلیٹ کس کے لیے کرائے پر حاصل کیا ہے......؟" اس کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ اور آنکھوں میں خاص چمک تھی اور اس کا سوال سن کر میرا دماغ بری طرح چکرا گیا۔
(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



مداوا

محترم عمران احمد قریشی!
السلام علیکم
حوصلہ افزائی پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ آپ کا تعاون ہی ہے جس نے مجھے لکھنے کا حوصلہ عطا کیا۔ دھیرے دھیرے میرے قلم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ایک نئی کہانی مداوا حاضر ہے۔ یہ کہانی مجھے پشاور یونیورسٹی کے ایک دوست نے سنائی تھی وہاں کے قبائلی اور سخت گیر ماحول اور معاشرے کے باعث میں نے تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کردیے بلکہ کچھ واقعات بھی حذف کیے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔

آپ کا اپنا
مہتاب خان
سائٹ، کراچی

وہ اس صبح حسبِ معمول یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ یونیورسٹی کے لیے اسے بس مین روڈ سے ملتی تھی جو اس کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ ابھی وہ مین روڈ سے کچھ دور ہی تھی کہ ایک کار بڑی تیزی سے اس کے قریب آ کر رکی وہ ایک دم چونک گئی تھی' کار سے دو دراز قامت نوجوان جو شلوار قمیص میں ملبوس تھے تیزی سے اس کے قریب آئے اور بڑے شائستہ لہجہ میں مخاطب ہوئے۔

''آپ میراب ہیں؟''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے وہ خاموشی سے مخاطب کا چہرہ دیکھتی رہی جو اس کے لیے اجنبی تھا۔

''آپ کون ہیں؟'' وہ ہمت کر کے بولی۔

''تعارف کی کوئی ضرورت نہیں' خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جائیں' میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ساتھ بدتمیزی کی جائے۔'' اس کے لہجے کی سفاکی سے اس کا دل دہل گیا۔ اس دوران دوسرے نوجوان نے ریوالور نکال لیا تھا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر ایک اور نوجوان اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس کا جسم کانپنے لگا' فق ہوتی ہوئی رنگت کے ساتھ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔

''اگر آپ کو امید ہے کہ چیخ کر یا شور مچا کر کسی کو متوجہ کرلیں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔'' اس نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیلتے ہوئے کہا تھا۔ دونوں نوجوان اس کے اطراف آ کر بیٹھ گئے اور تیسرے نوجوان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی' اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔

''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

''آپ کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔'' اسی نوجوان کی آواز ابھری۔

''میرے ابو اور بھائیوں کو پتا چلا تو وہ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' اس نے انہیں دھمکانے کی کوشش کی۔

''اچھا!'' انہوں نے مسکراتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا تھا۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔ آس پاس کی آوازوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک مصروف سڑک پر سے گزر رہے تھے اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی کہ ایک زوردار تھپڑ نے اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا پھر نہ جانے قیامت کا یہ سفر کب تک جاری رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس سفر کا اختتام ہوا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ نوجوان اسے ایک گھر کے اندر لے آیا تھا اس کی آنکھوں پر بدستور پٹی بندھی ہوئی تھی پھر ایک کمرے میں لا کر اچانک اس نوجوان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی تھی۔ چند لمحوں تک اسے کچھ نظر نہ آیا پھر آہستہ آہستہ اردگرد کا منظر واضح ہونے لگا اس نے دیکھا کہ نوجوان اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کا جواب تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔'' وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکی لیکن وہ دروازہ لاک کرچکا تھا۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی شاید وہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر آجائے۔ یہ ایک خاصا کشادہ کمرا تھا۔ کمرے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس میں گرل لگی ہوئی تھی وہ کھڑکی کے نزدیک آ گئی' اس سے نظر آنے والے منظر نے اسے ہولا دیا تھا۔ باہر دور دور تک سبزہ اور گھنے درخت نظر آرہے تھے اسے شاید شہر سے باہر کسی جگہ رکھا گیا تھا۔

کافی دیر تک وہ دروازہ بجاتی رہی اس کی وحشت بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے بے اختیار رونا شروع کردیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا اسے گھر والوں کا خیال آرہا تھا کہ اس کی گمشدگی سے ان پر کیا گزر رہی ہوگی' پہلی بار اسے اپنے کیے پر پچھتاوے کا احساس ہو رہا تھا۔ روتے روتے وہ کمرے میں موجود بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہی نوجوان لایا تھا اور خاموشی سے رکھ کر تیزی سے چلا گیا تھا۔ وہ سر پکڑے بیٹھی تھی ماضی کا ایک ایک منظر اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔

❁.....◐.....❁

یہ ان دنوں کی بات تھی جب اس نے یونیورسٹی میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا۔ نوجوانی کی عمر کچھ ایسی ہوتی ہے کہ نوجوان لاابالی پن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈیپارٹمنٹ میں ہم خیال دوستوں کے گروپ بن گئے تھے' وہ ایک بہت ذہین لڑکی تھی' نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی' جلد ہی اس کا شمار ڈیپارٹمنٹ کی نمایاں لڑکیوں میں ہونے لگا تھا۔ ان ہی دنوں ڈیپارٹمنٹ میں ایک نئے لڑکے کا اضافہ ہوا تھا' حماد نامی یہ لڑکا کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور اچھے قد کاٹھ کا مالک تھا' متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا' جب وہ اپنی خوب صورت اور قیمتی گاڑی میں یونیورسٹی آتا تو کئی نگاہوں کا مرکز بن جاتا تھا۔ سنا تھا کہ وہ کسی بڑے جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بظاہر بڑا مغرور اور انا پرست نظر آتا تھا' دیکھتے ہی دیکھتے لڑکیوں میں اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی تھی۔ میراب کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا' نہ جانے کیوں وہ اس سے چڑنے لگی تھی' جب بھی کسی لڑکی کے منہ سے اس کی تعریف سنتی اسے غصہ آنے لگتا۔

میراب کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ حماد کی دوستی جاذب سے گہری ہوتی گئی۔ جاذب ایک خوش شکل' خوب رو اور ذہین لڑکا تھا۔ میراب کی طرح وہ بھی ہم نصاب سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا اور اس کی ایک نمایاں خوبی اس کی شاعری تھی وہ بہت اچھا شاعر تھا' حاضر جواب' تیز و طرار اور شوخ جاذب جب جب مسکراتی آنکھوں سے میراب کو دیکھتا تو اس کا دل بے اختیار دھڑکنا بھول جاتا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیتی تھی۔ میراب نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ کبھی کوریڈور میں بیٹھے ہوئے یا کیفے ٹیریا میں

دوستوں کے ساتھ کسی بات پر قہقہہ لگاتے ہوئے اگر جاذب کا سامنا اچانک میراب سے ہوجاتا تھا تو اس کی ہنسی کو بریک لگ جایا کرتا تھا وہ کہیں گم ہوجاتا اور اس کی نظریں میراب کے سراپا میں کہیں گم ہوجایا کرتی تھیں۔ ایسے موقع پر اگر حماد بھی ساتھ ہوتا تو وہ اسے ٹہوکا دیا کرتا جاذب ایک دم جھینپ جاتا تھا۔

فطرت کے اصولوں کے تحت کئی تعلق بن رہے تھے کئی تعلق ٹوٹ رہے تھے۔ وہ بڑے پُر بہار دن تھے وہ سمسٹر سے فارغ ہوچکے تھے دوستوں میں سیل فون نمبرز اور ای میل ایڈریسز کا تبادلہ ہوچکا تھا۔ کمیونیکیشن کی آزادی نے نوجوانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے بہت سے مواقع پیدا کردیئے تھے جہاں ان ذرائع نے آسانیاں پیدا کی تھیں وہاں نت نئے مسائل بھی پیدا کیے تھے۔ یونیورسٹی میں ہفتہ طلبہ منایا جارہا تھا اور اسی سلسلے میں ایک میوزیکل پروگرام ترتیب دیا گیا تھا اسی سلسلے میں اس وقت کیفے ٹیریا میں ڈسکشن ہورہی تھی سب زور و شور سے مشورے دے رہے تھے کہ حماد آیا اور میراب کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ بے فکرے قہقہے کیفے ٹیریا کی فضا کو خوش گوار بنارہے تھے سب حماد کو میوزیکل پروگرام میں پرفارم کرنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ جاذب تو گویا اس کے گلے ہی پڑ گیا تھا کہ وہ گیت اس شرط پر لکھے گا کہ حماد اس پر پرفارم کرے گا۔ حماد نے رسی تڑوانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا اور بلآخر اسے ہار ماننی پڑی۔ وہ حماد کے مقابل پرفارم کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھی لیکن دوستوں کے اصرار پر اسے ہار ماننی پڑی تھی۔

یہ میوزیکل پروگرام بڑا کامیاب رہا تھا۔ جاذب کے لکھے ہوئے گیتوں نے تو یونیورسٹی میں دھوم مچادی تھی ہر طرف سے تعریفوں کے ڈونگرے برس رہے تھے کامیابی کی چمک جاذب کے چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ بکھیر رہی تھی پر حماد اور میراب کی پرفارمنس بھی لاجواب تھی۔ میراب کے بے پناہ حسن اور حماد کی بے مثال وجاہت نے کئی دلوں کو تسخیر کرلیا تھا۔ ہر طرف رنگ تھے خوشیاں تھیں قہقہے تھے شوخ و چنچل نوجوان لڑکے لڑکیاں ان خوشیوں کو سمیٹ رہے تھے۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد وہ خاصے تھک چکے تھے۔ حماد میراب اور جاذب کیفے ٹیریا کی طرف جارہے تھے ان کا خیال تھا کہ چائے پی کر کچھ تھکن دور کی جائے پھر گھر روانہ ہوا جائے۔ کیفے ٹیریا کی جانب جاتے ہوئے اچانک میراب نے جاذب کے لکھے ہوئے ایک خاصے رومینٹک گیت کی تعریفیں شروع کردیں کہ اچانک نہ جانے حماد کو کیا سوجھی کہ وہ میراب سے بولا۔

"تمہیں پتا ہے میراب! یہ گیت اس نے کس کے لیے لکھا تھا؟"

اس نے گھوم کے حماد کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نہیں! تم بتاؤ کس کے لیے لکھا تھا؟"

"تمہارے لیے......"

وہ ٹھٹک گئی تھی اور جاذب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی خاموش نظروں میں کئی سوال چھپے تھے۔ جاذب کے قدم تو جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے وہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا وہ حماد کی طرف مکا لہراتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ مذاق کررہا ہے پلیز تم کچھ غلط نہ سمجھنا۔" اس نے گہری سانس لے کر قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔

"اس نے خود بتایا تھا میرا یقین کرو۔" حماد ڈھٹائی سے بولا تھا اور جاذب اپنی صفائیاں پیش کرنے لگا تھا۔

"یاد رکھنا تجھے یہ مذاق مہنگا پڑے گا۔" جاذب نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے براہ راست حماد سے کہا تھا۔

"میں مذاق کررہا تھا میراب! یہ تو تمہاری دوست شہلا سے محبت کرتا ہے اسی کے لیے آہیں بھرتا ہے اور اسی کے لیے شاعری کرتا ہے ہمارا یہ شاعر۔" اس نے پھر سفید جھوٹ بولا اور شرارت سے مسکرایا تھا۔

حماد نے میراب کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"شہلا بہت خوش قسمت ہے۔" اس نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

ان ہی باتوں کے دوران وہ کیفے ٹیریا میں داخل ہوگئے تھے۔

"دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ......" حماد میراب کی طرف دیکھ کر بولا تھا کہ اچانک کیفے ٹیریا میں موجود دوستوں نے انہیں دیکھ لیا اور چاروں طرف سے گھیر لیا اور حماد کی بات ادھوری رہ گئی۔

میراب دوستوں سے باتوں میں مصروف ہوگئی اس کا سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ جاذب اور حماد رش سے نکل کر ایک خالی ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ حماد نے اپنا سامان اور سیل فون ٹیبل پر رکھا اور اس سے کہا۔

"تم چائے کا آرڈر دو میں فریش ہوکر آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد ایک شرارتی خیال جاذب کے ذہن میں بجلی بن کر کوندا اور اس نے حماد کا سیل فون اٹھایا اور ایک نظر میراب کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو دیکھا اور میراب کے نام ایک میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"اس وقت میری بات ادھوری رہ گئی تھی میں تم سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں اپنے دل کا حال تمہیں بتاسکوں میں تمہاری جانب سے جواب کا انتظار کروں گا مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کروگی اور جلد جواب دوگی تمہارا حماد......!"

حماد نے ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا وہ غالباً کسی کو فون کرنے کا ارادہ کررہا تھا۔ وہ مسلسل کن انکھیوں سے میراب کی جانب دیکھ رہا تھا جواب ایس ایم ایس پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا اس نے بے اختیار مڑ کر حماد کو دیکھا تھا جو فون پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ میراب نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں اور اٹھ کھڑی ہوئی وہ مسلسل حماد کو گھور رہی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دندناتی ہوئی ان کی ٹیبل کی طرف آئی۔ حماد اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ نے غالباً اس پر جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ جاذب کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔

میراب نے اپنا سیل فون اس کے سامنے پٹخا تھا اور بولی تھی۔

"تم نے کیا سمجھ رکھا ہے تم نے یہ کیا ایس ایم ایس مجھے بھیجا ہے۔" وہ بلند آواز سے چلائی تھی۔ حماد کا چہرہ سرخ ہوگیا اردگرد بیٹھے ہوئے تمام لوگ ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

"میں نے آپ کو کوئی ایس ایم ایس نہیں کیا۔" وہ سرد اور دھیمی آواز میں بولا تھا۔

"پڑھو اسے......" وہ غصے سے کھول رہی تھی۔

اس نے وہ ایس ایم ایس پڑھا اور دم بخود رہ گیا تھا۔

"یہ میں نے نہیں لکھا۔"

"تم نے مجھے کیا سمجھا ہے کیا اس طرح تم مجھے پھنسا لوگے۔ ان خرافات کو پڑھ کر میں تمہارے عشق میں گرفتار ہوجاؤں گی تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟"

میراب شدید غصے میں تھی اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ حماد کے منہ پر جڑ دیا۔ چاروں طرف جیسے ایک دم سناٹا چھا گیا تھا حماد بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میراب! ایک منٹ میری بات سنو۔ حماد بے قصور ہے دراصل یہ میسج......" جاذب تیزی سے اٹھتا ہوا بولا تھا لیکن ان دونوں نے اس کی بات پر کوئی دھیان

نہیں دیا تھا۔
"یہ تھپڑ تمہیں کن اندھیروں میں لے جائے گا اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔" حماد نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا تھا۔ وہ ٹیبل سے اپنا سامان اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ میراب بھی تیزی سے پلٹی اور باہر چلی گئی' جاذب اس کے پیچھے لپکا۔

"بات سنو میراب......!" وہ تیز قدموں سے اس کی جانب جاتے ہوئے بولا۔

"جہنم میں جاؤ تم بھی......" وہ پلٹ کر چلائی تھی۔

میراب کی سہیلیاں حنا اور عرشیہ اس کے پاس گئیں اور حنا تو چیخ ہی پڑی تھی۔

"میراب! تم نے اسے تھپڑ کیوں مارا' وہ یہ رسوائی برداشت نہیں کرے گا۔ تم اسے جانتی نہیں ہو' وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔" وہ خوف زدہ لہجہ میں کہہ رہی تھی۔

"کیوں نہ مارتی اس بے ہودگی پر؟" وہ اس پر برس پڑی تھی۔

"تم نے اتنے لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی کی ہے وہ اس کا بدلہ ضرور لے گا۔" عرشیہ بولی تھی۔

"تم بھی حد کرتی ہو میں خاموشی سے یہ خرافات برداشت کر لیتی۔" میراب کا پارہ اس وقت آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنی دوستوں کو بے نقط سنائی تھیں پھر وہ یونیورسٹی میں نہیں رکی تھی اور گھر آ گئی تھی راستے میں اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس پریشانی میں اس نے بالکل غور نہیں کیا کہ ایک کار نے اس کا گھر تک پیچھا کیا تھا' گھر آ کر بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا' وہ سوچ رہی تھی کہ اسے حماد اور جاذب کی بات سن لینا چاہیے تھی' نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے' حقیقت کیا تھی وہ اس سے لاعلم تھی۔ اسے اب پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اسے یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ "کل یونیورسٹی جا کر حماد سے معذرت کر لوں گی اور ان کی بات سنوں گی۔"

رات سونے سے پہلے اس فیصلہ پر وہ مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔ اگلے دن وہ حسب معمول تیار ہو کر یونیورسٹی کے لیے نکلی ہی تھی کہ یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

شام ہو گئی تھی' وہی نوجوان کھانے کی ٹرے لے کر آیا تھا۔ دوپہر کا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ اس نے پہلے سے موجود ٹرے اٹھائی اور کہا۔

"آپ نے کھانا نہیں کھایا؟"

وہ چلائی۔ "مجھے کھانا نہیں کھانا' گھر جانا ہے۔ پلیز مجھے چھوڑ دو۔" اس نے دروازے کی سمت جست لگائی۔ اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر بیڈ پر پٹخا۔

"میں عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا لیکن جو میرا کہنا نہیں مانتیں ان کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہوں۔ تمہیں وہی آزاد کرے گا جس نے تمہیں یہاں قید کرنے کا فیصلہ کیا ہے' شور شرابے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں' مجھے جو حکم دیا گیا ہے میں وہی کروں گا۔" وہ سفاکی سے بولا تھا۔ وہ دہشت زدہ سی اس کی باتیں سنتی رہی۔ پتا نہیں اس کے گھر والے اسے کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے' وہ اس کے متعلق کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ اس کا ذہن انہی سوچوں میں گم تھا۔

تیسری دفعہ کمرے کا دروازہ رات کے وقت کھلا تھا اور آنے والے کو دیکھ کر اس کا سانس رک گیا تھا۔ حماد اس کے سامنے کھڑا تھا اپنے سپاٹ اور بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہوئے

وجود کے ساتھ اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

"کوئی بات کریں میراب! کچھ تو کہیں......" اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور لہجہ میں زہر بھرا تھا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں' مجھے گھر جانے دیں' نہ جانے میرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔" اس نے حماد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میں تمہیں نہیں روکوں گا' واپس گھر بھجوا دوں گا۔ بس چند دن اور تاکہ اس بے عزتی اور رسوائی کا مزا چکھو جو تم نے اس دن میرے ساتھ کی تھی' تمہیں بھی تو پتا چلے بے عزتی کسے کہتے ہیں۔" وہ نہایت سفاکی سے بولا تھا۔

"جو کچھ میں نے کیا مجھے اس پر بہت افسوس ہے خدارا مجھے معاف کر دو۔"

"لیکن جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا اس پر مجھے کوئی افسوس نہیں۔"

وہ رو پڑی تھی۔ روتے روتے اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو اس کے بہت قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"بے فکر رہو' تمہاری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا لیکن تم کسی کو بھی اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکو گی۔ بے قصوری کی سزا کیا ہوتی ہے تمہیں اب پتا چلے گا۔" کچھ دیر بعد وہ اسے روتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔

پھر دو دن بعد صبح وہ آیا تھا اور اس کی طرف ایک پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا تھا

"اتنے دن سے تم نے کچھ نہیں کھایا' تم ناشتہ کر لو اور یہ کپڑے بدل لو' آج تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔"

اس نے جیسے تیسے چند لقمے زہر مار کیے اور لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ جس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے لایا گیا تھا' اسی طرح واپس گھر کے قریب چھوڑ کر وہ چلا گیا تھا۔



اس کے گھر میں تو ایک کہرام برپا تھا' والد اور بھائی اس کی سب دوستوں کے پاس اس کے بارے میں پوچھ آئے تھے' وہ کہیں نہیں ملی تھی۔ وہ یونیورسٹی کے بھی کئی چکر لگا آئے تھے' اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ رات ہوتے ہی سب کی حالت غیر ہو گئی تھی خاص طور پر اس کی امی کا حال تو سب سے برا تھا۔

وہ ہر ممکن جگہ پر اسے ڈھونڈ آئے تھے۔ پولیس میں رپورٹ کروانے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس سفید پوش اور عزت دار گھرانے نے یہ رات آنکھوں میں کاٹی تھی' سب ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ ماں کا تو روتے روتے برا حال تھا۔ وہ اس کی موت کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن نے پل بھر میں ان کا سر شرم سے جھکا دیا تھا' دل گرفتہ باپ کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ فکرمند تھے کہ اب دنیا کا سامنا کیسے کریں گے' لوگوں کے چبھتے ہوئے سوالات کا کیا جواب دیں گے۔ یوں لگتا تھا کہ جوان بیٹی کی موت ہو گئی ہے' میراب ان کے لیے مر چکی تھی۔

یونیورسٹی میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں' میراب کی دوستیں اس کے لیے فکرمند تھیں۔ جس دن سے میراب غائب ہوئی تھی' حماد بھی یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ اکثر ذہنوں میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ کہیں میراب کے غائب ہونے میں حماد کا تو ہاتھ نہیں لیکن کوئی بھی کھل کر اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ جاذب خود کو مجرم سمجھ رہا تھا' اس نے ہر ممکن جگہ پر خود بھی میراب کو تلاش کیا تھا' حماد سے بھی رابطے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے رابطہ نہیں

ہوسکا تھا وہ اس کے آبائی گھر بھی ہو آیا تھا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ ایک چھوٹی سی شرارت کی اتنی بڑی سزا کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بے حد دل گرفتہ اور اداس تھا یونیورسٹی میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کردیا تھا۔

میراب کو غائب ہوئے تیسرا دن تھا کہ میراب کی دوست حنا نے اسے فون کرکے بتایا کہ رات میراب کی امی کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکیں اور انتقال کرگئی تھیں۔ جاذب کو خود سے نفرت ہونے لگی تھی وہ خود کو ان کا قاتل محسوس کررہا تھا۔ اس روز وہ دیر تک رویا تھا اور خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا تھا اس کے علاوہ میراب کی خیر و عافیت کی دعائیں بھی مانگتا رہا تھا۔ اس نے ایسا جرم کیا تھا جس کی سزا اب اسے زندگی بھر بھگتنی تھی۔ پل بھر میں ہنستی کھیلتی زندگی آنسوؤں کے دریا میں ڈوب گئی تھی۔

نوجوان اکثر اپنی بظاہر بے ضرر نظر آنے والی شرارتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن یہی بے ضرر اور معمولی شرارتیں بعض اوقات کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ جو ان کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتی ہیں ان کی زندگی میں ایسے ایسے مدوجزر پیدا ہوتے ہیں کہ سب کچھ خاک میں مل جایا کرتا ہے۔

گھر کا گیٹ بند تھا وہ کچھ دیر خاموشی سے گیٹ کے پاس کھڑی رہی گھر میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ بیل بجاتی اور گھر والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دیتی وہ گیٹ کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی آنسو اس کے گال بھگوتے رہے وہ جیسے ان سے بالکل بے خبر تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ کھڑی ہوگئی اس کی آنکھوں سے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔

"کیوں آئی ہو یہاں......؟" ابو کا سوال اس کی سماعت سے کسی بم کی طرح ٹکرایا تھا "ابو" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ "چلی جاؤ یہاں سے......تمہارا کوئی نہیں تم ہم سب کے لیے مرچکی ہو جہاں اب تک رہیں وہیں باقی زندگی بھی گزارو۔" انہوں نے دبی ہوئی لیکن تلخ آواز میں کہا تھا۔

"ابو میرا کوئی قصور نہیں مجھے اغواء......"

"تم ہمارے لیے مرچکی ہو تمہاری ماں تو سچ مچ مرگئی ہے ہم بھی جیتے جی مرگئے ہیں۔ چلی جاؤ خدا کے لیے چلی جاؤ اگر تمہارے بھائیوں کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں جان سے مار ڈالیں گے اور خود پھانسی پر چڑھ جائیں گے یہاں سے دفع ہوجاؤ۔" انہوں نے اسے دھکا دیتے ہوئے بہت زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

"پلیز ابو مجھ پر رحم کھائیں میری کوئی غلطی نہیں ہے میں کہاں جاؤں گی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ لیکن ان پر اس کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"یہ اس وقت سوچنا تھا جب گھر سے گئی تھیں ہمیں تماشا بناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ تمہارے جانے کے بعد ہم سے کیسے کیسے سوال پوچھیں گے تم نے ہم پر رحم نہیں کھایا۔ ہمیں معاف کردو اور یہاں سے چلی جاؤ۔" اب کے انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے پھر واپس پلٹ کر گھر کے اندر چلے گئے اور گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ "دوبارہ یہاں نہ آنا اب ہم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔" وہ سکتے کے عالم میں بند دروازے کو دیکھتی رہی تھی۔ یہ سب اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ یہ تو اسے پتا تھا کہ اسے گھر والوں کے غصے اور نفرت کا سامنا کرنا پڑے گا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر گھر کے دروازے اس پر بند

کردیں گے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اب کہاں جائے گی پھر اس نے باری باری اپنے سب رشتے داروں کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے۔ ایک ہی دن میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ وہ جہاں جہاں گئی اسے پناہ نہیں ملی وہ سہیلیاں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں اب اسے پہچاننے کے لیے بھی تیار نہیں تھیں۔ اس کے آنسو خشک ہوچکے تھے وہ بے مقصد سڑکوں پر چلتی گئی۔ اب اس شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جس سے مدد کی امید کی جاسکتی۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں سڑک پر چلی جارہی تھی کہ اچانک اس کے ذہن میں اپنی ایک کزن صدف کا خیال آیا۔ صدف نے اپنی پسند سے شادی کی تھی خاندان والے اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ لہٰذا سب نے اس سے قطع تعلق کرلیا تھا وہ ان دنوں اسلام آباد میں رہائش پذیر تھی اور اپنے شوہر سکندر کے ساتھ خوش گوار زندگی بسر کررہی تھی۔ میراب سے ان کی دوستی بچپن ہی سے تھی۔ میراب اسے اکثر فون کرتی رہتی تھی ان دونوں کا رابطہ فون کے ذریعے قائم تھا۔ ایک خیال کے تحت میراب نے پی سی او سے اسے فون کردیا اور اپنے موجودہ حالات اسے کہہ سنائے اور اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ وہ یہ سب سن کر رو پڑی تھی اور میراب سے کہا تھا کہ وہ فوراً اس کے پاس چلی آئے۔ میراب نے سکون کی سانس لی اور اسٹیشن کی طرف چل دی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

اس قصے کو تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا حماد نے دوبارہ یونیورسٹی کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اپنی زمینوں اور جاگیر کے انتظامات میں مصروف ہوگیا تھا اور میراب کو تقریباً بھول چکا تھا۔ اس ظلم کو بھول چکا تھا جو اس نے ایک بے قصور لڑکی پر ڈھایا تھا لیکن وہ نہیں بھولا تھا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے انصاف کی گھڑی آچکی تھی۔

حماد کے ایک پلاٹ پر کافی عرصے سے ان کے مخالفین نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ وہ اپنی زمین کو واگزار کروانے کے لیے مسلح افراد کو ساتھ لے کر اس دن زمین پر گیا تو مخالفین نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ دوطرفہ فائرنگ کے نتیجے میں دونوں طرف کے کئی افراد زخمی ہوئے تھے۔ اچانک مخالفین کی طرف سے آئی ہوئی ایک گولی حماد کی کمر پر لگ گئی تھی۔ اسے فوری طور پر قریبی اسپتال لے جایا گیا تھا۔ جہاں اس کی جان تو بچالی گئی تھی اور ایک آپریشن کے بعد گولی بھی نکال دی گئی تھی لیکن اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ خیال سچ ثابت ہوا تھا کہ حماد کا نچلا دھڑ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہوگیا تھا۔ اب تمام زندگی اسے وہیل چیئر پر گزارنی تھی یوں حماد جواں عمری میں معذور ہوگیا تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

ادھر جاذب نے بھی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اس کا دل پھر یونیورسٹی میں نہیں لگا تھا۔ اس کی زندگی میں سب کچھ تھا لیکن دل میں ایک خلش باقی تھی ایک احساس جرم تھا جو دل کی گہرائیوں میں پنہاں تھا۔ دل میں چھپی ہوئی یہ پھانس اسے بے کل رکھتی تھی۔ اس کے دل کی خلش اس کے رویے سے بھی ظاہر ہوتی تھی وہ ہر وقت کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ اس کے دل کی تڑپ اسے بے حال رکھتی تھی۔ اس کی زندگی سے حقیقی خوشی کا عنصر غائب ہوگیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اس کے اندر بے حسی کی چادر تان کر سویا ہوا غم ایک انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا تھا۔ اس کے خون میں شامل ہونے لگا۔ اس کی رگوں میں آگ جگانے لگا تھا اور اس کا دل و دماغ اس آگ کی حدت

سے روشن ہوگیا تھا اور یہ روشنی روشنائی بن کر اس کے قلم میں اتر آئی تھی۔ اس نے اپنے بے پایاں ہیجان کو قلم کے سہارے صفحہ قرطاس پر بکھیرنا شروع کردیا۔ یہ ہیجان قرطاس پر آیا تو خوب صورتی بن گیا۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ نے الفاظ کا روپ دھارا تو نظم بن گئی' غزل بن گئی۔ اس نے اپنے روحانی کرب کو آزادی سے بیان کیا۔ اس تخلیقی عمل کے دوران وہ اپنے گردوپیش سے قطعی بے گانہ ہوجاتا تھا۔ نہ سونے جاگنے میں ترتیب رہی' نہ کھانے پینے کا ہوش رہا۔ بس وہ تھا اور اس کے غم خوار الفاظ تھے۔ رات کی تاریکی میں آنسو بہاتے ہوئے وہ محسوس کرتا جیسے اس کی طرح اس کے گھر کے درودیوار بھی اداس ہیں اور وہ بہ زبانِ خاموشی اس سے سوال کرتے ہیں کہ تمہیں وہ جلاد لمحہ یاد ہے جس نے اس نوخیز محبت کو قتل کردیا تھا؟

ان دنوں اس نے بہت اچھی چیزیں لکھی تھیں' اس کے ایک ادب نواز دوست کو اس کی لکھی ہوئی ایک نظم بہت پسند آئی وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور ایک رسالے میں شائع کروادی۔ اس نظم میں وہ غم شامل تھا جو کوہِ ہمالیہ سے بھی گراں تھا۔ اس رات اس کے قلم نے اس کاغذ نے اس غم کو جھیلا تھا اور ان لفظوں نے اسے امر کردیا تھا۔ یہ نظم ایک سنگیت نامی میوزیکل بینڈ کو بہت پسند آئی تھی۔ اس میوزیکل بینڈ نے تھوڑے ہی عرصے میں کافی نام کمایا تھا اور بیرونِ ملک بھی کامیاب کنسرٹس کیے تھے۔ انہی دنوں انہوں نے اسے خط لکھا کہ وہ عنقریب اپنا نیا البم لانے والے ہیں اور وہ اس کے لیے گانے لکھے' اسے یہ سب عجیب لگا تھا لیکن ان لوگوں نے اتنے خلوص کے ساتھ اصرار کیا کہ وہ انہیں انکار نہ کرسکا تھا۔

ان دنوں اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزرتا تھا' اس کے چاروں طرف کتابیں بکھری رہتی تھیں۔ نہ کھانے پینے کا ہوش' نہ سونے جاگنے کا۔ شاعری ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بال بڑھالیے تھے' چھوٹی سی داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ لباس کی طرف سے بھی بے پروا ہوگیا تھا۔ اہل خانہ اور خاص طور سے اس کے والد اس کے اس رویے سے بڑے نالاں تھے۔ ہر نشست میں وہ اسے طویل لیکچر دیتے تھے۔ وہ یہی کہا کرتے تھے۔

''کمرہ چھوڑو' کھلی ہوا میں بیٹھا کرو' شاعری پر ہاتھ ہلکا رکھو اور اپنے کاروبار پر توجہ دو۔'' وہ جتنے صبر و تحمل سے ان کی باتیں سنتا' اتنی ہی مستقل مزاجی سے اپنے معمولات پر بھی ڈٹا رہتا تھا۔ آخر اس کے والد صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس کا ذہن تبدیل کرنے کے لیے اس کا ماحول بدل دیا جائے۔

اسلام آباد میں کافی عرصے سے انہوں نے ایک پلاٹ لے رکھا تھا' وہاں ان کا کوئی کوٹھی بنانے کا ارادہ تھا یہ ارادہ کئی بار بن کر ٹوٹا تھا' والد صاحب نے بہتر سمجھا کہ اس بہانے ان کا دیرینہ خواب بھی پورا ہوجائے۔ تعمیر کا کام اس کے والد نے ایک قابل اعتماد ٹھیکے دار کو سونپ رکھا تھا بہرحال کسی اپنے آدمی کا موقع پر موجود ہونا ضروری تھا۔ یوں تو وہاں جاذب کا کزن سکندر بھی رہتا تھا مگر وہ اپنی مصروفیات میں سے اتنا وقت نہیں نکال پاتا تھا کہ اخراجات کا حساب کتاب رکھ سکے یا تعمیر کے سلسلے میں چھوٹے موٹے فیصلے کرسکے۔ یہی وجہ تھی کہ اپریل کے اس خوش گوار موسم میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر وہ اسلام آباد پہنچا تو رہائش کے سلسلے میں بھی اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سکندر کا گھر موجود تھا' عام حالات میں شاید اسلام آباد آنے کے حوالے سے وہ والد صاحب کی بات ٹال جاتا لیکن یہ عام حالات نہیں تھے اس کے اندر زبردست ٹوٹ پھوٹ جاری تھی اور اس ٹوٹ

پھوٹ کے نتیجے میں اس کی شاعری کو توانائی مل رہی تھی۔ تخلیق کا موسم جوبن پر تھا۔ ایسے موسم میں اسلام آباد کی پُرسکون فضا ان کے لیے معاون ثابت ہوسکتی تھی۔

سکندر کی رہائش گاہ ان کے پلاٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ سڑک کے کنارے ان کی کوٹھی بڑی پُرسکون اور دل نواز جگہ پر تھی۔ وہ کال بیل کا بٹن دبانے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا' اس کے سامنے سکندر کھڑا تھا' اس نے بڑی گرم جوشی سے جاذب کو گلے سے لگایا اور ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ یہاں سرخ قالین بچھا تھا۔ ایک جانب شیشے کی دیوار تھی' اس دیوار کی دوسری طرف سرسبز وادی نظر آرہی تھی۔ سکندر نے صدف کو آواز دی۔

''دیکھو کون آیا ہے؟'' اس نے پُرمسرت لہجے میں صدف کو پکارا تھا۔

ان دونوں نے محبت کی شادی کی تھی یہ شادی صدف کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی جب کہ سکندر کے خاندان والوں نے صدف کو بڑی خوش دلی سے قبول کرلیا تھا۔ اس نے بھی بڑی خوش دلی سے جاذب کو خوش آمدید کہا تھا۔ ابھی وہ باتیں کرہی رہے تھے کہ ''کہاں ہیں آپ لوگ؟'' ایک نسوانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی اونچی ایڑھی کی ٹھک ٹھک گونجی۔

پھر ایک دم جاذب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یوں لگا جیسے وہ کئی برس تک ایک کال کوٹھری میں بند رہنے کے بعد اچانک چلچلاتی دھوپ میں آگیا ہو۔ اردگرد کی ہر شے اسے رقصاں نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے میراب کھڑی تھی اس کے چمکیلے سراپا پر نگاہ جم نہیں پارہی تھی۔ سادہ لیکن خوب صورت لباس' ہلکا سا میک اپ اور شانوں پر ریشمی زلفوں کے سائے میں وہ لڑکی نہیں ایک سرسراتی ہوئی ہفت رنگ شام لگ رہی تھی جو فرطِ شوق میں دن ہی میں چلی آئی تھی۔

وہ میراب کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا تو وہ بھی اسے دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔ یہ ری ایکشن ایسا نہیں تھا کہ ان دونوں کی نظروں سے اوجھل رہتا۔ صدف مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں؟''

''ج...... جی ہاں......!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

اسی دوران وہ بھی شاک کے اثر سے نکل آئی تھی۔ وہ چند لمحہ تذبذب میں رہی پھر اپنا آنچل درست کرتے ہوئے اندر آگئی اور سلام کیا۔

جاذب نے کھڑے ہوکر اس کے سلام کا جواب دیا' وقت کی گردش گویا تھم گئی تھی اس کے قدم گویا زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھا' سکندر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے آپ دونوں کا تعارف کروانا چاہیے۔''

میراب اب خود کو سنبھال چکی تھی' صدف نے سکندر کی بات کاٹی اور بولی۔

''یہ میری کزن میراب ہیں' جو میرے پاس رہنے آئی ہوئی ہیں۔''

''اور یہ میرے کزن جاذب ہیں' جو میرے پاس رہنے آئے ہیں۔'' سکندر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''اب آپ بتائیے کہ آپ لوگ کیسے ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' صدف نے شرارت سے ہنستے ہوئے جاذب سے پوچھا۔

''کیا ساری باتیں ابھی پوچھ لیں گی؟'' اس نے بھی خوش دلی سے جواب دیا تھا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کراچی سے اتنی دور یوں اچانک اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ صدف کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ اور سکندر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے تھے۔ سکندر بڑا خوش گفتار تھا۔ وہ بات سے بات نکالنے کا ہنر جانتا تھا اور ہر موضوع پر بے تکان بولتا تھا۔

اسی دوران صدف چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آ گئی۔ سکندر مسکرا کر بولا۔

”میرا خیال تھا کہ مجھے آپ دونوں کو متعارف کروانا پڑے گا لیکن یوں لگ رہا ہے کہ خود میرا تعارف کرائے جانے کی ضرورت ہے۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے میراب کی طرف دیکھا۔ میراب جو خود کو سنبھال چکی تھی، ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔

”یہ میرے کلاس فیلو تھے۔“

”میراب اکثر آپ کا ذکر کرتی رہتی تھی، آپ یونیورسٹی کے زمانے میں شاعری واعری کیا کرتے تھے نا۔“ صدف نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاعری کیا کرنی ہے جی بس......“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اپنی شاعری اور میراب کے ذکر پر اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے اپنے تاثرات کو بمشکل چھپاتے ہوئے کہا۔ ”بڑی خوشی ہوئی یہ سن کے۔“ اس نے چور نظروں سے میراب کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اضطراب کے عالم میں اپنے کنگن کو کلائی میں گھما رہی تھی پھر بات مکان کی تعمیر کی طرف مڑ گئی۔

سب کچھ آپ ہی آپ ہوتا چلا گیا تھا، اسلام آباد کی خوب صورت فضاؤں میں نہ صرف میراب سے اس کی ملاقات ہوئی تھی بلکہ اس کے ساتھ رہنے کے اسباب بھی پیدا ہو گئے تھے۔ صبح سے شام تک سکندر آفس میں ہوتا تھا جب کہ وہ میراب اور صدف گھر میں ہوتے تھے۔ صدف اس سے بہت جلد بے تکلف ہو گئی تھی اور اس نے میراب پر گزرنے والے تمام واقعات اسے سنائے تھے جنہیں سن کر اس کا دل تڑپ اٹھا تھا، وہ خود کو اس کا گناہ گار محسوس کر رہا تھا۔ میراب سے کبھی کبھی اس کا سامنا ہو جاتا تھا۔ ان کی گفتگو رسمی سلام دعا سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ ایک جھجک سی تھی۔ وہ میراب کی نگاہوں میں گزرے دنوں کی پرچھائیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تھا لیکن قطعی ناکامی ہوتی تھی۔ وہ بڑی خوب صورت نظر آتی تھی، ایک عجیب سا نکھار آ گیا تھا اس کے سراپا میں۔ اچھے لباس کے انتخاب نے اس کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر جاذب کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی، وہ جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اسے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ بس میراب کو دیکھتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا تھا۔

اس دن وہ اسٹڈی میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا یہ میراب کی آواز تھی، اس نے ”سنیے“ کہہ کر اسے مخاطب کیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی اور آنکھوں میں سرد مہری جھلک رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ جاذب نے پوچھا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں؟“

”کیا مطلب؟“

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ اس نے منہ پھیر لیا اور فرش کو گھورنے لگی تھی۔

اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم سے اس طرح یہاں ملاقات ہو جائے گی، میں تو اپنے کام سے یہاں

آیا تھا لیکن تم چاہتی ہو کہ میں چلا جاؤں گا، تو چلا جاؤں گا۔“ وہ غصہ سے بولا تھا۔

وہ بھونچکی نظر آنے لگی شاید اس سے اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ جاذب نے اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا اور لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل آیا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوری طور پر یہاں سے چلا جائے۔ میراب نے جس بے رخی سے بات کی تھی، اس نے جاذب کے دل پر گہری چوٹ لگائی تھی۔ اس کا دل غم و غصہ سے لبریز ہو گیا تھا لیکن اگلے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ اپنے بیڈروم میں بستر پر نیم دراز تھا کہ وہ چلی آئی۔

”مجھے بہت افسوس ہے جاذب! نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ یہ آپ کے کزن کا گھر ہے، مجھے آپ کو یہاں سے جانے کے لیے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں معافی چاہتی ہوں۔“

وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میراب نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا بلکہ اسے تو بہت کچھ کہنا چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی، چائے کے دوران وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے درمیان جیسے یہ خاموش معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ماضی کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ کسی تلخ یا شیریں بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہو گا لیکن ایسے احساسات بند باندھنے سے کب رکتے ہیں، وہ تو گفتگو میں چھلکتے ہیں اور آنکھوں سے چھلکتے ہیں، ان کے ساتھ بھی ایسا ہو رہا تھا۔

جاذب کے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی کچھ کرنے کو دل نہ چاہتا تھا، وہ باہر نکل جاتا اور بے مقصد بے سمت گھومتا رہتا تھا۔ اس کا رواں رواں میراب کا نام الاپتا تھا، وہ اسے چھونا چاہتا تھا، اسے حاصل کرنا چاہتا تھا اپنے دل پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ میراب کا حسین سراپا بجلی بن کر اس کی نگاہوں میں کوندتا تھا۔

وہ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ سہ پہر سے بادل گھر کر آئے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی کہ اسے میراب کی جھلک نظر آئی وہ ہلکے نیلے لباس میں تھی، بال ڈھیلے ڈھالے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے، معلوم نہیں وہ پہلے ہی ایسی پُرکشش تھی یا اب لگنے لگی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسی لچک دار شاخ کا تصور ذہن میں آتا تھا جو رسیلے پھلوں سے لدی ہوئی ہو۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لی تھیں۔ اسے میراب سے ملے ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا لیکن جس قسم کے جذبات وہ اب محسوس کر رہا تھا پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔

ملازمہ نے آ کر اس سے چائے کا پوچھا تو اس نے دریافت کیا کہ میراب کہاں ہے؟ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو جاذب نے کہا کہ چائے وہیں لے آئے اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میراب کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ کھڑکی کے باہر رم جھم بارش ہو رہی تھی، ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ رم جھم کے دوران میراب کے ساتھ چائے پینا اور باتیں کرنا اس کے لیے بڑا دل گداز تجربہ تھا۔ سامنے میلوں تک پھیلا ہوا سبزہ زار اور بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان تھا۔

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں ٹھہرے ہوئے لہجے کے ساتھ میراب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”میراب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وقت لوٹ آئے؟“

وہ لرز گئی مگر سنبھل کر بولی۔ ”وقت کب لوٹتا ہے۔“

”میں اپنے اور تمہارے وقت کی باتیں کر رہا ہوں۔“ اس نے عجیب بے باکی سے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک بار پھر وہیں جا کھڑے ہوں

جہاں سے بچھڑے تھے۔"

"نہیں!" رومانیت ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی وہ سخت اور سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں' تم پر جو بیتی ہے مجھے معلوم ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بلکہ قصوروار تو میں ہوں اور میں اس کی بہت سزا بھگت چکا ہوں' پلیز مجھے معاف کردو۔" پھر اس نے بلاکم وکاست پچھلے تمام واقعات اس کے گوش گزار کردیئے۔ وہ ناقابل بیان حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"آپ چلے جائیں یہاں سے۔" وہ لال بھبوکا ہورہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور میراب کو شانوں سے تھامتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"میرلب! میری بات سنو۔" اس کے تھامتے ہی میراب کا بدن جھرجھرا گیا۔ بے اختیار ہوکر اس نے جاذب کو پیچھے ہٹادیا۔

"میں نے کہا آپ چلے جائیں' پلیز یہاں سے چلے جائیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اس نے پھر اسے تھامنے کی کوشش کی لیکن میراب نے ہیجانی انداز میں دوبارہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور اس زور سے اسے پیچھے دھکیلا کہ بے خیالی میں کھڑا جاذب اس انداز سے قریب ہی پڑی میز سے ٹکرایا کہ میز کا کونا اس کے پیٹ میں دھنس گیا اور ایک دم ہی در و دیوار جاذب کی نظروں میں گھوم کر رہ گئے۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں اور پیٹ میں درد کی ناقابل بیان ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ فرش پر گرتا چلا گیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ میراب کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں صدف کو پکار رہی تھی۔

وہ جاذب کے پاس پہنچی اور اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بے حد تکلیف کے باوجود اٹھنے کی کوشش کررہا تھا' اس کے کانوں میں دھماکے ہورہے تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا' صرف یہ محسوس ہورہا تھا کہ میراب گھبرائے ہوئے انداز میں کچھ بول رہی تھی' اس کے چہرے پر معذرت تھی پھر شاید اس نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی تھی لیکن جاذب نے میراب کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور شیشے کا گلاس دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوگیا تھا۔ پیٹ میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھی تھیں اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ کراچی کے ایک اسپتال میں تھا۔ دو ڈاکٹرز اس پر جھکے ہوئے تھے' وہ اس کے پیٹ پر بندھی پٹیاں کھول رہے تھے۔ سکندر اسے خاص تشویشناک حالت میں کراچی لے آیا تھا۔ یہاں اسپتال میں اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا تھا' اس کی آنت کے ایک حصے کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ آپریشن کامیاب رہا تھا' اس کے بازو سے ڈرپ منسلک تھی اور منہ میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی' بے ہوش ہونے سے پہلے کے تمام واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ میراب کا معصوم چہرہ اس کے تصور میں کوندا اور نگاہوں میں انگارے سے دہک اٹھے۔

دو ہفتے کے اندر ہی وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا اور تقریباً تین چار ماہ میں وہ نارمل ہوگیا تھا۔ مکان کی تعمیر کا کام ٹھیکیدار کے حوالے کردیا گیا تھا۔ اس دوران میراب کے کئی فون آئے تھے' لیکن اس نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ وہ صحت یاب ہوگیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں خوشی اس سے روٹھ گئی تھی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کرلیا تھا اور قلم و قرطاس میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے خیالات میں زبردست روانی آگئی تھی' اس نے بڑی خوب صورت نظمیں لکھی تھیں اور محبت کے آفاقی جذبے کو بڑی خوب صورتی سے سمیٹا تھا' وہ جذبے جو ظاہر نہ ہوسکیں تو کبھی مرتے نہیں' اس امید کی روداد تھی جو آخری سانس تک کسی انہونی کی منتظر ہوتی ہے۔

وہ ایک ایسی ہی اداس شام تھی' وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز تھا اور اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر خزاں رسیدہ درختوں پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"السلام علیکم!"

وہ اتنا حیرت زدہ ہوا کہ سلام کا جواب بھی نہ دے سکا۔

میراب شرمندہ سی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ سادہ لباس میں تھی' بالوں کی ایک طویل لٹ اس کے رخسار کو چھو رہی تھی۔

"کیا حال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" جاذب نے مختصر جواب دیا۔

چند لمحے ایک گمبھیر خاموشی کمرے میں طاری رہی پھر اس کی آواز جاذب کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ایسا کیوں کررہے ہیں آپ؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"مجھ سے بات کیوں نہیں کررہے؟ اتنے فون کیے ہیں آپ کو۔" اس کے لہجہ میں شکوہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

"کیوں سزا دے رہے ہیں؟"

"میں خود کو سزا دے رہا ہوں۔"

"کس جرم میں' کیا کیا ہے آپ نے؟"

"بہت بڑا جرم! میرا گناہ تو بہت بڑا ہے' تم نے مجھے دھکا دے کر تو رعایت کی تھی' میں تو اس قابل تھا کہ مجھے ماردیا جائے۔"

وہ ایک دم آبدیدہ ہوگئی۔

"جاذب! وہ سب کچھ اچانک ہوگیا تھا' خدا گواہ ہے آپ کو کیا پتا میں کتنا پچھتائی ہوں' کتنا روئی ہوں آپ کی تکلیف پر۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی جان دے کر آپ کی تکلیف کا مداوا کردیتی۔" وہ جاذب کے قریب آبیٹھی تھی اور اس کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

وہ بڑا ڈرامائی لمحہ تھا۔ وہ اس کی طرف جھک آئی تھی' ایک جانی پہچانی مہک نے جاذب کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اسے اپنا ہوش نہ رہا' ایک میکانیکی حرکت کے تحت اس نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس کے سینے سے جالگی تھی۔ وہ ہوشربا گھڑیاں تھیں کچھ دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا تھا' ایک مہربان گداز تھا جو اس کے زخم زخم جسم کو مرہم بن کر چھو رہا تھا ایک خوش بو تھی جو اس کے رگ جاں میں اتر رہی تھی۔ اس نے ہلکی سی مزاحمت کی تھی یا شاید نہیں کی تھی' پھر وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی' اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں میں ستارے بن کر چمک رہے تھے۔

جاذب نے اپنے سابقہ قصور کی اس سے معافی مانگی تھی اور تسلیم کیا تھا کہ اب تک میراب کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ ساری سچائی اور سارا خلوص جو جاذب کے دل میں تھا جو اس نے اپنے لہجے میں سمو کر کہا۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اپنی باقی ماندہ زندگی کی ہر خوشی اور غم تمہارے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔" وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آنسوؤں نے اس کے گلے میں پھندہ سا لگا دیا تھا۔ وہ ان کی زندگی کی ایک حسین شام تھی ریشم کے ایک بہت بڑے ڈھیر کی طرح وہ اور میراب اس ڈھیر میں ڈوب رہے تھے۔



زیاگان

محترم عمران بھائی!
السّلام علیکم و رحمة اللہ
قرآن کی ایک آیت کو حوالہ بنا کر ایک اور اسٹوری لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ اس کا موضوع بھی توبہ و استغفار ہے۔ انسان گناہ کرتا ہے جب وہ اللہ کی حدود کو توڑ دیتا ہے لیکن بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی انجانے میں گناہ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کے اندر اللہ کا خوف اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ بے چین و بے قرار اور شدید ندامت کا شکار رہتا ہے اور جب وہ اللہ کے دربار میں اپنا سر ندامت سے جھکا کر معافی کا طلب گار ہوتا ہے تو اللہ جو غفور الرحیم ہے اس کے گناہ معاف فرما کر اپنے دامن رحمت میں پناہ دے دیتا ہے۔ میری اس کہانی کا موضوع بھی یہی ہے۔ اللہ ہم سب کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین

والسّلام
شہنی ارشاد
کراچی

میرا نام راحیل ہے' میں نے سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور خوش قسمتی یا میرے والد کے سورسز جو ایک گورنمنٹ ادارہ میں اونچی پوسٹ پر تھے' مجھے بھی گورنمنٹ کی جاب مل گئی۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں' اس لیے جیسے ہی میری جاب لگی امی کو میری شادی کی فکر ہوئی اور پھر وہ دنیائے زمین پر موجود حسین سے حسین تر لڑکی کی تلاش میں مصروف ہو گئیں۔

امی کی تلاش حرا پر آ کر ختم ہوئی' حرا واقعی بہت حسین و جمیل تھی' میں اسے پا کر بے حد خوش اور مطمئن تھا' وہ بھی دل و جان سے مجھے چاہنے لگی۔

نہ روپے پیسے کی کمی تھی نہ اور کوئی مسئلہ تھا۔ حرا کے ساتھ خوشی اور مسرتوں کے دن و رات بتاتے ہوئے پورے چھ سال بیت گئے' ان چھ سالوں میں اللہ پاک نے مجھے بھی بیٹے کا باپ بنا دیا تھا' حیرت کی بات یہ تھی کہ میں بھی اکلوتا تھا اور ان چھ سالوں میں میرے ہاں بھی صرف ایک ہی بیٹا پیدا ہوا حالاں کہ ہماری خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک بیٹی بھی دے دے تا کہ ہماری فیملی مکمل ہو جائے لیکن اللہ کی مرضی تھی' ہم چاہ کر بھی اللہ کے فیصلوں سے لڑ نہیں سکتے تھے' جب کہ امی اور ابو چاہتے تھے کہ ان چھ سالوں میں ہمارے کم از کم چھ بچے تو ہو جائیں' وہ بارہا دبی دبی زبان میں کہتی رہتیں۔

"بھئی اب تم لوگ فیملی پلاننگ ختم کر دو' دیکھو سہیل چار سال کا ہو گیا ہے۔"

اور حرا ایک حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

"امی آپ دعا کریں' ہماری طرف سے تو ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔" ان ہی دنوں ہمارے محکمے کو ایک اوور ہیڈ برج بنانے کا آرڈر ملا۔ میں چوں کہ سول انجینئر تھا' اس لیے یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔

مجھے لازمی طور پر اس جگہ جانا تھا جہاں پل بن رہا تھا' یہ پل ایک نہر کے اوپر بن رہا تھا' اس گاؤں میں ایک فیکٹری تھی جہاں سے ترسیل کے لیے آمد و رفت میں دریا کی وجہ سے شہر تک آنے میں کافی دشواریاں اٹھانی پڑتی تھیں اور طویل راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔

اس گاؤں جس کا نام میں تبدیل کر کے لکھ رہا

ہوں' دریا آباد تھا۔ مجھے کافی دنوں بلکہ مہینوں تک رہنا تھا' ظاہر ہے پل کی تکمیل میں کافی عرصہ لگ سکتا تھا' لیکن میرے لیے آسانی یہ تھی کہ اس پروجیکٹ پر ہم دو سے تین انجینئرز کام کر رہے تھے' ایک بندہ سائٹ پر' باقی دو آفس ورک پر تھے' سب سے پہلے سائٹ پر جانے کی میری باری تھی' ہمیں ایک ایک ماہ کے لیے دریا آباد جانا تھا۔

میرے ایک مہینے تک دریا آباد جانے کا سن کر حرا پریشان ہو گئی' اس کی حسین آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور اس نے میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"راحیل! اتنا جان لیں کہ آپ میری راتوں کی نیندیں ساتھ لے جا رہے ہیں کیوں کہ جب تک میں آپ کی بانہوں کے تکیے پر سر نہ رکھوں مجھے نیند نہیں آتی۔"

"روزی کا معاملہ ہے میری جان! ورنہ میں بھی تمہارے بغیر نہیں سو سکوں گا اور ویسے بھی تمہارے پاس تو ہمارا بیٹا سہیل ہے' تم اس کے ساتھ اپنا دل بہلا لو گی۔ میں کیا کروں گا۔" میں نے اس کی ریشمی زلفوں کو چومتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

میں اپنا مختصر سا سامان اور حرا اور سہیل کی بہت سی خوش گوار یادوں کے ساتھ دریا آباد آ گیا۔ سائٹ پر مجھ سے پہلے بہت سے مزدور اور دوسرا عملہ پہنچ چکا تھا۔ دریا آباد میں میری رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا سا مکان دیا گیا تھا اور کام کاج کے لیے ایک میاں بیوی ملازم بھی دیئے گئے تھے' جو رات تک سارا کام سمیٹ کر اپنے گھر چلے جاتے تھے اور دوسری صبح پھر آ جاتے تھے۔

میں بس سے اتر کر ہاتھ میں اپنا بیگ اٹھائے صفدر کا انتظار کرنے لگا' اس نے مجھے یہاں لینے کے لیے آنا تھا' مختصر سے انتظار کے بعد صفدر وہاں پہنچ گیا۔

"شکر ہے یار! تم آ گئے ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اپنا یہ بیگ اٹھا کر پیدل مارچ کرنا پڑے گا اور کسی سے پتا پوچھنا پڑے گا۔" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوری سر! تھوڑی دیر ہو گئی' دراصل میری گھر والی کی طبیعت تھوڑی خراب تھی' بس اسی وجہ سے......" اس نے جھینپ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں یار! گھر والوں کا خیال پہلے کرنا چاہیے' دوسرے کام تو ہوتے رہتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس پڑا۔

صفدر دریا آباد ہی کا رہنے والا پڑھا لکھا ایک جوان آدمی تھا' وہاں کا بہت سا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا' اسی نے میرے گھر اور ملازم کا انتظام بھی کیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن مجھے کوئی سواری دکھائی نہیں دی تو اس نے کہا۔

"سر یہاں سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے' موسم بھی اچھا ہے' پیدل ہی چلتے ہیں۔ ساتھ ہی میں آپ کو گاؤں کی سیر بھی کرا دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے میرا بیگ ہاتھ میں اٹھا لیا اور ہم پیدل چل دیئے۔

راستے میں ہرے بھرے کھیت آنکھوں کو بہت اچھے لگ رہے تھے' طبیعت میں فرحت کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ کھیتوں کے حصے سے باہر آئے تو کہیں کہیں اِکا دُکا مکانات بنے دکھائی دینے لگے پھر اچانک ہی میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک جوان لڑکی ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے چند جوان لڑکوں کی پٹائی لگا رہی ہے' ساتھ ساتھ وہ انہیں بُرا بھلا کہہ رہی تھی دو چار گالیاں بھی دے رہی تھی۔

مجھے یہ منظر بڑا عجیب لگا تو میں چلتے چلتے رک گیا اور اسے دیکھنے لگا' صفدر نے مجھے رکتے ہوئے

دیکھا تو بولا۔

"یہ راجی ہے' بڑی نڈر اور بے باک ہے اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ تنہا رہتی ہے پہلے بچی تھی تو میرے تیرے گھر سے کھا پی لیتی تھی لیکن جب سے جوان ہوئی ہے اپنے گھر میں رہتی ہے' کبھی کسی کے گھر کا کوئی کام کر دیا اور وہاں سے اناج اور کپڑا لے لیا۔ جوان اور تنہا دیکھ کر اگر کوئی مرد یا لڑکے اس پر بری نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ اسی طرح انہیں مارتی پیٹتی ہے بخشتی کسی کو بھی نہیں۔ چاہے کوئی بھی ہو' اچھا ہے ایسا کرتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے' ورنہ آج کل تو دور ایسا ہے کہ جہاں بھی کسی کو مفت کا مال نظر آتا ہے تو اسے ہڑپ کرنے کے لیے دل بے رحم ہو ہی جاتا ہے' اگر یہ ایسا نہ کرتی تو آج اس کی عزت بھی محفوظ نہ ہوتی۔" صفدر نے بڑی تفصیل سے مجھے اس کے بارے میں بتایا۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ تینوں لڑکے اس کے پیروں میں گر کر معافی مانگ رہے ہیں۔ تب اس نے ایک آخری ضرب اپنے ڈنڈے سے ان تینوں کی کمروں پر لگائی اور بولی۔

"چلو دفع ہو جاؤ' آئندہ تمہاری یہ منحوس شکلیں بھی مجھے اپنے قریب دکھائی دیں تو قسم اللہ پاک کی' سالوں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر تمہیں تمہارے گھروں میں پھینک آؤں گی۔"

تینوں لڑکے تیزی سے اٹھے اور بنا پیچھے مڑ کر دیکھے سرپٹ دوڑتے چلے گئے۔ میرے منہ سے بے ساختہ "واہ" نکل گیا۔ ان لڑکوں سے فارغ ہو کر اس نے بغل میں ڈنڈا دبایا اور دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی "مردود کہیں کے۔" پھر اس کی نگاہ ہماری جانب اٹھی تو وہ اپنا ڈنڈا سنبھالے ہوئے ہمارے نزدیک آئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"یہ تم دونوں کیا میری طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو' گاؤں کیا ایک...؟" یہ کہہ کر اس نے ڈنڈا اٹھایا۔

"پگلی نہ ہو تو...... راجی! یہ کیا کر رہی ہے' یہ انجینئر صاحب ہیں ادھر جو پل بن رہا ہے' یہی اس کا سارا کام دیکھیں گے۔" صفدر نے جھٹ آگے ہاتھ کر کے راجی کو روکتے ہوئے کہا۔

"انجیر...... ! وہ کیا ہوتا ہے؟" اسے لفظ انجینئر کہنا نہیں آیا تو اس نے لفظ بگاڑ کر حیرت سے کہا۔

"ہوتا ہے' تیری سمجھ میں نہیں آئے گا' بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ بہت بڑے صاحب ہیں' پل یہی بنائیں گے۔" صفدر نے کہا۔

"ہائے میرے ربا! میں مر گئی۔" اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "اتنے وڈے صاب اور اینٹ گارے کا کام کریں گے۔"

"تو نہیں سمجھے گی پگلی...... ! یہ اینٹ گارے کا کام نہیں کریں گے بلکہ کروائیں گے' چل انہیں ادب سے سلام کر۔" صفدر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تو اس نے جھٹ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سلوٹ کے انداز میں مجھے سلام کیا تو مجھے ہنسی آ گئی' سانولی سلونی اور تیکھے نقوش والی یہ لڑکی راجی مجھے اندر سے بہت معصوم سی لگی اور میں صفدر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

راستے میں صفدر مجھے راجی کے بارے میں بتاتا رہا' باتوں میں راستہ کٹ گیا اور میں اس مکان میں آ گیا' جو میرے رہنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا' یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا' ایک کمرہ تھا۔ جسے بیڈ روم بنایا گیا تھا' اندر ایک لوہے کے سرہانے والی مسہری تھی' جس پر فوم کا گدا بچھا ہوا تھا' ایک الماری تھی جو دیوار کے اندر بنی ہوئی تھی اور اس پر لکڑی کا دروازہ لگا ہوا تھا'

ایک ٹیبل اور کرسی بھی تھی۔ ساتھ ہی اٹیچ باتھ روم تھا' کمرے کے آگے برآمدہ تھا' وہاں چار کرسیاں اور ایک سینٹر ٹیبل رکھی تھی آگے چھوٹا سا صحن تھا' جس میں امرود اور آم کے پیڑ لگے تھے۔

میں نے سارے گھر کا جائزہ لیا' ایک اکیلے بندے کے مختصر قیام کے لیے بہت اچھا تھا' صحن میں ایک کچن بھی بنا ہوا تھا' صفدر نے مجھے بتایا کہ یہ مکان ابھی نیا تعمیر کیا گیا ہے۔

"آپ نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں' اتنے میں' میں کام والے اور اس کی گھر والی کو لے کر آتا ہوں' آپ بتا دیں کہ کھانے میں کیا کھائیں گے' تاکہ میں انہیں بتا دوں تو وہ سامان ساتھ لیتے آئیں گے' آپ کو چائے کی طلب تو ہو رہی ہو گی' اس کی گھر والی چائے بھی تیار کر دے گی۔" صفدر نے مجھ سے کہا۔

"ہاں میں چائے تو ضرور پیوں گا' کھانا کچھ بھی بنوالو میں ہر چیز کھا لیتا ہوں' دال' سبزی' گوشت......!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

صفدر کے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے بستر پر لیٹ گیا' ایک تو بس میں بیٹھے بیٹھے تھکن ہو گئی تھی' اوپر سے اتنا پیدل چلنا پڑا' ہم شہری لوگوں کی پیدل چلنے کی عادت بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے' خاص طور پر اگر آپ کے پاس خود کی سواری ہو' بائیک یا کار...... تھوڑے فاصلے پر بھی جانا ہو تو وقت کی بچت کی خاطر سواری استعمال کرتے ہیں۔

میں ابھی تک لیٹا ہی تھا کہ صفدر ایک مرد اور عورت کو لے کر آ گیا' اس نے بتایا کہ یہ مجید اور رضیہ ہیں۔ دونوں آپ کے سارے کام کریں گے' رضیہ رات کا کھانا پکا کر گھر واپس چلی جایا کرے گی لیکن مجید آپ کے سونے تک آپ کے پاس رہے گا لیکن صبح ہوتے ہی دونوں پھر آ جایا کریں گے' صاحب! ان کا گھر واپس جانا ضروری ہے کیوں کہ ان کے دو چھوٹے بچے ہیں گھر میں۔ دن میں تو مجید کی ماں انہیں سنبھال لے گی لیکن رات میں بچوں کو ماں باپ ہی چاہیے ہوتے ہیں۔"

"ارے نہیں بھئی' اتنا بھی بہت ہے' میں تو تنہا بندہ ہوں' میرے کام زیادہ نہیں ہوتے۔ رضیہ کھانا وغیرہ بنا کر گھر واپس چلی جایا کرے' بس مجید کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر صاحب آپ غسل کر کے تازہ دم ہو جائیں' میں اچھی سی چائے بنواتا ہوں اور ہاں آپ دوپہر کے کھانے میں کیا کھائیں گے' ابھی بتا دیں تاکہ میں رضیہ کو لا کر دے دوں۔" صفدر نے کہا۔

"میں سادہ مزاج رکھتا ہوں' جو بھی بھوک کے وقت مل جائے اس پر اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتا ہوں۔ رضیہ سے جو بھی آسانی سے بن جائے بنا دے۔ زیادہ تردد کی ضرورت نہیں ہے۔" میں یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا تو میں نے ایک جوان دیہاتی عورت اور ایک جوان مرد کو دیکھا' مجھے دیکھتے ہی دونوں نے جھٹ سلام کیا' دونوں کا انداز مودب تھا' میں سمجھ گیا کہ یہی رضیہ اور مجید ہیں۔

ان سے ملاقات کے بعد میں نے جی بھر کے غسل کیا' راستے کی گرد و مٹی صاف ہوئی تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا' اتنی دیر میں چائے تیار ہو کر آ گئی' چائے بہت شاندار تھی' گاؤں کے خالص دودھ سے تیار کی ہوئی' دودھ پتی کی کیا ہی بات تھی۔

چائے پی کر میں نے اپنا سیل فون نکالا اور حرا کو فون کر کے اپنے بخیریت پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ ایک ہی دن میں وہ میرے بغیر اداس ہو گئی تھی' بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ کے بغیر یہ ایک دن صدی بن کے گزرا

ہے‘ میں تو یہ سوچ سوچ کر ہول رہی ہوں کہ دو مہینے کیسے گزریں گے۔“

”ارے میری جان! میرے بغیر اداس ہوگئی‘ کہو تو اڑ کر واپس پہنچ جاؤں‘ دفع کرو کام اور نوکری کو...... گھر میں بیٹھ کر پیار بھری باتیں کریں گے‘ پیار ہی کو اوڑھیں اور بچھائیں گے۔“ میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

”آپ بھی ناں...... بس!“ حرا جھینپ کر دھیرے سے ہنس پڑی۔

”میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور تمہیں بہت یاد کروں گا میری جان! بس شاید مجھے اپنی بے تابیوں کا اظہار کرنا نہیں آتا۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا...... پلیز...... میری خاطر...... آپ کو فوراً ٹھنڈ کا اثر ہو جاتا ہے اور پھر نزلہ‘ کھانسی‘ فلو......!“ اس نے فکر مندی سے کہا‘ اس کے لفظ لفظ میں ایک بیوی کی محبت گھلی ہوئی تھی۔

فون بند کر کے میں نے رکھا اور آنکھیں موندلیں‘ حرا اور سہیل میری آنکھوں کے سامنے تھے‘ میں ان دونوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ حرا کے علاوہ میری زندگی میں کبھی کسی دوسری عورت کا خیال تک نہیں گزرا تھا‘ حرا میرے لیے بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی‘ محبت کرنے والی خدمت گزار‘ اگر کوئی بھی مرد اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن ہوتا ہے تو پھر وہ اور کہیں نہیں دیکھتا‘ حرا نے بھی مجھے اپنی وفا اور محبت کے کھونٹے سے بہت مضبوطی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

حرا کے بارے میں سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی‘ تب ہی مجیدے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی‘ وہ کھانے کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ کھانا تیار ہے‘ آپ کہیں تو میں لگادوں میں نے کہا ”لگادو۔“

کھانا کھا کر میں صفدر کے ساتھ سائٹ دیکھنے چلا گیا۔ وہاں موجود لوگوں سے بات ہوئی‘ ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ سیمنٹ‘ بجری‘ کنکریٹ اور لوہا وغیرہ آرہا تھا۔ میں مغرب کے وقت تک وہاں موجود رہا‘ مختلف امور پر بات چیت ہوئی اور اندھیرا پھیلنے پر گھر واپس آ گیا۔

گھر پر رضیہ اور مجیدا موجود تھے‘ مجیدے نے مجھ سے کہا۔

”صاحب! آپ رات کے کھانے کے بارے میں کچھ بتا کر نہیں گئے تھے‘ اس لیے رضیہ نے اپنی مرضی سے بنادیا ہے‘ کل سے آپ جو کہیں گے بن جایا کرے گا۔“

”ٹھیک ہے یار مجیدے! میں نے بتایا تو تھا کہ میں سب کچھ کھالیتا ہوں۔ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں اندھیرا پھیل گیا ہے‘ رضیہ سے کہو گھر چلی جائے‘ بچے اسے یاد کر رہے ہوں گے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔

”آپ بڑے لوگ ہیں لیکن بہت اچھے دل کے مالک ہیں۔ آپ کو ہمارے بچوں کا کتنا خیال ہے۔“ اس نے نیاز مندی سے کہا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔

”آپ کے بچے ہیں صاحب......؟“

”ہوں!“ میں نے گردن ہلائی۔ ”میرا ایک بیٹا ہے سہیل اور مجھے اپنے بیٹے سے بہت پیار ہے‘ بچے تو بہت معصوم ہوتے ہیں‘ نازک ہوتے ہیں‘ ان کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں پر کیا کریں‘ ہم غریب لوگ پیٹ کی خاطر سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

”سب ہی لوگ پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتے ہیں‘ میں بھی تو پیٹ کی خاطر اپنی بیوی اور بچے سے اتنا دور آیا ہوں۔“

”جی صاحب!“ میری بات سن کر وہ خوش ہوگیا‘ گویا میرا اور اس کا دکھ سانجھا ہوگیا۔

رضیہ نے کھانا بہت ذائقے والا بنایا تھا‘ اب پتا نہیں رضیہ کے ہاتھ میں ہی ذائقہ تھا یا گاؤں کی خالص چیزوں کا کمال تھا۔ بہر حال میں نے کھلے دل سے رضیہ کی تعریف کی‘ میرے تعریف کرنے پر وہ بُری طرح شرما گئی اور شرماتے ہوئے بولی۔

”شکریہ صاحب جی! ورنہ آج تک کسی نے رضیہ کے ہاتھ کا کھانا کھا کے تعریف کے دو جھوٹے بول بھی نہیں بولے‘ ناماں پیو نے‘ نا گھر والے نے۔“

”بھئی وہ ایسے کھانے کے عادی ہوں گے اس لیے انہیں کوئی نئی بات نہیں لگتی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

دن اسی طرح گزرتے رہے‘ میری فون پر گھر پر بات ہوتی رہتی تھی۔ حرا میرے بغیر اداس تو تھی لیکن وہ وہاں تنہا نہیں تھی‘ امی ابو اور سہیل اس کے ساتھ تھے۔ وہ اپنا دل بہلا لیا کرتی لیکن یہاں پر میرے پاس سوائے ان سب کی یادوں کے کچھ نہیں تھا۔



سہیل کی سالگرہ نزدیک آرہی تھی اور اس نے رٹ لگائی ہوئی تھی کہ اگر پپا میری سالگرہ پر نہیں آئیں گے تو میں سالگرہ نہیں مناؤں گا اور میں اسے باتوں سے بہلاتا رہتا تھا کہ میں ضرور آؤں گا لیکن میں دو مہینوں کے لیے آیا تھا جب تک دو ماہ پورے نہیں ہو جاتے میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔

اس روز جب میں سونے کے لیے لیٹا تو حرا کا فون آیا اور اس نے شرماتے ہوئے مجھے خوش خبری سنائی۔ سہیل ماشاءاللہ پورے چار سال کا ہوگیا تھا‘ ہم چاہتے تھے کہ ہماری مزید اولاد ہو لیکن اللہ کا حکم نہیں ہوا لیکن اس روز حرا نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بار پھر ماں بننے والی ہے‘ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی لیڈی ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئی تھی اور مطمئن ہو جانے کے بعد آتے ہی اس نے مجھے یہ خبر سنائی۔

میں بھی یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوا‘ اب میری ایک بیٹی کی خواہش تھی۔ پھر میری فیملی مکمل ہو جاتی‘ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا کہ لگتا ہے کہ سہیل کی سالگرہ پر آنا ہی پڑے گا‘ اس لمحے میرا شدت سے جی چاہا کہ میں اڑ کر حرا کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے اپنی محبت بھری بانہوں میں لے کر مبارک باد دوں لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔

دوسری صبح میں بیدار ہوا تو غیر معمولی طور پر خوش اور فریش تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں پیدل ہی سائٹ کی جانب چل دیا‘ مجھے یہاں آئے ہوئے بیس روز ہوگئے تھے اور ان بیس دنوں میں گاؤں کی خالص خوراک اور خالص آب و ہوا نے میری صحت پر اچھا اثر کیا تھا‘ ورنہ کراچی کی آب و ہوا اپنے اندر بہت نمی لیے ہوئے ہوتی ہے‘ جس کی وجہ سے ہم سو کر اٹھنے پر بھی اپنے آپ کو فریش محسوس نہیں کرتے‘ پھر یہاں صبح اور شام کی واک بھی ہو جاتی تھی‘ سائٹ پر پیدل آتے اور جاتے ہوئے۔ کراچی میں ان کاموں کا ٹائم ملتا ہی نہیں تھا۔

میں اردگرد کے سبزہ زاروں کے پُرلطف نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنی ہی دھن میں مگن جارہا تھا کہ اچانک برگد کے درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے کوئی چیز اچانک دھپ سے نیچے گری‘ میں بوکھلا کر رک گیا۔ دیکھا تو یہ وہی اس روز دکھائی دینے والی لڑکی راجی تھی‘ آج بھی پہلے کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور رنگے کپڑوں میں وہ سانولی سلونی اور تیکھے نقوش والی لڑکی مجھے پیاری سی لگی۔

”معاف کرنا صاب! آپ کو میری وجہ سے پریشانی ہوئی۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک

دوسرے پر مارتے ہوئے ہاتھوں پر لگی مٹی جھاڑتے ہوئے کہا جو نیچے گرنے سے اس کے ہاتھوں پر لگ گئی تھی۔ ”آپ ڈر گئے تھے ناں!“ اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”نن...... نہیں تو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”کھائیں قسم اللہ پاک کی!“ اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کس لیے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ ڈرے نہیں تھے۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو شرارت سے نچاتے ہوئے کہا۔

”قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے کہہ تو رہا ہوں کہ نہیں ڈرا اور پھر تم سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے تم اتنی پیاری سی لڑکی ہو کوئی بھوت یا چڑیل تھوڑی ہو۔“ میں نے کہا۔

”سچ!“ اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا تو جواب میں، میں نے مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا۔ ”سچی بتاؤں صاحب! مجھے ناں سب کو اس طرح ڈرانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ میں اسی طرح درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتی ہوں اور جب کوئی قریب آتا ہے تو میں اسی طرح کود جاتی ہوں، قسم سے سب لوگ ڈر کے مارے ایسا سرپٹ دوڑتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس برگد کے درخت سے کوئی بھوت ان پر کود پڑا ہے، بیٹھی تو میں کسی اور کو ڈرانے کے لیے تھی مگر اچانک آپ آ گئے، میں نے سوچا کہ آج آپ کو بھی ڈرا دوں پر آپ تو ڈرے بھی نہیں۔“ آخری فقرہ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”سب ڈرتے کیوں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”سارے گاؤں والے کہتے ہیں اس برگد پر ناں سایہ ہے اسی لیے......“ اس نے میرے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

”اچھا......!“ میں نے حیرت سے پوچھا ”اور تمہیں اس سائے سے ڈر نہیں لگتا۔“

”راجی کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی صاب جی! آئے ناں کوئی میرے سامنے...... یہ ہے ناں میرا مولا بخش!“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا میرے سامنے ہلاتے ہوئے کہا۔

”مولا بخش!“ میں ڈنڈے کا نام سن کر ہنس پڑا۔

”مولا بخش مسجد کے مولی صاحب (مولوی صاحب) کا ہے وہ اس سے بچوں کی پٹائی کرتے تھے، میں نے چرا لیا۔“ اس نے مزہ لیتے ہوئے اپنی چوری کے بارے میں بتایا۔

اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مجھے سائٹ پر جانے کے لیے دیر ہو رہی ہے اسی لیے میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

”آپ بہت اچھے ہو صاب جی!“ اس نے پیچھے سے کہا تو میں مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

مغرب کے وقت جب میں واپس آ رہا تھا تو اسی راستے پر وہ مجھے دور سے بھاگتی ہوئی آتے ہوئے دکھائی دی، ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے آوازیں بھی دیتی جا رہی تھی۔ صاب جی...... او صاب جی......

میں اس کی آواز سن کر ٹھہر گیا۔ میرے قریب آ کر وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی، میں نے اس پر نگاہ ڈالی اس کی اوڑھنی سر پر سے ڈھلک کر کندھے کے ایک جانب پڑی تھی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے میں بھی اس کے جسم کی قیامتوں نے لمحہ بھر میں میرے اندر ہلچل مچا دی، میں نے جھٹ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور آہستہ سے کہا۔

”راجی! اپنی اوڑھنی کو ٹھیک طریقے سے اوڑھو۔“

”جی صاب جی......!“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر اپنے سراپا پر نگاہ ڈالی اور جھٹ اپنا دوپٹہ سلیقے

سے پھیلا کر اوڑھ لیا۔

”کیا بات ہے راجی! مجھے کیوں روکا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو آپ کا کب سے اِدھر کھڑی انتظار کر رہی تھی، وہ ہے ناں موانائی کا لونڈا اشاکر...... مجھ سے آ کر کہنے لگا ”میرے ساتھ چلے گی ایک گھنٹے کو...... پورے پچاس روپے دواں گا۔“ بس پھر کیا تھا مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے بھی ڈنڈا سنبھال لیا، کتنی دور تک مارتے ہوئے گئی ہوں...... سالا......!“ اس نے نفرت سے ایک جانب تھوکتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات سن کر بے حد دکھ اور افسوس ہوا، اس بچاری جوان لڑکی کی عزت بھی بنا ماں باپ کے سائے کے ہوا کے دوش پر رکھے ہوئے چراغ کی مانند ہے آخر تن تنہا یہ کب تک ان شیطان کے چیلوں کا مقابلہ کرنے گی۔

”کیا ہوا صاب جی! آپ کو برا لگا......؟“ اس نے اپنی لمبی لمبی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں...... تمہارے سر پر کسی کا ہاتھ نہیں ہے ناں اس لیے ان بدمعاش لڑکوں کی تم سے یہ بات کہنے کی جرأت ہوتی ہے شادی کر کے گھر بسا لو گی تو سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”مجھ سے کون شادی کرے گا۔ میں بے سہارا غریب لڑکی جو ٹھہری...... سب مفت میں دعوت اڑانے والے ہیں...... سالے......!“ اس کے لہجے میں ایک بار پھر ڈھیر ساری نفرت امڈ آئی۔

”اچھا میری بات غور سے سنو اب تم یوں گاؤں میں پھرنا بند کر دو، اپنے گھر میں رہا کرو بُری بات ہے جوان لڑکیاں یوں گھروں سے باہر نہیں گھومتیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اکیلا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے، میرا دل نہیں لگتا۔“ اس نے بے بسی سے پیر پٹختے ہوئے کہا پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی اور وہ بولی۔

”گھر میں رکی رہوں گی تو آپ سے کیسے ملوں گی؟ آپ مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔“ میں اس کی بات پر چونک سا گیا لیکن پھر سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”اب میں تمہیں گاؤں میں یوں پھرتا ہوا نہ دیکھوں۔“

”اچھا میں آپ کی بات مانتی ہوں لیکن صرف صبح اور شام اسی جگہ آپ کا انتظار کروں گی۔“ اس نے کہا اور میرا جواب سنے بنا ہی ایک جانب بھاگ کھڑی ہوئی۔

”آہستہ چلو راجی!“ میں نے چیخ کر کہا تو اس نے مڑ کر ہاتھ ہلایا اور بھاگتی چلی گئی۔

عجیب لڑکی تھی، میں نے اس کی سادہ لوحی پر مسکراتے ہوئے سوچا اور گھر لوٹ آیا، اس رات فون پر باتیں کرنے کے دوران میں نے حرا کو راجی کے بارے میں بتایا تو اس نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

”آپ تو اسے اچھے لگتے ہیں، اب کہیں وہ آپ کو اچھی لگنا نہ شروع ہو جائے۔“

”راحیل کے دل پر حرا کا قبضہ ہے اس کے دل کے خالی مکان میں پہلی بار حرا ہی داخل ہوئی اور اس نے اس طرح سے دل کے دروازے کو بند کر لیا ہے کہ کوئی کتنا ہی کیوں نہ چاہے اس دل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ چاہے کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے آئی لو یو سویٹ ہارٹ!“ میں نے محبت سے چور لہجے میں کہا تو جواب میں مجھے حرا کی گہری گہری سانسیں سنائی دیں، ہم دونوں خاموش تھے، ہمیں صرف ایک دوسرے کی سانسیں سنائی دے رہی تھیں بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے سینے سے لگے اپنی دھڑکنوں اور

سانسوں کی زبان سے گفتگو کررہے ہوں۔
"آئی رئیلی مس یوں جانو......!" حرا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور فون بند کردیا۔
اس دن کے بعد سے حرا کی یاد شدت کے ساتھ مجھے ستانے لگی' سہیل کی سالگرہ کے دن نزدیک آرہے تھے میرا دل بہت بے چین اور بے قرار ہورہا تھا مگر کیا کرتا' میں گھر واپس جانے کے لیے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا۔
راجی نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھایا' وہ روزانہ صبح و شام مجھے راستے میں کھڑی ہوئی ملتی۔ میں ایک دو باتیں کر کے آگے بڑھ جاتا۔ اس نے حسب عادت قسم اللہ پاک کی کھا کر مجھے بتایا کہ وہ اب دن بھر گھر میں رہتی ہے' گاؤں میں نہیں گھومتی' جواب میں' میں نے اسے شاباشی دی اور سوچا کہ کسی دن رضیہ سے راجی کے بارے میں بات کروں گا کہ کوئی شریف لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کروادوں۔
مگر دوسرے دن کی صبح رضیہ اور مجیدا نہیں آئے میں نے خود ہی چائے بنا کر پی اور سائٹ پر چلا گیا۔ شام کو گھر واپس آیا تو تب بھی رضیہ اور مجیدا گھر پر نہیں تھے' میں سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بیمار ہوگئے ہوں لیکن دونوں ایک ساتھ کیسے بیمار ہوسکتے ہیں' ایک فرد نہ آتا تو دوسرا ضرور آتا۔ خیر میں نے اس رات کھانا گاؤں کے چھپر ہوٹل سے کھالیا اور گھر آ کر سوگیا' اس امید پر کہ کل تو رضیہ اور مجیدا آ ہی جائیں گے۔
دوسری صبح بھی وہ دونوں نہیں آئے تو میں فکر مند ہوگیا اور سوچا کہ صفدر سے ان کے بارے میں بات کروں گا' میں سائٹ پر جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا تب مجھے مجیدا آتا ہوا دکھائی دیا میں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ خیریت پوچھ لوں۔
مجیدا قریب آیا تو اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا اور وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔
"کیا بات ہے مجیدے! سب خیریت تو ہے ناں' تم پریشان دکھائی دے رہے ہو' کل آئے بھی نہیں۔" میں نے پوچھا۔
"خیریت نہیں ہے صاحب! میرا بیٹا بہت بیمار ہے' کل گاؤں میں حکیم جی کو دکھایا تو انہوں نے جواب دے دیا اور کہا کہ کوئی بڑا مرض لگتا ہے' اس کو شہر کے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ' تو صاحب میں اور رضیہ اپنی بیٹی کو ماں جی کے پاس چھوڑ کر بیٹے کو لے کر شہر جارہے ہیں۔ آپ معاف کردیجیے گا' ہم آپ کی زیادہ خدمت نہ کرسکے۔" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"کوئی بات نہیں مجیدے! تم فوراً اپنے بیٹے کو شہر لے جاؤ اور کسی اسپتال میں اس کا پورا چیک اپ کرواؤ اور ہاں یہاں کی تم بالکل فکر مت کرنا' کام کرنے والے بہت مل جائیں گے' لو تم یہ کچھ پیسے رکھ لو تمہیں ضرورت پڑے گی۔ بچے کا علاج اچھی طرح سے کروانا۔" میں نے اپنے پرس سے ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ تو بہت ہیں صاحب......!" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔
"تمہیں شہر کے اسپتالوں کا نہیں پتا' ڈاکٹر انسان کی حیثیت دیکھے بنا بڑے بڑے مہنگے مہنگے ٹیسٹ لکھ کر دے دیتے ہیں اور ٹیسٹ کرائے بغیر کوئی دوا بھی نہیں دیتے' ہوسکتا ہے یہ بھی کم پڑجائیں' فی الحال تو میرے پاس یہی ہیں اگر زیادہ ہوتے تو اور بھی دیتا۔" میں نے اسے سمجھایا تو وہ تشکر آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا سلام کر کے چلا گیا۔
مجیدے کے بچے کی بیماری کا سن کر مجھے اپنا بیٹا سہیل یاد آنے لگا اور میں دل ہی دل میں اس کے بخیر و عافیت ہونے کے ساتھ ساتھ مجیدے کے بچے کی صحت یابی کی بھی دعا مانگنے لگا اور اس رات دیر تک میں نے عشاء کی نماز کے بعد سب کے لیے خوب دعائیں کیں۔
صبح اٹھا تو دل میں عجیب سی بے قراری محسوس ہورہی تھی' میں اپنی اس کیفیت کو جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ دراصل مجیدے کے بچے کی جان لیوا بیماری کا سن کر مجھے اپنے بیٹے سہیل کا خیال بڑی شدت کے ساتھ آرہا تھا۔ میں نے رات بھی گھر پر فون کیا تھا' سہیل' امی' ابو' حرا سب سے بات ہوئی تھی مگر اس وقت بھی میرا جی چاہا کہ میں سہیل سے بات کروں۔ میں نے گھر پر فون کیا تو امی نے بتایا۔
"حرا' سہیل کو اسکول چھوڑنے کے لیے گئی ہے۔ کیا بات ہے بیٹا! خیریت تو ہے تم نے رات ہی تو ہم سب سے بات کی ہے۔" امی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
"کچھ نہیں امی' بس ایسے ہی سہیل کی سالگرہ نزدیک آرہی ہے اور وہ رات کو بھی مجھ سے بہت ضد کررہا تھا کہ اگر آپ نہیں آئے تو میں سالگرہ نہیں مناؤں گا' بس اس وقت سے میرا دل عجیب سا محسوس کررہا ہے۔ میں کیا کروں امی! یہاں کام پورے زور و شور سے جاری ہے اور میں صرف اپنے بیٹے کی سالگرہ منانے کے لیے چھٹی لے کر نہیں آسکتا' پورے دو ماہ گزر جائیں گے تو میں دو ماہ کے لیے کراچی آجاؤں گا میری جگہ دوسرا بندہ کام سنبھال لے گا۔" میں نے اپنے آپ کو بہت زیادہ مجبور ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"میں جانتی ہوں بیٹا! تم فکر نہ کرو' بچوں کا کیا ہے وہ تو ضد کرتے ہی ہیں' میں اور تمہارے ابو ہیں ناں اسے بہلالیں گے۔ پھر جب تم آؤ گے تو اسے خوش کرنے کے لیے دوبارہ اس کی سالگرہ منالیں گے۔" امی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔
پھر میں نے مطمئن ہوکر فون بند کردیا اور سائٹ پر چلا گیا' حسب معمول راجی مجھے راستے میں کھڑی مل گئی لیکن میں اس سے بات کرنے کے لیے رکا نہیں' مجھے فون پر بات کرنے کی وجہ سے پہلے ہی اتنی دیر ہوچکی تھی۔
واپسی میں بھی وہ بے قراری سے میرا انتظار کررہی تھی' مجھے اس کا اپنے لیے یوں انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ گاؤں کے کسی فرد نے اگر یہ بات نوٹ کرلی تو یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ میری عزت پر بھی حرف آئے گا' میں نے اسے کہا کہ وہ اس طرح میرے لیے کھڑی نہ ہوا کرے اور غصے اور ناگواری سے یہ الفاظ کہہ کر میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا اور وہ بڑی بے چارگی سے میری جانب دیکھتی رہ گئی۔ بعد میں مجھے اس بات کا خیال بھی آیا کہ مجھے اس لہجے میں اس سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن پھر خود کو سمجھایا کہ اس احمق لڑکی کو شاید اس لہجے میں کہی گئی بات سمجھ میں آئے گی۔
رضیہ اور مجیدا تو چلے گئے تھے فی الحال میرے پاس دوسرا ملازم نہیں تھا' میں نے سوچا کہ میرے واپس جانے میں پندرہ دن رہ گئے ہیں' میں باہر سے کھانا کھالیا کروں گا' خوامخواہ کسی کو اپنے لیے پابند کرنے کی کیا ضرورت ہے' ہوسکتا ہے مجیدے کے بچے کی بیماری کا سبب ماں سے دوری ہی ہو۔
اس رات میں نے رات کا کھانا چھپر ہوٹل سے کھایا اور گھر آ کر نماز عشاء کے لیے انتظار کرنے لگا۔ اذان ہوئی تو میں مسجد چلا گیا اور نماز کے بعد گھر آ کر سوگیا۔
دوسری صبح فجر کے وقت بیدار ہوا اور نماز کے لیے مسجد چلا گیا۔ مسجد میں جا کر با جماعت نماز ادا کرنے

کی عادت ابو اور امی نے بچپن ہی سے ڈالی ہوئی تھی۔ میں نے گھر آ کر خود ہی چائے بنائی اور پی لی۔ میں آفس کے لیے تیار ہونے لگا تو میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور درد بڑھتا ہی چلا گیا۔ واش روم کے چکر لگتے گئے پھر جسم میں درد اور سردی سے بخار ہوگیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

شام کو میری آنکھ کھلی تو شدید پیاس لگ رہی تھی مگر میری ہمت ہی نہ ہوئی کہ میں اٹھ کر پانی بھی پی سکوں۔ میں نے نڈھال ہو کر دوبارہ تکیے پر سر رکھ دیا' حرا کی یاد شدت سے آ گئی۔ مجھے ایک چھینک بھی آ جاتی تھی تو وہ مجھے بستر سے اٹھنے بھی نہیں دیتی تھی کہ کہیں مجھے بخار نہ ہو جائے۔ وہ میرے بخار سے بہت خوف زدہ ہوتی تھی کیوں کہ مجھے بخار بہت تیز ہوتا تھا اور بعض اوقات میں اول فول بھی بکنے لگتا تھا کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ حرا کے بارے میں سوچتا سوچتا میں دوبارہ غفلت میں چلا گیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جیسے حرا میرے پاس بیٹھی ہے' وہ میرے ماتھے پر پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی' کبھی میرے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرتی' کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتی' وہ بار بار اپنا سر میرے سینے پر رکھ رہی تھی۔

میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور اپنے پپڑی زدہ خشک ہونٹوں سے بمشکل کہا۔

"تم آ گئیں جانو......! دیکھو تمہارے بغیر میرا کیا حال ہو گیا ہے' تو وہ اور شدت کے ساتھ میرے سینے سے چمٹ گئی۔ پھر اس نے میرے چہرے اور سینے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ ایسی ہی جنونی تھی' میری محبت میں۔ مجھ سے آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں۔ کھولنے پر آنکھوں میں بہت جلن ہو رہی تھی' میں نے بند آنکھوں کے ساتھ اس کے نازک وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا' کہاں تو مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا اور کہاں اپنے پیار کو اپنے قریب پا کر میرے اندر دنیا جہاں کی طاقت آ گئی۔

پھر کتنے دنوں کا تڑپتا سلگتا' حرا کے وجود کا پیاسا میرا جسم جنونی ہونے لگا' میں اپنی بیماری بھول گیا۔ بس میں تھا اور میری پیاری بیوی حرا تھی۔ میں اس کے حسن کو اپنے لبوں سے خراج تحسین پیش کر رہا تھا' اس کے جسم کی چٹکتی ہوئی شاخ کے ہر پتے اور ہر بوٹے نے میرا پیار قبول کیا۔ وہ بھی کتنی مست و بے خود تھی۔

اور پھر کتنی ہی دیر بعد محبت کی اس تکمیل کے بعد میں بُری طرح ہانپنے لگا اور بے دم ہو کر بستر پر گر پڑا' میرا جسم پسینے میں شرابور تھا' وہ میرے پہلو میں چپ چاپ لیٹی تھی۔ پھر میری آنکھ لگ گئی' آنکھ کھلی تو جسم ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا' بخار اتر چکا تھا' رات اتنا پسینہ آیا کہ بخار اتر گیا۔ پسینے کا خیال آتے ہی رات کی ساری باتیں مجھے یاد آنے لگیں اور میں نے سوچا کہ شاید میں نے رات کو کوئی خواب دیکھا ہے۔ میں بستر سے اٹھ بیٹھا' کمزوری محسوس ہو رہی تھی' سوچا کہ پہلے ذرا ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤں پھر چائے بناؤں گا' ابھی میں مڑا ہی تھا کہ آہٹ پر میں نے مڑ کر دیکھا تو راجی ہاتھ میں گرم دودھ کا گلاس لیے اندر آ رہی تھی۔

"تم......!" میں نے شدید حیرت سے کہا۔ "تم کب آئیں......؟ لیکن تم اندر کیسے آئیں' میں تو دروازہ اندر سے بند کر کے سویا تھا۔"

"وہ...... وہ صاب جی! کل آپ دکھائی نہیں دیئے تو میں پریشان ہو گئی تھی' آپ نہ صبح دکھائی دیئے اور نہ شام کو...... میں نے سارے گاؤں میں آپ کو تلاش کیا پھر آپ کے گھر آئی تو دروازہ اندر سے بند تھا' میں نے بہت دروازہ بجایا آپ کو آوازیں بھی

دیں پر آپ نے جی دروازہ کھولا ہی نہیں پھر صاب جی! میں گھبرا گئی' یہ سوچ کر جھٹ دیوار پر چڑھ گئی اور اندر کود گئی کہ رب نہ کرے آپ کہیں بیمار نہ ہو گئے ہو' آپ شہری لوگ ہو آپ کو ایسا کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے' رات کو آپ نے گاؤں کے چھپر ہوٹل سے کھانا کھایا تھا۔ اس لیے آپ بیمار ہو گئے ہو گے اور دیکھ لو میرا خیال سچ نکلا' وہ صاب جی! آپ نے میرے کو منع کیا تھا برگد کے نیچے آنے کو...... پر صاب جی! میں آپ کو یہ بولنے کے واسطے آئی تھی کہ رضیہ اپنے بچے کو لے کر شہر چلی گئی تو میں آپ کے گھر کا کام کر دیا کروں گی' پر آپ آئے نہیں۔" وہ مزے سے اپنے انداز سے مسلسل نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی' اس کی باتیں سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم رات سے یہیں ہو......؟"

"جی صاب جی......!" اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جھکا کر کہا۔

"رات وہ...... میں...... تم......!" میرا دماغ بُری طرح چکرانے لگا' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' مجھے بہت زور کا چکر آ گیا اور اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے میں بستر پر بیٹھ گیا اور میری نگاہ مسلی کچلی بستر کی چادر پر پڑی جو چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ رات میں نے ایک کنواری لڑکی کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔

مارے شرم کے میرا دل چاہا کہ کاش میں اسی وقت مر جاؤں' یہ مجھ سے کیسے اتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا۔ او میرے خدایا...... مجھے معاف کر دے' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

حیران پریشان راجی حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی' میں نے پھر بھی تصدیق کے لیے راجی کی جانب دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"رات کو کیا تم...... میرے بستر پر...... میرے ساتھ......!" میں شرمندگی کے باعث کھل کر اس سے پوچھ نہ سکا۔

"جی......!" اس نے نیچی نگاہوں کے ساتھ دھیرے سے کہا۔

"تو تم نے ایسا ہونے ہی کیوں دیا' تم نے مجھے روکا کیوں نہیں' تمہیں تو مجھے جان سے مار دینا چاہیے تھا' اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیتیں' یا...... یا...... چھری لا کر میرا گلا کاٹ دیتیں' تم نے ایسا کیوں نہیں کیا راجی......؟" میں ایک بار پھر بلک بلک کر رو پڑا۔

"مجھے معاف کر دیں صاب جی! آپ کیوں روتے ہیں' آپ کا قصور نہیں ہے' میں قصوروار ہوں۔ میرا قصور یہ ہے صاب جی کہ میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔ آپ اس دن ہی مجھے اچھے لگے جب آپ کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا پھر آپ مجھے اس دن اور بھی اچھے لگے جب آپ نے مجھ سے میری اوڑھنی ٹھیک طریقے سے اوڑھنے کو کہا' آپ مجھے اس وقت بھی اچھے لگے جب آپ نے مجھے برگد کے نیچے صبح شام اپنا انتظار کرنے کو منع کیا...... آپ سارے مردوں سے الگ ہو صاب جی! آپ نے مجھ پہ کبھی میلی نگاہ نہیں ڈالی...... آپ نے تو زمانے کے پیروں میں رُلنے والی راجی کی عزت کی' اس عورت کو عزت دی...... تو صاب جی......!" روتے روتے وہ کہتے ہوئے چند لمحوں کے لیے سانس لینے کے لیے رکی پھر بولی۔

"تو صاب جی جب آپ نے اپنی کسی پیاری کی یاد میں راجی کو گلے لگایا تو راجی نے اپنی سب سے قیمتی چیز آپ پر قربان کر دی' میں کب تک اپنی عزت

کی حفاظت کرسکتی تھی؟ اسے تو ایک دن لٹ ہی جانا تھا کیوں کہ گاؤں کے ہر مرد کی آنکھ میں میرے لیے ہوس ہے‘ عزت نہیں۔ استانی جی کہتی ہیں گوری کا جوبن تو چٹکیوں میں چلا جاتا ہے ہر میلی نگاہ ایک چٹکی ہوتی ہے۔‘‘ اس نے بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا‘ اس کے لہجے اور الفاظ میں دنیا جہاں کا درد اور دکھ سمٹا ہوا تھا۔

’’لیکن راجی! میں خود اپنی نگاہوں میں گر گیا ہوں۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا‘ کبھی اپنے سامنے اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا نہیں ہوسکوں گا۔‘‘ میں نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔

’’آپ کیوں پریشان ہو رہے ہو صاب جی! آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا اور نہ میں نے گناہ کیا ہے‘ محبت کرنا گناہ تھوڑا ہی ہے‘ میں نے اپنی خوشی سے.....‘‘

’’شٹ اپ..... شٹ اپ..... بے شرم لڑکی.....! کتنی ڈھٹائی سے ایک گناہ کو تم محبت کا نام دے رہی ہو‘ محبت اور گناہ میں زمین آسمان کا فرق ہے‘ سمجھیں..... دفع ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے اور آئندہ مجھے اپنی یہ غلیظ صورت مت دکھانا.....‘‘ میں نے غصے سے دیوانگی کی حالت میں چیختے ہوئے کہا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگی‘ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں سے پانی سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا وہ جیسے سکتے کی کیفیت میں کھڑی تھی۔

’’جاؤ یہاں سے.....‘‘ میں ایک بار پھر چیخا تو وہ ایک جھرجھری لے کر ہوش میں آگئی اور تیزی سے بستر کی چادر کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا کر بھاگ گئی۔

اور میں اپنے چکراتے ہوئے دماغ کے ساتھ بستر پر گر پڑا‘ رہ رہ کر راجی کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پاگل لڑکی مجھے اس حد تک چاہنے لگی ہے‘ جب کہ میرے دل میں سوائے حرا کے کسی اور کا خیال تک نہیں تھا اور راجی کے لیے میرے دل میں سوائے ہمدردی کے کچھ نہیں تھا‘ حرا سے دوری‘ اس کی یاد اور بخار میں غفلت کی کیفیت میں مجھ سے اتنا بڑا گناہ سرزد ہوگیا‘ وہ اکیلا میرا گناہ نہیں تھا‘ راجی کی تمام تر رضامندی اس میں شامل تھی یا شاید اس کی بے خودی اور وارفتگی نے مجھے بھی بے خودی میں مبتلا کردیا۔

مجھے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی‘ میرا سارا جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپ رہا تھا‘ میرے اندر دین اور دنیا دونوں طرح کا خوف کا ناگ پھن اٹھائے میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ میں بستر پر ڈھے گیا اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

ہوش آیا تو اپنے قریب صفدر اور ایک عمر رسیدہ انسان کو بیٹھے ہوئے پایا‘ میری آنکھیں کھلیں تو صفدر کے منہ سے نکلا۔

’’اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا‘ ورنہ میں تو بے حد پریشان ہوگیا تھا۔‘‘

’’مجھے کیا ہوا ہے.....!‘‘ میں نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’آپ کو بخار ہے‘ آپ کل سائٹ پر نہیں پہنچے اور آج بھی‘ تو میں آپ کی خیریت کا پتا کرنے کے لیے آ گیا دیکھا تو آپ بخار میں بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے اتنی آوازیں دیں مگر آپ نے آنکھیں نہیں کھولیں تو میں فوری طور پر حکیم صاحب کو بلا لایا‘ یہ کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ ان ہی کی کوششوں سے آپ کو ہوش آیا ہے۔‘‘ صفدر نے تفصیل سے کہا تو میں نے حکیم صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

’’ان کو بہت کمزوری ہو رہی ہے۔ صفدر میاں! آپ ایک گلاس نیم گرم دودھ لے آئیے اور یہ خمیرہ مروارید انہیں کھلا دیجیے‘ کمزوری فوری طور پر رفع ہو جائے گی پھر کھانے میں بکرے کے گوشت کا پتلا شوربہ پھلکے کے ساتھ دیجیے‘ آپ میرے مطب سے اور دوسری دوائیاں لے آئیے‘ ان شاء اللہ شام تک یہ بھلے چنگے ہو جائیں گے۔‘‘ حکیم صاحب نے صفدر کو ہدایات دیں۔

میں نے کبھی بھی حکیم کا علاج نہیں کروایا تھا اور نہ ہی کوئی دوا کھائی تھی‘ اس لیے کہا۔

’’نہیں صفدر! رہنے دو‘ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔‘‘

’’ارے نہیں راحیل صاحب! ہمارے گاؤں کے حکیم شمس الدین صاحب بہت قابل حکیم ہیں۔ آپ دوا کھائیں ان شاء اللہ ضرور صحت یاب ہو جائیں گے۔‘‘ صفدر نے اصرار کیا تو میں نے نیم رضامندی دیتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں۔

صفدر تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر حکیم صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس کے ہاتھوں میں کچھ تھیلے تھے وہ سیدھی کچن میں چلی گئی‘ صفدر نے دودھ کے ساتھ مجھے خمیرہ کھلایا‘ وہ شام تک میرے ساتھ رہا اور جیسا کہ حکیم صاحب نے کہا تھا‘ میرا بخار اتر گیا اور کمزوری بھی کافی حد تک رفع ہوگئی مگر میرے اندر کی کیفیت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔

مجھے رات کی دوا صفدر نے اپنے ہاتھ سے کھلائی اور مجھے سو جانے کی تلقین کر کے وہ چلا گیا‘ شاید دوا کے زیر اثر میں ساری رات سوتا رہا۔ صبح اٹھا تو طبیعت بہت بہتر تھی۔ بخار بھی نہیں تھا‘ میں نے غسل کیا تا کہ فریش ہو کر سائٹ پر جا سکوں۔ دو دنوں سے میری نمازیں بھی قضا ہو رہی تھیں‘ ابھی میں غسل کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ میرا موبائل فون بجنے لگا۔ میں نے فون کی اسکرین پر نمبر دیکھا‘ حرا کا فون تھا‘ مجھے ایک دم یاد آیا کہ آج میرے بیٹے سہیل کی برتھ ڈے ہے مگر میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔ حرا نے بھی میرے فون کے انتظار کے بعد فون کیا ہوگا‘ میں نے فوراً فون ریسیو کیا‘ اور جھٹ کہا۔

ہیلو حرا.....!‘‘

’’یہ ممی نہیں‘ میں ہوں پپا..... اور میں آپ سے خفا ہوں‘ آپ بھول گئے اور آپ نے مجھے وش نہیں کیا‘ میں ممی کا فون اپنے تکیے کے پاس رکھ کر سویا تھا کہ آپ کے فون سے میں جاگوں گا اور مجھے سب سے پہلے آپ وش کریں گے لیکن آپ کو تو یاد ہی نہیں ہے‘ اس لیے میں نے آپ کو یاد دلانے کے لیے فون کیا ہے۔‘‘ فون پر میرے بیٹے سہیل کی روٹھی روٹھی آواز آ رہی تھی۔

’’میں قطعی نہیں بھولا پپا کی جان! ایسا بھلا ہوسکتا ہے میں بس ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ بس ابھی میری آنکھ کھلی ہے۔‘‘ میں نے اسے منانے کے لیے جھوٹ بولا۔

’’آپ سچ کہہ رہے ہیں پپا.....!‘‘ اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

’’جی میری جان.....!‘‘ میں نے محبت بھرے لہجے میں ایک اور جھوٹ بولا۔

’’پھر ٹھیک ہے۔‘‘ وہ ایک دم خوش ہوگیا۔

میں نے اس سے ڈھیر ساری باتیں کیں‘ اس نے خوش ہو کر بتایا کہ ممی آج شام کو مجھے آپ کی طرف سے سائیکل دلانے کے لیے لے جائیں گی‘ پھر گھر آ کر میں کیک کاٹوں گا پھر ہم ڈنر کرنے باہر جائیں گے اور آپ کو بہت یاد کریں گے۔

سہیل سے باتیں کرنے میں کافی دیر ہوگئی تو میں

نے فجر کی قضا نماز پڑھنے کا ارادہ یہ سوچ کر ملتوی کردیا کہ بعد میں پڑھ لوں گا۔ اماں خیراں نے مجھے ناشتہ بنادیا اور میں ناشتہ کرکے اور گھر اس کے حوالے کرکے تیز تیز قدموں سے سائٹ کی جانب چل دیا۔ اس وقت پہلی مرتبہ میرا جی چاہا کہ کاش کوئی گاڑی نہیں تو ایک بائیک ہی ہوتی۔ برگد کے درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے خود بخود میرے قدموں کی رفتار سست ہوگئی۔ میں نے چور نگاہوں سے اپنے اردگرد دیکھا کیوں کہ راجی وہاں نہیں تھی؛ تب ہی کافی دور کھڑی مجھے وہ دکھائی دی جو میری ہی جانب دیکھ رہی تھی' اس پر نگاہ پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مار دیا ہو اور پھر میرے قدموں میں مزید تیزی آگئی' اتنا تیز چلنے سے میرا سانس پھول گیا تھا لیکن میں رکا نہیں اور سائٹ پر پہنچ کر ہی دم لیا۔



اس دن میں نے زیادہ وقت سائٹ پر موجود اپنے آفس میں بیٹھ کر گزارا' شام ہوئی تو میرے دل کو عجیب بے چینی اور بے قراری ہونے لگی' میرا دل اندر سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں اڑ کے اپنے گھر اپنے سہیل کے پاس پہنچ جاؤں۔ اپنے دل میں بے قراری اور بے چینی کو لیے ہوئے میں گھر لوٹ آیا۔

مغرب کی اذان ہوئی تو میں نے سوچا کہ نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد چلا جاتا ہوں کہ ایک بار پھر میرے سیل فون کی بیل چنگھاڑ اٹھی' نہ جانے کیوں مجھے فون کی بیل کی آواز عجیب سی لگی' میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے فون ریسیو کیا' فون ابو جان کا تھا۔

''السلام علیکم ابو جان! آپ کیسے ہیں؟'' میں نے نمبر دیکھنے کے بعد فون ریسیو کرتے ہی کہا۔ جواب میں مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ''ہیلو...... ہیلو ابو جان...... آپ کو میری آواز آرہی ہے؟'' میں نے بے قراری سے کہا۔

''ہاں بیٹا......!'' ابو جان نے تھکی تھکی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا بات ہے ابو جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟'' میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا......!'' ابو جان نے ایک سسکی لے کر کہا۔ ''تم فوراً کراچی آجاؤ......!''

''کیا ہوا......؟ سب خیریت تو ہے ناں ابو جان! آپ رو رہے ہیں؟ بتایئے ناں کیا بات ہے؟''

''خیریت نہیں ہے راحیل...... بس تم فوراً آجاؤ۔'' انہوں نے کہا اور سسکیاں لینے لگے۔

''ابو پلیز...... ابو بتایئے ناں کیا بات ہے؟ ابو میرا دل بہت گھبرا رہا ہے' امی تو ٹھیک ہیں۔'' میں نے بھیگی ہوئی آواز میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''بیٹا! حرا اور سہیل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے' سہیل کی حالت......'' اور ابو نے فون بند کردیا۔

میں چیختا رہا۔ ''ابو...... سہیل کو کیا ہوا...... میرا بیٹا کیسا ہے......؟ حرا کیسی ہے......؟'' لیکن فون خاموش تھا' میں نے فون رکھا اور بلک بلک کر رونے لگا' میرے رونے کی آواز سن کر اماں خیراں کمرے میں آگئیں اور پوچھنے لگی۔

''اماں! آپ صفدر کو جاکر بلا لائیں۔'' میں نے انہیں صرف اتنا کہا پھر سائٹ پر فون کرکے ساری صورت حال بتائی اور کہا کہ ''میں فوری کراچی جارہا ہے۔'' ظاہر ہے اس صورت حال میں کون مجھے روک سکتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں سائٹ سے چند لوگ اور صفدر وغیرہ آگئے' میرے جانے کے لیے ٹکٹ کا انتظام وغیرہ کیا اور تقریباً دو تین گھنٹوں بعد میں کراچی کے لیے روانہ ہوگیا' راستے میں' میں بار بار فون کرتا رہا لیکن میرا فون کسی نے بھی ریسیو نہیں کیا' میرا دل بہت گھبرا رہا تھا' مجھے کسی کی خیریت نہیں مل رہی تھی' مجھے سب سے زیادہ ٹینشن اس بات کی تھی کہ ابو بھی میرا فون کیوں ریسیو نہیں کررہے' سارے راستے میں حرا اور سہیل کی صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا اور اپنے آپ کو خود ہی تسلیاں دیتا رہا کہ سب ٹھیک ہوگا لیکن کچھ ٹھیک نہیں تھا میں نے جب اپنے گھر کی جانب دیکھا تو دور سے ہی مجھے اپنے گھر کے دروازے پر لوگوں کا رش دکھائی دیا' مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا گیا اور میں وہیں بیٹھ گیا' تب ہی کسی کی نگاہ میرے اوپر پڑگئی اور چند لوگ تیزی سے میری جانب بڑھے اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

''کیا ہوا ہے......؟'' میں نے بمشکل پوچھا۔

''آپ چلیں تو سہی...... گھر چل کر دیکھ لیجیے گا......'' شبیر صاحب جو میرے برابر والے گھر میں رہتے تھے انہوں نے مجھے کندھوں سے تھام کر سہارا دیتے ہوئے کہا پھر اپنے سینے سے لگا لیا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے وہاں سے گھر تک کا فاصلہ کس طرح طے کیا' بس اتنا یاد ہے کہ چارپائی پر سفید کفن میں لپٹی میرے سہیل کی میت رکھی تھی اور امی ابو اس کی پٹی سے لگے نڈھال بیٹھے تھے۔

اس شدید ایکسیڈنٹ میں میرا سہیل ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ گیا۔ حرا بہت شدید زخمی تھی' کار حرا چلا رہی تھی اسے ڈرائیونگ کرنے کا بہت شوق تھا' وہ سہیل کو لے کر اسے سائیکل دلانے جارہی تھی کہ ایک آئل ٹینکر نے اسے ٹکر ماری' ٹکر سائڈ سے لگی تھی' جدھر سہیل بیٹھا تھا۔ وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا' البتہ حرا شدید زخمی تھی' میرا دوسرا بچہ جس کے دنیا میں آنے

لیڈر اور عوام

ہوش سنبھالنے سے آج تک جب کہ نصف صدی سے بھی زیادہ عمر گزار چکے ہیں یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ ہمارے لیڈر عوام سے آخر کیا چاہتے ہیں؟ یا تو یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے یا ہماری سمجھ اس بات سے بالاتر ہے اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ ہمارے پیارے ملک پاکستان کے عوام خصوصاً مزدور طبقہ کے لوگوں کو کتنے مسائل کا سامنے ہے تو ہم کہیں گے کہ پاکستان میں کتنے سیاست دان ہیں؟ ہر سیاست دان کا اپنا ایک مسئلہ ہے اگر کوئی لیڈر یہ کہے کہ قوم کے حالات دیکھ کر میرے دل میں بہت ہی زیادہ درد ہوتا ہے تو سمجھ لیں ضرور اسے کوئی ہارٹ پرابلم ہے۔ لیڈر اور عوام میں اتنا گہرا اور انمٹ تعلق ہے جتنا سیاست اور جھوٹ میں۔ تمام لیڈر کرسی حاصل کرنے کے لیے مساوات کا درس جوش اور جذبے کے ساتھ دیتے ہیں۔ مساوات کا مطلب ہے تمام عوام کے لیے دولت اور وسائل کی یکساں عدم فراہمی۔ عوام اور سیاست دان دونوں اپنی اپنی جگہ متحد اور مضبوط ہیں۔ اگر عوام یکجہتی اور اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف سیاست دان بھی عدم اتحاد کی کوشش میں متحد و منضبط ہیں۔

اگر ہمارے سیاست دان سیاست سے کنارہ کش ہو جائیں تو عوام سکھ کا سانس لیں۔ اس لحاظ سے ہر سیاست دان مرتے وقت عوام پر احسان کر جاتا ہے اس لیے کہ موت کے بعد وہ سیاست سے ریٹائر ہوجاتا ہے کیونکہ زندگی میں تو ریٹائرمنٹ لینا اس کے لیے ممکن نہیں اور اسی سیاسی جوڑ توڑ کا سماں ہمارے پیارے ملک پاکستان کے ہر سرکاری ادارے و محکموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خوشحالی کے کام کم اور بدحالی کے زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ سب کا کیا خیال ہے۔ عزیزان پاکستان

(عمیر احمد، اسلام آباد)

کی خبر مجھے حرا نے دی تھی وہ پھول بھی کھلنے سے پہلے مرجھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اب حرا کبھی ماں نہیں بن سکے گی' ڈاکٹرز نے اس کے جسم کا وہ حصہ ہی نکال پھینکا تھا جسے کوکھ کہتے ہیں کیوں کہ حرا کی جان بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

پورے دو ماہ حرا اسپتال میں رہی پھر وہ گھر آ گئی۔ اس حالت میں کہ اس کی دونوں ٹانگوں میں جان ہی نہیں تھی۔ اس کی ٹانگیں بے کار ہو چکی تھیں' مجھے نہیں پتا کہ یہ دو ماہ کس طرح سے گزرے' گھر اور اسپتال...... صبح شام میری زندگی میں یہی کچھ رہ گیا تھا۔

گھر میں قبرستان کی سی خاموشی رہنے لگی' امی ابو نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد میں نے پھر سے آفس جوائن کرلیا۔ حرا کی طبیعت بھی اب بہتر تھی' وہ بھی سارا دن خاموش بستر پر لیٹی رہتی۔ میرا دل بھی اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا۔ بستر پر ایک زندہ لاش کی مانند پڑی رہتی تھی' ہم میں اگر بات چیت ہوتی بھی تو ہماری گفتگو کا موضوع سہیل کی یادیں ہوتا تھا۔ ہم دیر تک اس کی باتیں کرتے رہتے تھے' ڈاکٹرز کہتے تھے کہ حرا کی ٹانگوں کا آپریشن بہت اچھا ہوا تھا' ہڈیاں بھی جڑ چکی ہیں پھر یہ چلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں اور جب میں حرا کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کرتا تو وہ پوری جان سے لرزنے لگتی' رونے لگتی اور کہتی کہ میں نہیں چل سکتی' میں نے نا جانے کون کون سے تیلوں سے اس کی ٹانگوں پر مالش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا پھر ڈاکٹرز نے کہا کہ انہوں نے اس ایکسیڈنٹ کی بدولت بہت بڑا صدمہ اٹھایا ہے نہ صرف وہ اپنی مامتا سے محروم ہو گئیں' بلکہ ہمیشہ کے لیے ماں بننے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو گئی ہیں اور اس صدمے کے سبب یہ چل نہیں پاتیں۔

۞......☆......۞

پورا سال بیت گیا پھر وہی دن آ گیا وہ سہیل کی سالگرہ کا دن تھا' اس دن حرا صبح سے رو رہی تھی' میں بھی کتنی بار اس کے ساتھ رویا تھا۔ اب تو امی دبی دبی زبان سے مجھ سے کہنے لگی تھیں کہ میں دوسری شادی کرلوں کیوں کہ حرا تو ایک زندہ لاش ہے اور ایک زندہ لاش کے ساتھ رہتے ہوئے انسان کس طرح زندگی کی خوشیاں حاصل کرسکتا ہے لیکن میں انکار کردیتا مجھے حرا سے اب بھی بہت محبت تھی' اس روز جب سہیل کی برسی تھی تو حرا نے مجھ سے روتے ہوئے کہا۔

"راحیل! میں آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں اور آپ کو اس طرح زندگی کو برباد کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی' بہتر یہی ہوگا کہ آپ دوسری شادی کرلیں اور ازدواجی خوشیاں حاصل کریں۔ آپ کو اولاد کی ضرورت بھی ہے۔"

"کیا تم کسی دوسری عورت کو میری زندگی میں برداشت کرسکو گی' کسی اور کی اولاد کو ایک ماں کی نظر سے دیکھ سکو گی؟" میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں راحیل! کیوں کہ میں آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں اور آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"یہ تم ابھی بھی کہہ رہی ہو لیکن بعد میں تمہیں بہت تکلیف ہوگی۔" میں نے اداس لہجے میں کہا۔

"آپ کو تو عورت کی محبت کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ عورت ایک بار جس کو اپنے دل میں بسا لے اس کی خوشی کی خاطر وہ کچھ بھی کرگزرتی ہے کچھ بھی......!" حرا نے محبت سے میرے سینے میں منہ چھپا کر کہا اور اس کے کہنے پر اتنے دنوں کے بعد اچانک ہی راجی کا ہیولہ میری آنکھوں کے سامنے

آ گیا۔ میں اپنے مصائب میں گرفتار ہو کر اس کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا' اس روز کے بعد میں نے وہ پروجیکٹ ہی چھوڑ دیا تھا۔

راجی کا خیال آتے ہی وہ ساری باتیں وہ رات میری آنکھوں کے سامنے آ گئی اور میں تیزی کے ساتھ حرا کو اپنے سے جدا کر کے اٹھ کے کھڑا ہو گیا اور کمرے میں بے قراری سے ٹہلنے لگا' بہت ساری ندامت اچانک ہی امڈ آئی اور سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا' آج مجھے ایک بات کا اور شدت کے ساتھ احساس ہو رہا تھا کہ رضامندی (نکاح) کے بغیر ایک غیر عورت کے ساتھ اختلاط کیا' زنا کیا اور اللہ کا مجرم ٹھہرا' گناہ جانتے ہوئے بھی میں اس کا مرتکب ہوا' شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی یہ سزا دی ہے' میری اکلوتی اولاد بھی اللہ تعالیٰ نے واپس لے لی' میری بیوی اپاہج ہو گئی میں زندگی کی ہر خوشی سے محروم ہو گیا اور پلٹ کر اس کی خبر بھی نہ لی کہ میرے اتنے بڑے ظلم کے بعد اس پر کیا گزری۔

میں حرا کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا اور میرے منہ سے صرف یہی الفاظ نکل رہے تھے کہ حرا مجھے معاف کردو......

"کیا ہو گیا ہے آپ کو...... آپ مجھ سے کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی ہے کہ میرا وجود آپ کے لیے وبال بن گیا ہے۔" میرے اس طرح بلک بلک کر رونے سے حرا بھی رونے لگی۔

پھر تھوڑا سا رونے کے بعد میں نے اپنے آنسو صاف کیے' میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں حرا کو آج ہر بات بتا دوں گا۔ اسے بتا دوں گا کہ میں رحم کرنے اور محبت کرنے کے قابل نہیں ہوں' میں تو زانی ہوں' میں تو اللہ کا مجرم ہوں اور اس کی سزا مجھے دنیا اور آخرت دونوں جگہ بھگتنی ہے' پھر میں نے کہا۔

"حرا! میں تمہیں ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"آپ کہیے میں سن رہی ہوں۔" حرا نے محبت سے اپنے دوپٹے کے پلو سے میرا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر میں نے حرا کو ساری بات بتادی' کچھ بھی نہیں چھپایا' میری باتیں سن کر حرا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر بولی۔

"اگر یہ حقیقت ہے کہ آپ سے یہ قبیح فعل انجانے میں ہوا ہے اور آپ کی رضا اللہ کی حدود کو توڑنے کی نہیں تھی تو آپ اتنے گناہ گار نہیں ہیں لیکن گناہ تو گناہ ہے چاہے جان بوجھ کر کیا جائے' چاہے ان جانے میں ہو جائے لیکن یہ میرے رب کی رحمت ہے کہ اس نے اپنے ہر بندے کے لیے چاہے وہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو' توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے' جب بندہ اپنے گناہ پر حقیقی طور پر شرمسار ہوتا ہے اور اللہ سے آئندہ ایسی

اقوال زریں

⌘ علم حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)۔

⌘ خوب صورتی کپڑوں سے نہیں علم و ادب سے حاصل ہوتی ہے۔ (حضرت علیؓ)

⌘ جھوٹا سب سے پہلے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ (حضرت امام حسینؓ)

⌘ کھاؤ خیرات کرو۔ اور پہنو اس حد تک کہ فضول خرچی اور تکبر نہ کرو۔ (حدیث نبویؐ)

⌘ بعض اوقات جرم معاف کرنا مجرم کو خطرناک بنا دیتا ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

(اقصیٰ چیمہ' چنیوٹ)

غلطی نہ کرنے کا عہد کرتا ہے تو ربّ غفور الرحیم اس کے گناہ کو اس طرح سے معاف فرما دیتا ہے جیسے کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں اور ایک بات میں بتاؤں آپ کو راحیل کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اللہ کا نہ تو دل میں خوف رکھتے ہیں اور نہ ہی محبت اور دن رات گناہوں میں بسر کرتے ہیں تو اللہ پاک ایسے لوگوں کی رسّی دراز کیے جاتا ہے وہ ان کی ذراسی غلطی پر انہیں نہیں پکڑتا لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنے دلوں میں اللہ کی محبت رکھتے ہیں اور ہر لمحے اپنے آپ کو اس کی خشیت میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں وہ اگر ذراسی بھی لغزش میں مبتلا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معمولی سزا دے کر فوراً خبردار کر دیتا ہے تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنے گناہ میں آگے نہ بڑھتے چلے جائیں۔

آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے آپ سے بشری تقاضے کے تحت ایک گناہ سرزد ہوا اور اللہ نے آپ کو فوراً خبردار کر دیا اور بہت معمولی سزا دی ہے' ایک بات اور یاد رکھیے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کو سزا نہیں دیتا انہیں آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے تو راحیل......'' اس نے ایک گہری سانس لی اور ذرا دیر کو رک گئی پھر بولی۔ ''آپ صرف اتنا کریں کہ سچے دل سے اپنے ربّ کے آگے سجدے میں اپنا سر رکھ کر گڑگڑا کر خوب آہ وزاری کریں۔ اس سے التجا کریں کہ وہ آپ کے انجانے میں کیے گئے گناہ کو معاف کر دے اور اس سے درخواست کریں کہ وہ آپ کو شیطان کے شر سے اپنی پناہ میں لے لے اور پھر دوسرا کام یہ کریں کہ راجی کے پاس واپس جائیں' اس سے بھی کہیں کہ وہ بھی اللہ سے معافی مانگے پھر اس بے سہارا لڑکی کا سہارا بن جائیں' اس سے نکاح کر لیں اور اسے اپنے گھر لے آئیں' ہو سکتا ہے کہ بے خبری کے اس گناہ کو ربّ کریم معاف کر دے۔''

میں حیران ہو کر اپنی نیک سیرت صابر و شاکر بیوی کو دیکھ رہا تھا' اس نے نہ تو مجھ پر ملامت کی نہ ناراض ہوئی بلکہ میری بات کو سمجھ کر اس کا یقین کیا اور مجھے ایک بہترین مشورہ دیا۔

میں اسی وقت اٹھا اور اٹھ کر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی اور خوب گڑگڑا کر اللہ سے معافی مانگی' میں سجدے میں سر رکھ کر دیر تک ندامت کے آنسو بہاتا رہا پھر جیسے میرے بے قرار دل کو قرار آ گیا۔ میں نے حرا کا مشورہ قبول کر لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ میں راجی کو اپنے نکاح میں لے لوں گا' نماز سے فارغ ہو کر میں حرا کے پاس واپس آیا تو وہ جاگ رہی تھی' مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی۔

''آج پہلی مرتبہ میں آپ کے چہرے پر اطمینان دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے آپ کا دل بھی ہلکا ہو گیا ہے' میں آپ کو ایک حدیث سناتی ہوں......:

ترجمہ: انس بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''بندہ گناہ کرنے کے بعد معافی مانگنے کے لیے جب اللہ کی طرف پلٹتا ہے تو اللہ کو اپنے بندے کے پلٹنے پر اس شخص کے مقابلے میں زیادہ خوشی ہوتی ہے جس نے اپنی اونٹنی جس پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا' کسی بیاباں میں کھو گئی ہو پھر اس نے اچانک اسے پالیا ہو تو وہ اس اونٹ کو پا کر جتنا خوش ہوتا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا' ایسے ہی آدمی کے توبہ کرنے پر اللہ خوش ہوتا ہے بلکہ اللہ کی خوشی اس کے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے کیوں کہ وہ رحم و کرم کا سرچشمہ ہے۔''

(بخاری' مسلم)

حرا کے منہ سے اتنی پیاری حدیث سن کر میرا دل بہت خوش ہوا اور میں نے اسے محبت سے گلے لگالیا۔



دوسرے دن میں نے آفس سے تین دن کی چھٹیاں لیں اور دریا آباد روانہ ہو گیا۔ وہاں پل بننے کا کام جاری تھا' اس لیے میں سائٹ پر چلا گیا۔ وہاں لوگ مجھے پہچانتے تھے' اس لیے میں لوگوں سے ملنے اور خاص طور پر راجی سے ملنے کے لیے آبادی کی جانب آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ راجی مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہو گی اور جب میں اسے یہ بتاؤں گا کہ میں اس سے شادی کرنے آیا ہوں تو وہ پاگل لڑکی واقعی خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔

میری ملاقات صفدر سے ہوئی تو وہ سہیل کی موت اور حرا کے حادثے پر افسوس کا اظہار کرنے لگا' میرے جانے کے بعد یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی تھی اور بھی دوسرے لوگ تعزیت کے لیے آئے مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی' جسے میری نگاہیں تلاش کر رہی تھیں۔ بالآخر میں نے صفدر سے اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''یار صفدر! راجی کہیں دکھائی نہیں دے رہی' کیا وہ اب گھر میں بیٹھنے لگی ہے؟''

''راجی اب کہاں ہے صاحب......!'' صفدر نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟ کہاں گئی وہ؟'' میں بُری طرح چونک گیا۔

''آپ تو اچانک ہی چلے گئے تھے اور اپنی گھر والی کی وجہ سے یہاں واپس لوٹ کر ہی نہیں آئے لیکن اللہ ہی جانے کس نے اس غریب پر ظلم ڈھایا......''

''ظلم...... یہ کیا کہہ رہے ہو' کیا ہوا اس کے ساتھ؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''وہ پیٹ سے ہو گئی تھی' سارے گاؤں والوں نے اس پر تھو تھو کی' بہت لعنت ملامت کی' بہت پوچھا کہ

اس نے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے' پیار سے بھی پوچھا کہ وہ اس کا نام بتادے تاکہ اسے انصاف دلایا جاسکے اور اس کا نکاح اس کے ساتھ کردیا جائے لیکن اس نے چپ سادھ رکھی تھی' اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ بس خاموشی سے اپنے گھر میں بند ہوکر بیٹھ گئی' کئی کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ جب بھوک سے نڈھال ہونے لگتی تو کسی کے گھر سے جاکر کھانا مانگ لیتی اور کہتی ''میں اپنے لیے روٹی نہیں مانگتی' میرا بچہ بھوک سے بلبلا رہا ہے' اللہ کے نام پر روٹی دے دو......'' لوگ حقارت اور نفرت سے کسی کتے کی طرح اس کے آگے روٹی پھینک دیتے جسے وہ اٹھا کر اپنے گھر چلی جاتی۔ پھر ایک دن جب وہ گھر سے باہر نکلی تو اس کی گود میں ایک بچہ تھا' جو ایک چادر میں لپٹا ہوا تھا وہ خود بہت بیمار' کمزور اور لاغر ہوچکی تھی' کہنے لگی۔ ''کوئی ہے اللہ کا نیک دل بندہ جو اس کو پال لے......!'' لیکن سب نے اسے نفرت اور حقارت سے ٹھکرادیا اور کہا کہ وہ اس بچے کو لے کر گاؤں سے باہر نکل جائے' کوئی اس کے غلیظ وجود کو گاؤں میں برداشت نہیں کرسکتا۔ پھر صاحب ایک رات گاؤں کے مکھیا کی حویلی کا دروازہ کسی نے زور زور سے پیٹا' دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک بچہ دہلیز پر پڑا تھا۔ مکھیا نے اسے اس چادر سے پہچانا کہ یہ راجی کا بچہ ہے' راجی کو بہت تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی' دوسری صبح اس کی لاش دریا سے برآمد ہوئی۔

اب مسئلہ اس کے بچے کا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے' کوئی اسے گود لینے کو تیار نہیں تھا' تب ہی ہمارے گاؤں کی ایک بھکارن جس کے اپنے بھی ڈھیر سارے بچے ہیں' اس کو سینے سے لگا کر لے گئی۔ دو تین لوگوں نے راجی کے کفن دفن کا انتظام کیا' تو صاب یہ کہانی تھی اس راجی کی۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ وہ تو بہت تیز و طرار لڑکی تھی' اپنی جانب میلی آنکھ سے دیکھنے پر بھی ڈنڈے سے پٹائی لگاتی تھی آخر وہ کس طرح کسی کے ہاتھوں برباد ہوگئی......'' صفدر نے ساری کہانی سنانے کے بعد کہا۔

''بعض لوگوں کے نصیب میں اللہ تعالیٰ رسوائی لکھ ہی دیتا ہے' راجی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے' تم مجھے اس کی قبر دکھادو' میں اس پر فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بہت ضبط کرکے اپنے آنسو روک رکھے تھے' بمشکل کہہ سکا۔

''صاحب آپ......!'' صفدر نے چونک کر میری جانب دیکھا اور دیکھتا ہی رہا' میں نے ندامت سے سر جھکا لیا تو صفدر بولا۔ ''شاید اسے کسی سے محبت ہوگئی ہوگی...... ہیں ناں صاحب......!'' اس نے بغور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید......!'' میں نے حلق میں اٹکنے والے آنسوؤں کا گولا اپنے حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

''آپ راجی کا بچہ گود لے لیں صاحب...... میرے خیال میں سب سے پہلا حق اس پر آپ کا ہے......'' صفدر نے بدستور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' میں نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے پوچھا۔

''میرا کوئی خاص مطلب نہیں ہے صاحب! جب مرنے والی نے ہی اس کا پردہ رکھا تو میں کیا بولوں' میں سب سے یہی کہوں گا کہ آپ بے اولاد ہیں اس لیے راجی کا بچہ گود لینا چاہتے ہیں۔'' صفدر نے سادگی سے کہا اور میں صفدر کے گلے لگ کر رو پڑا۔ کیوں کہ میں سمجھ گیا تھا کہ صفدر جان گیا تھا کہ راجی پر ظلم کرنے والا کون ہے۔

''آیئے میں آپ کو راجی کی قبر دکھادوں۔ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے والے پہلے شخص آپ ہوں گے

کیوں کہ آج تک کوئی اس کی قبر پر نہیں گیا' کسی نے بدکار جان کر اس کی مغفرت کی دعا نہیں کی۔'' صفدر نے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر گاؤں کے سرے پر بنے قبرستان کی جانب چل دیا' وہاں ساری قبروں سے الگ تھلگ ایک کچی قبر بنی تھی' صفدر نے بتایا کہ یہی راجی کی قبر ہے۔

میں نے راجی کی قبر پر فاتحہ پڑھی' اس کی مغفرت کی خوب دعا کی اور اس سے معافی بھی مانگی پھر صفدر مجھے اپنے ساتھ اس بھکارن کی کٹیا پر لے گیا' جو میرے بچے کو لے گئی تھی۔

صفدر کے آواز دینے پر وہ باہر آئی تو صفدر نے کہا کہ ''راجی کا بچہ انہیں دے دو' یہ بے اولاد ہیں اس بچے کی اچھی طرح پرورش کریں گے۔''

وہ بھکارن تھوڑی دیر تک تو مجھے دیکھتی رہی' نہ جانے میرے چہرے پر وہ کیا کھوج رہی تھی پھر اندر جاکر ایک کمزور سے بچے کو لے آئی' ایک میلے کچیلے بنیان میں وہ ملبوس تھا' اس کے پاس سے شدید بدبو آرہی تھی۔

بچہ میری گود میں دینے سے پہلے اس نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیا اور بولی۔

''میں تیری بیوی کی سونی گود آباد کررہی ہوں' اس خوشی میں کچھ دے گا نہیں......!''

میں نے جیب سے پرس نکال کر ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے خوشی سے بچہ میرے حوالے کردیا۔

میں نے گود میں لے کر اس میلے کچیلے کمزور سے وجود کو اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ میرے سہیل کا بھائی تھا اور بالکل سہیل کی شکل تھا' میری آنکھوں سے اتنے آنسو بہے کہ اس کے چہرے کا سارا میل ڈھل گیا اور اس کی صاف ستھری شکل نکل آئی۔

میں بچے کو لے کر صفدر کے گھر آیا' صفدر کی بیوی نے اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرا کردیا' میں صفدر کا شکریہ ادا کرکے چلنے لگا تو صفدر نے کہا۔

''صاحب! اللہ نے شاید اسے دنیا میں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ اس نے آپ کا بیٹا واپس لے لیا تھا......!''

گاؤں والے میرے بڑے پن کی تعریفیں کررہے تھے لیکن یہ حقیقت تو میں جانتا تھا کہ میں ''بڑا انسان'' نہیں بلکہ شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اس نے میری توبہ قبول کرلی ہے۔ آج روحیل چھ سال کا ہوچکا ہے اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حرا نے روحیل کے ساتھ ساتھ چلنا سیکھ لیا ہے' وہ اب چلنے لگی ہے اور روحیل کو ماں بن کر پال رہی ہے میرے رب نے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا ہے۔

''اور جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا اپنے حق میں ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش مانگے تو اللہ کو بخشنے والا (اور) مہربان پائے گا۔'' سورۃ النساء آیت 110

بے شک میں نے اپنے رب کو بہت مہربان اور کرم کرنے والا پایا ہے۔

⌘

روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

آصف ہارون......کوہاٹ

ج:۔نماز کی پابندی کریں۔ بعد نمازِ فجر 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پورے جسم پر پھونک ماریں۔

ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 9'9 مرتبہ پڑھیں۔ آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ

مریم شاہین......راولپنڈی

ج:۔عشاء کی نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ ہاتھوں پر دم کر کے سر اور پورے جسم پر پھیرا کریں۔

امتحان میں کامیابی کے لیے ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ القریش پڑھا کریں۔ دعا بھی کیا کریں۔

سر درد اور آنکھوں میں پانی آنا پڑھتے وقت ''کچا نزلہ'' کی نشانی ہے۔ اس کا علاج کروائیں۔

شاداب......میر پور خاص

ج:۔جائیداد کے لیے سورۃ یٰسین کی آیت نمبر 82۔313 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

رات کے وقت آیت کے معنی ذہن میں رکھیں اور نیت اچھے کام کی ہو۔

نماز کی پابندی کریں' روزانہ استغفار اور درود شریف کی 1 تسبیح کریں۔

جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کر دیں۔ 11'11 مرتبہ اول وآخر درود شریف۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

رشتہ کے لیے:۔سورۃ الفرقان آیت نمبر 7074 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف بعد نماز فجر۔

جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں۔

سندس گلزار احمد......سرگودھا

ج:۔والدہ سیم پھلی کا سالن بنا کر کھائیں افاقہ ہوگا۔ آپ کی والدہ کرلیں۔

والد کا مسئلہ:۔ بیان نہیں کیا۔ جواب دیے گئے مسئلے کے بارے میں دوبارہ پوچھنا ہو تو جواب ساتھ لگایا کریں۔

والد کا مسئلہ:۔ بیان نہیں کیا۔ جواب دیے گئے مسئلے کے بارے میں دوبارہ پوچھنا ہو تو جواب ساتھ لگایا کریں۔

سندس......سرگودھا

ج:۔رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

سورۃ اخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 9'9 مرتبہ ہر نماز کے بعد اپنے اوپر دم بھی کیا کریں۔

جویریہ......لاہور

ج:۔''یا قوی'' ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سر پہ ہاتھ رکھ کر ''یا فتاح'' 1 تسبیح روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک۔ دعا بھی کریں۔

ک۔گ......اورنگی ٹاؤن

ج:۔بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف اللہ سے معافی بھی مانگیں اور اچھے اور جلد رشتہ کے لیے دعا بھی کریں۔ مسئلہ جلد حل ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ

ط۔ن......گجرات

ج:۔سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 11'11 بار پڑھ کر ڈر ختم ہونے کا تصور کر کے پانی پہ پھونک مار کر پیا کریں۔ 3 ماہ تک۔

''یا واحد'' 1000 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ش......ساہیوال

ج:۔''اللھم انا نجعلک فی نحور ھم و نعوذ بک من شرور ھم''

تصور ان کو رکھ کر پڑھیں کہ ان کی نحوست اور شر سے نجات دے اور جو میرے حق میں بہتر ہو اللہ میاں وہ کردیں۔ آمین

صائمہ......فیصل آباد

ج: مسئلہ نمبر 1:۔ سورۃ طٰحٰہ کی شروع کی 5 آیات ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ پڑھ کر دم کریں۔

نمبر 2:۔ فجر اور عشاء میں 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم بھی کریں اور پانی بھی پلائیں دم کیا ہوا۔

نمبر 3:۔ رات کو جب سو جائے سرہانے کھڑے ہو کر 1 تسبیح ''سورۃ العصر'' کی پڑھیں اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اتنی آواز میں کہ اگر وہ جاگ رہی ہو تو سن سکے۔

نیت:۔ راہِ راست پہ آرہی ہے۔

رشتے کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ بعد نماز فجر اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ گھر کا کوئی بھی فرد پڑھ لے۔

خدیجہ......سرگودھا

ج:۔''یا سمیع'' 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔ نام کے معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں تصور بھی کریں ٹھیک ہونے کا۔

ساجد......شورکوٹ

ج:۔جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کر دیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

''لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف 1000 مرتبہ پڑھ کر پانی پہ دم کریں۔ زیادہ سے زیادہ وہ پانی پلائیں پانی اس میں ملاتے بھی رہیں۔

رشتہ کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

عزیز فاطمہ......لانڈھی' کراچی

ج:۔بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یٰسین 1 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اپنے تمام مسائل کے لیے دعا کریں۔

شہنیلا توصیف......فیصل آباد

ج:۔رشتہ کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

1 مرتبہ پورا کلمہ پھر ''لا الہ الا اللہ'' 99 مرتبہ پھر محمد رسول اللہ اس طرح 3 تسبیح کرنی ہیں۔ بعد نماز عشاء۔

بعد نماز فجر سورۃ یٰسین اور سورۃ المزمل کا معمول بنالیں۔ ان شاء اللہ کاموں میں رکاوٹیں نہیں آئیں گی۔

جمیل......ساہیول

ج:۔بعد نماز عشاء سورۃ عبس 23 پارہ 3 مرتبہ پڑھیں بغیر بسم اللہ۔ درود شریف کے ساتھ۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 70.74 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ وظیفہ خلوص اور یکسوئی کے ساتھ کریں ان شاء اللہ جلد خوش خبری ملے گی۔

نادیہ......گجرات

ج:۔ وظیفہ جاری رکھیں۔ صدقہ بھی دیں (مرغی/بکرا) نیت جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہوجائے۔

مہوش ''یا فتاح'' روز 1 تسبیح کریں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

آمنہ اعوان......حیدرآباد

ج:۔بچیوں کے لیے:۔سورۃ الفاتحہ' سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس' 7'7 مرتبہ پڑھ کر دم کیا کریں صبح وشام۔

''یا عدل'' 313 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ کیس کے لیے۔

ہر نماز کے بعد ''یا ولی'' 41 مرتبہ پڑھیں۔ شوہر کے دل میں اپنی اور بچیوں کی الفت کا تصور رکھ کر۔

نادیہ طاہر......گوجرہ

ج:۔''یا رئوف'' 286 بار ہر نماز کے بعد پڑھ کر

سب کے راضی ہونے کی دعا مانگیں۔3 ماہ تک۔

کمال فاطمہ......نیو کراچی

ج:۔"یا متعالی" ہر فرض نماز کے بعد 151 بار ورد کریں اور دعا کریں۔جلد کامیابی ہوگی۔

حنا ریاض......لاہور

ج:۔آپ نماز کی پابندی کریں۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

نیت اور دعا یہ ہو کہ جہاں میرے حق میں بہتر رشتا ہو وہاں ہو۔جلد از جلد۔ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔وظیفہ پابندی اور خلوص کے ساتھ کریں۔

دوست نما دشمنوں سے بچیں عقل استعمال کریں۔

نسرین کوثر......لاہور

ج:۔تارا میرا تیل (کڑوا تیل) اس پر 11 مرتبہ سورۃ عبس (23واں پارہ) پڑھ کر دم کریں روزانہ وہ تیل سر پر لگائیں۔

ثمینہ ارشاد......رحیم یار خان

ج:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پھر دعا بھی کریں ان شاء اللہ مسئلہ جلد ہو جائے گا۔

شائستہ غلام محمد......میلسی

ج:۔"یا ولی یا والی" 101 بار پڑھیں ہر نماز کے بعد دعا مانگیں۔

صبا اقبال......گجرات

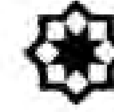
ج:۔جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ المزمل (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیں چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔

رشتے کے لیے:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

ث۔ش......کھاریاں

ج:۔ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔اپنے رشتے کے لیے۔

"یا فتاح" روزانہ 1 تسبیح نتیجہ آنے تک۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اگست ۲۰۱۲ء

نام......والدہ کا نام......گھر کا مکمل پتا......

......

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پذیر ہیں......

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

حمد باری تعالیٰ

تو ہے کونین کا مالک میرے اللہ کیا لکھوں!
میں حیران ہوں کہ کن الفاظ میں حمد وثنا لکھوں
زمین یا آسمان ہر شے پہ تیری حکمرانی ہے
تجھے قیوم مولا کبریا رب العلیٰ لکھوں
مجھے روز قیامت تیری بخشش پر بھروسہ ہے
ادھر اپنے گناہوں پر بھی شرمندہ ہوں کیا لکھوں
تو ناداروں کا داتا بے سہاروں کا سہارا
مقدس ذات کو ٹوٹے دلوں کا آسرا لکھوں
تیرا احسان کیا کم ہے محمدؐ سا نبی بخشا
میں تیرے بعد اپنے دل پہ نام مصطفیٰ لکھوں
تری شان کریمی کے میں سو بار صدقے جاؤں
جو ہیں احسان مجھ نا چیز پر لاانتہا لکھوں
فقیر صابر لنگاہ بے نوا کے حال پر اپنا کرم فرما
میں کس کلک شکستہ سے یہ حرف مدعا لکھوں

(غلام سکینہ صابر لنگاہ......خانیوال)

نظم

آکاس بیل
چاہتے جانا کتنا خوش کن
دل فریب احساس
کہ
ہر طرف پھول کھل اٹھیں
شگوفے چٹکیں
بہاریں ہر طرف رقصاں ہو جاتی ہیں
یہی چاہت
بے رخی میں ڈھل جائے تو
موسم زرد رتوں کی صورت ہو جاتا ہے
جس میں پھول نہیں کھلتے
شگوفے نہیں چٹکتے
بلکہ
زرد پھولوں کی
آکاس بیلیں اگتی ہیں

ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل

اک عشق نگر کی وادی تھی
جہاں پیار کی ندیا بہتی تھی
کچھ دل والے بھی رہتے تھے
جو پیار کی باتیں کرتے تھے
جب بہار کا موسم آتا تھا
اور پھول پیار کے کھلتے تھے
مست نشیلی شاموں میں
پیار سے دو دل ملتے تھے
اک روز وہ بستی اجڑ گئی
اور پیار کی بستی بکھر گئی
پھر ہر اک دل کو سوگ لگا
اور جیون بھر کا روگ لگا
دیوانے پھرتے رہتے ہیں
اور ہر اک سے وہ کہتے ہیں
اقرار کسی سے نہ کرنا
ارے پیار کسی سے نہ کرنا

غلام عباس جتوئی......محمد پور

غزل

وہ ہر کسی پہ کرنا اعتبار دل کا
ٹوٹنے پر نہ ملنا غم گسار دل کا
بھلا کر عہد و پیاں سارے اس نے
کیا عہد رفتہ میں شمار دل کا

ویرانیِ چمن پر ہیں اشک بار سبھی
دیکھا نہ کسی نے اجڑنا دیار دل کا
یوں تو پھول سجا لیے میں نے زلفوں میں
رہا مگر ساتھ اپنے وہی غبار دل کا
عین مسکراتی ہے فقط یہ چھپانے کو
حال نہ پوچھے کوئی اشک بار دل کا
عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

مہرباں

اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میرے حالِ دل کی وہ قدر کرتا
میری آنکھوں کی نمی کو وہ پوروں میں سمو لیتا
میرے جسم و جاں کو وہ یوں نہ دربدر کرتا
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میرے ساتھ ساتھ چلتا
مجھے اپنا بنانے میں اسے کوئی تعرض نہ ہوتا
اور میرا ہاتھ تھام کر وہ زمانے بھر سے لڑ جاتا
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میرے کپکپاتے ہونٹوں پہ یوں نہ لفظ بکھر جاتے
اجالا بن کے وہ میرے در و بام کو سجا دیتا
پھر اس کے بعد بے شک میرے خواب مر جاتے
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو زمانے بھر کی مشکلیں مجھے آسان ہو جاتیں
مجھے کوئی ٹھوکر نہ دکھ دیتی نہ غم دیتی
سبھی دکھ اور اذیتیں میری مہمان ہو جاتیں
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میرے دامن میں خوشیوں کی اک سوغات اتر آتی
کہکشائیں بکھر جاتیں میری منزل کے رستے میں
اور میرے گھر کے آنگن میں ستاروں کی بارات اتر آتی
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میرے جذبات کی وہ قدر کرتا
میرے تلخ رویے کی وجوہات تلاش کرتا
یا میری ذات کے اندھیروں میں وہ اک لمبا سفر کرتا
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو مجھے یوں چھوڑ کے نہ جاتا
پلٹ کے آتا یا رک جاتا
مگر بھنور کے سہارے یوں مار نہ جاتا
اگر وہ مہرباں ہوتا
تو میرے قلم سے یوں نہ کوئی لفظ ادا ہوتا
نہ میرے دل میں کوئی کدورت رہی ہوتی
مگر یہ سب تو تب ہوتا
"اگر وہ مہرباں ہوتا"
ناز سلوش ذشے...... میرپور، آزاد کشمیر

غزل

یہ اس کو کس نے کہا ہے
زندگی کا سفر مشکل سے کٹتا ہے
غریب کو گھر تک سے نکال دیا
اتنا ظالم نہ دیکھا نہ سنا ہے
اس شہر کی بے چراغ گلیوں میں
رہبر پھر رہزن بن کر چھپا ہے
چراغ آخر شب ہے کب تک جلتا
تیز چلی ہوا اور پھر بجھا ہے
حال دل دوسروں کا سنانے والوں
کبھی میرا بھی حال آ کے دیکھا ہے
چڑیوں کا تھا جس درخت پر بسیرا
اک ذرا سے طوفاں سے گرا ہے

وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

محبت کے خزانے ڈھونڈتا ہے
وہی بیتے زمانے ڈھونڈتا ہے
ذرا سی بات پر رونے کو آئے
دل ناداں بہانے ڈھونڈتا ہے
جو سب کے سامنے ٹھکرا گئے ہیں
انہیں پھر کیوں نہ جانے ڈھونڈتا ہے
کیا جن کو قفس میں قید تو نے
اب ان کے آشیانے ڈھونڈتا ہے
بچا لو دل کو خود تیر نظر سے
وہ ظالم تو نشانے ڈھونڈتا ہے
عجب ہے تُو بھی دورِ پُر فتن میں
مسرت کے ترانے ڈھونڈتا ہے
قمر ناداں کتاب زندگی میں
مروت کے ترانے ڈھونڈتا ہے
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں
آ نغمہ گر ہو چرخ میں لا آسمان کو
آ رقص کر زمین کو ڈال اضطراب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجِ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
اس صورت جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط و عود و رباب میں
پوچھی تھی ہم نے وجہ ملاقات فروعی
ایک عمر ہو گئی انہیں فکر جواب میں
لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے واجد
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں
ڈاکٹر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

غزل

وہ جو تیرے ساتھ رقیب سا ہے
وہی تو میرا نصیب سا ہے
چلتے تھے کبھی ہاتھوں میں ہاتھ لے کر
وہ جو اب کسی اور کا حبیب سا ہے
زخمی ہوا جب کبھی بھی من میرا
بس وہی شخص میرا طبیب سا ہے
فاصلے کتنے بھی کیوں نہ ہوں مگر
میرے تو ہر پل دل کے قریب سا ہے
بس ایک بات ہے اس میں نرالی سی
محبت میں کچھ کچھ غریب سا ہے
محمد اسحاق انجم...... کنگن پور

غزل

وہ پیار کا ثبوت دکھایا کرتا تھا
آنسو بہا کر ہمیں منایا کرتا تھا
یہ زندگی صرف تم سے وابستہ ہے
اکثر یہ بات ہمیں بتایا کرتا تھا
اس کی باتوں میں کچھ ایسا اثر تھا
میں بارش کے بنا بھیگ جایا کرتا تھا
سونے کی فرصت کسے تھی اب
وہ ساری رات ہمیں جگایا کرتا تھا
بے چینی جب حد سے بڑھ جاتی تھی
وہ جی بھر کے گلے لگایا کرتا تھا
وہ اتنی محبت کرنے والا بدل گیا
مجاہد جو ہر بات پر قسمیں کھایا کرتا تھا
مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور

غزل

اس نے کہا تجھ میں پہلے جیسی بات نہیں
میں نے کہا زندگی میں تیرا ساتھ نہیں

اس نے کہا اب بھی کسی کی آنکھوں میں ڈوب جاتے ہو
میں نے کہا کسی آنکھ میں وہ بات نہیں
اس نے کہا اتنا ٹوٹ کر کیوں چاہا مجھے
میں نے کہا انسان ہوں پتھر ذات نہیں
اس نے کہا اب بھول جاؤ مجھ کو
میں نے کہا تم میری محبت ہو کوئی خواب نہیں
نائمہ رحمان...... کراچی

اے اجنبی

تم کیوں افسردہ ہو
تمہیں کس بات کا غم ہے
تم روتے تڑپتے کیوں ہو
تمہیں کس کی کمی ہے
تمہارا تو ہم سفر بھی ہے
تم نے تو منزل بھی پالی ہے
تمہارے پاس محبتیں ہیں
چاہتیں ہیں
سنو اجنبی
ذرا ادھر اک پل کو دیکھو تو
میری اور
جس کا نہ کوئی اپنا ہے
نہ کوئی منزل ٹھکانہ
نہ کوئی چاہنے والا ہے
نہ کوئی ہمسفر ہے زندگی کا
لیکن میں افسردہ تو پھر بھی نہیں
میرے پاس تو صرف تنہائی ہے
جو میری جیون ساتھی ہے
اور مجھے جو چاہ ہے کسی کی
میرے لیے بس وہی کافی ہے
این شاہین...... واہ کینٹ

غزل

کسی کی نم آنکھوں میں خواب سجا کے ہم
پیار کی تعبیر ڈھونڈتے رہے ہیں ہم
جو کھو گیا تھا تیز ہواؤں میں تو پھر
رہ رہ کے اسے تلاش کرتے رہے ہیں ہم
دل کے آنگن میں اندھیرا ہے اک مدت سے
آنسوؤں کے چراغ جلاتے رہے ہیں ہم
اس کے پیار کی انتہا ہوگئی تھی آج
گزرے ہوئے ایام یاد دلاتے رہے ہیں ہم
ہجر میں جل کے اس کے یہ دل راکھ ہوا
اسے تنہائی میں قصۂ غم سناتے رہے ہیں ہم
اس کا کیا ذکر کریں بچھڑ گیا جو بہار میں جاوید
روٹھے ہوئے دوست کو مناتے رہے ہیں ہم
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

یہ دل پاگل دیوانہ ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
موسم بھی عاشقانہ ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
مجھے ہنستا یوں نہ دیکھو میرا دکھی فسانہ ہے
جو تم کو آج سنانا ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
نہ جانے کب ٹوٹ جائے یہ ربط اپنی سانسوں کا
ہمیں تو لوٹ جانا ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
مجھے یوں دیکھ کر تنہا نہ جینے دے گی دنیا
بڑا سنگدل زمانہ ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
یہ دنیا بہت ظالم ہے انہیں چھوڑ کر ہم کو
اک گھر اپنا بسانا ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
یہ قسم آج کھائی ہے چلی جائے جو جاں زیدی
ہمیں تم کو منانا ہے ابھی تم مجھ کو مت چھوڑو
زین شانی...... کراچی



ذوقِ آگہی

عفان احمد

ثابت قدم

"اے ایمان والو! دشمنوں کے مقابلے میں خود بھی ڈٹے رہو۔ اور دوسروں کو بھی ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہو۔ صرف اللہ سے ڈرو۔ امید ہے کہ تم کامیابی سے ہم کنار ہوگے۔"

(آل عمران:۳)

نجم الدین شیخ...... ساہیوال

مفلس کون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو سامان نہ ہو۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز روزہ اور زکواۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی کسی پر تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون بہایا ہوگا کسی کو مارا ہوگا تو اس کی نیکیوں میں کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا۔ اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور اس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"

(صحیح مسلم)

وسیم اختر...... راولپنڈی

روزے کے دس فائدے

(۱) اللہ تعالیٰ کا جلوہ نصیب ہوگا۔
(۲) روزہ دوزخ کی آگ سے ڈھال ہوگا۔
(۳) روزہ بخشش کا سبب ہوگا۔
(۴) روزے دار کو جنت کے دروازے ریان سے داخلہ ملے گا۔
(۵) روزہ قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔
(۶) روزہ دار کو عرش کے نیچے کھانا ملے گا۔
(۷) قبر کے حساب سے نجات ملے گی۔
(۸) روزہ دار اللہ کی خاص جزا کا مستحق ہوگا۔
(۹) قیامت کے دن روزہ شفاعت کا ذریعہ بنے گا۔
(۱۰) روزہ بہشت کا ضامن ہوگا۔

(مراسلہ: شہروز...... کراچی)

وجہ نام کشمیر

کہتے ہیں کہ ہندو راجہ کا ایک لڑکا "کشو" اس وادی کی تعریف سن کر اس کی سیر کو نکلا۔ سلسلہ ہمالیہ میں گھومتا گھماتا جب وہ دریائے جہلم کے سنگھم پر پہنچا تو اس کی ملاقات "میری" نامی ایک پہاڑی لڑکی سے ہوئی۔ جو اپنی مثال آپ تھی۔ کشو اس خوب صورت لڑکی پر دل ہار بیٹھا۔ عرصہ گزرا تو حال یہ ہوا کہ "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" لہٰذا دونوں کے ملاپ سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام انہوں نے "کاشمیر" رکھا۔ جو بعد میں کاشمیری اور پھر کشمیر کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی نسبت سے اس علاقے کو کشمیر اور کاشمیری کی اولاد کو کشمیری کہتے ہیں۔

نازسلوش ذشے...... میرپور آزاد کشمیر

معلومات

۱۔ امریکی محکمہ دفاع کی عمارت کو پینٹا گون کہتے ہیں۔
۲۔ شہر قرطبہ ملک اسپین یعنی ہسپانیہ کا ایک مشہور مقام ہے۔
۳۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سب سے بڑا ریگستان صوبہ سندھ میں ہے۔

۴:۔ ہندوستان کے شمالی پہاڑی ملک نیپال کی کرنسی 'روپیہ' کہلاتی ہے۔
۵:۔ زمین اور زمین میں موجود چیزوں کا مطالعہ علم الارضیات کہلاتا ہے۔
۶:۔ ہندوستان کے حکمراں شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے والد تھے۔
۷:۔ آسمانی کتاب زبور عبرانی زبان میں نازل ہوئی۔
۸:۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام اور مسلمانوں کے خلیفہ اول تھے۔
۹:۔ ملکہ نور جہاں بیگم شہزادہ جہانگیر سلیم چشتی کا اصل نام مہرالنساء ہے۔
۱۰:۔ رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خان نے اپنی ادارت میں شائع کیا تھا۔
۱۱:۔ شمالی یمن کا دارالخلافہ صنعا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

ہنسنا منع ہے

بیٹا باپ سے: "ابو میں اتنا بڑا کب ہوں گا جب مجھے امی سے اجازت کے بغیر باہر جانے کی آزادی ہوگی۔"

باپ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے: "بیٹا اتنا بڑا تو ابھی میں بھی نہیں ہوا ہوں کہ تمہاری امی کی اجازت کے بغیر کہیں جاسکوں۔"

☆☆

ایک دفعہ ایک چوہیا اپنے بچوں کے ساتھ جارہی تھی کہ راستے میں بلی آ گئی۔ چوہیا نے فوراً زور زور سے کتے کی طرح بھونکنا شروع کردیا۔ بلی راستہ کاٹ کر نکل گئی ہے۔ یہ دیکھ کر چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا: "دیکھا دنیا میں مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانیں کتنی ضروری ہیں۔"

ریاض بٹ...... حسن ابدال

ففٹی ففٹی

ایک کبابی مرغی کے کباب بیچتا تھا۔ ایک دن ایک آدمی عدالت گیا اور مقدمہ دائر کیا کہ کبابی مرغی کے خالص کباب نہیں بیچتا بلکہ اس میں گائے کے گوشت کی ملاوٹ کرتا ہے۔ جج نے کبابی کو بلا کر پوچھا۔
"تم کبابوں میں کتنی ملاوٹ کرتے ہو۔"
تو کبابی نے جواب دیا۔ "ففٹی ففٹی۔"
جج نے پوچھا۔ "ففٹی ففٹی سے کیا مراد ہے؟"
کبابی نے جواب دیا کہ "ففٹی ففٹی کا مطلب ہے کہ ایک گائے اور ایک مرغی۔"

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

سوال کی مذمت

حدیث شریف میں ہے کہ صدقہ لینا محمد وآل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے حلال نہیں ہے۔ (الخطیب)

جو آدمی بغیر ضرورت سوال کرتا ہے وہ گویا آگ کی چنگاریوں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ (بیہقی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "مجھے قسم ہے اس پروردگار کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی آدمی رسی لے کر جنگل کو چلا جائے اور لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر لائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے پاس جاکر سوال کرے اور وہ دے یا نہ دے۔"

حدیث شریف میں ہے لوگوں سے کوئی چیز مت مانگو اور اگر تمہارا کوڑا گر پڑے تو اس کو بھی خود گھوڑے سے اتر کر اٹھاؤ۔ (مسند احمد)

حدیث میں ہے مسلمانو! سوال بالکل نہ کرو اور اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے لوگوں سے سوال کرو جو

نیک دل ہوں۔ (مسند احمد)

مسلمان کو دیکھ کر مسکرانا صدقہ ہے

حدیث شریف میں ہے کہ اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔ (ترمذی)

فرق

اللہ اکبر کی منادی نے دربار ایزدی کی حاضری کا اعلان کیا مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بڑی مشکل سے مجھے اور میرے دوست کو آخری صف میں جگہ ملی دو دن کے بعد دوبارہ اسی مسجد میں نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی لیکن ہم حیران ہوئے کہ پہلی صف میں گنتی کے افراد تھے۔ میرے دوست نے دریافت کیا شاید باقی افراد جہاد افغانستان میں شرکت کے لیے گئے ہیں کیونکہ اس دن ایک افغان مجاہد نے مسجد میں تقریر کی تھی۔

نہیں اس کی وجہ یہ نہیں برادر بلکہ آج شوال کی دو تاریخ ہے۔ (یعنی کل عید تھی)

مراسلہ: حافظ عثمان غنی...... کراچی

ایک بادشاہ کی حکایت

ایک بادشاہ گھوڑے سے گر گیا، اس کی گردن کے جوڑ اپنی جگہ سے ہل گئے، ہاتھی کی طرح اس کی گردن بدن میں گھس گئی اس کا سر جب تک بدن گھمایا نہ جاتا نہ گھومتا تھا۔ یونانی طبیب کے علاوہ سارے طبیب اس کے معاملے میں حیران ہوگئے۔ اس نے (علاج کرکے) اس کا سر موڑ دیا اور بدن ٹھیک ہوگیا اور اگر وہ طبیب نہیں ہوتا تو یہ اپاہج ہوجاتا۔ جب بادشاہ تندرست ہوگیا تو وہ طبیب پھر دوبارہ کسی ضرورت سے اس کے پاس آیا۔ اس کم ظرف بادشاہ نے اس کی طرف نظر بھی نہ کی، عقل مند طبیب شرمندہ ہوگیا۔ چپکے سے یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ اگر میں کل اس کی گردن (علاج کرکے) صحیح نہ کرتا تو یہ منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس نے غلام کے ہاتھ ایک بیج بھیجا اور کہا اس کو بادشاہ کی گردن پر رکھ دینا۔ بادشاہ کو اس بیج کی بو سے ایک چھینک آئی، اس کا سر اور گردن جیسی تھی ویسی ہی ہوگئی۔ طبیب کو بہت ڈھونڈا تاکہ اس سے معافی چاہے اور وہ دوبارہ علاج کرے مگر وہ نہیں ملا۔

فائدہ: احسان کرنے والے کے شکر سے گردن نہ موڑ ورنہ تکلیف اور شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ (الحمد للہ تعالیٰ علی نعمۃ ظاہرۃ وباطنۃ)

مراسلہ: ظفر سعید...... جھنگ صدر

چند تمثیلات

☆ بے علم صوفی بلا دروازہ کے مکان کی مانند ہے۔ جاہل عبادت گزار پیدل چلنے والے کی مانند اور ست عالم سوئے ہوئے سوار کی مانند ہے۔

☆ جاہلوں میں عالم کی مثال ایسی ہے جیسے اندھوں کے درمیان کوئی خوب صورت محبوب ہو۔ (گلستان ص ۲۲۸)

☆ مال دار کی آنکھ مال سے سیر نہیں ہوتی جس طرح شبنم سے کنواں پُر نہیں ہوتا۔

☆ جس کے ساتھ اللہ کی یاد ہو اس کی حالت خوب تر ہے اگرچہ وہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح مچھلی کے پیٹ میں کیوں نہ ہو۔

☆ گناہ بُرا ہے لیکن عالم سے ہونا بہت برا ہے اس لیے کہ علم شیطان سے لڑنے کا ہتھیار ہے، جب ہتھیار والا ہی گرفتار ہوجائے تو یہ بہت افسوس کی بات ہے۔ (گلستان ص ۲۳۰)

☆ بقول حکماء وفادار کتا ناشکرے انسان سے اچھا ہے۔ (گلستان ص ۲۳۸)

مراسلہ: اقبال شمیم...... حیدرآباد

خالی دامن

محمد اعظم

خواہشیں کس دل میں جنم نہیں لیتیں۔ ہر ذی روح اپنا آج اور کل اچھا اور خوشگوار بنانے کی خواہش اور تمنا رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے مرزا غالب نے کہا ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

مگر زمانے میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خواہشوں کے غلام بن کر خود غرضی کے اسیر بن جاتے ہیں۔ جب خواہشیں خود غرضی میں تبدیل ہوجاتی ہیں تو انسان انسانیت کے رتبے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر بندھی خواہوں کی پٹی کے سبب نہ تو اپنی تمناؤں کے آگے دیکھتے ہیں نہ سمجھتے۔ بس وہ اپنی خوشی چاہتا ہے اور ہر قیمت و ہر طریقے سے......

خواہشوں کے ایک غلام کا قصہ، اس کی پیاس صرف ایک بوند تھی مگر وہ پورا دریا پی جانا چاہتا تھا

باباسائیں کے کہنے کے مطابق کرم دین نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ دن کے وقت آرام کرتا اور رات کی تاریکی میں خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھا وظائف کرتا رہتا تھا۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد وہ عائشہ کو اپنی بتائی ہوئی نصیحتوں پر سختی سے عمل کرنے کا کہہ کر حجرے میں آجاتا تھا، اس نے کمرے کے تمام بلب بند کردیے اور ہاتھ میں تسبیح لیے کچھ پڑھنے لگا، ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرے میں آواز گونجی ”تم پھر سے آبیٹھے۔“

کمرے میں اچانک گونجنے والی آواز سے کرم دین کانپ کر رہ گیا تھا مگر اس نے خود کو مضبوط کیا اور ذرا سے وقفے کے بعد پھر سے کچھ پڑھتے ہوئے تسبیح گھمانے لگا۔

”ایک بچہ مروانے کے بعد بھی تم نے کوئی نصیحت نہیں پکڑی۔“ وہی آواز پھر سے کرم دین کے کانوں سے ٹکرائی۔

گو کہ کرم دین ایک بار پھر سے ڈر گیا تھا مگر اب اس نے پاس پڑی ہوئی روئی اٹھا کر اپنے دونوں کانوں میں ٹھونس لی تھی تاکہ نہ اس طرح کی آوازیں اسے سنائی دے سکے اور نہ ہی وہ کسی خلل کا شکار ہو، کرم دین کے اس عمل کے بعد کوئی آواز اس کے کانوں میں نہ پڑی اور وہ اپنے عملیات میں مشغول رہا، پھر ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے، ڈری سہمی عائشہ اپنے بچوں کو ساتھ چمٹائے کبھی سوتے کبھی جاگتے رات گزار دیتی اور کرم دین اپنے حجرے میں قید، چلہ کاٹتے ہوئے رات بتا دیتا۔

☆☆☆☆☆

ایک بچہ گنوانے کے بعد عائشہ بہت سہم گئی تھی، وہ ہر پل ڈری سہمی رہنے لگی تھی جبکہ کرم دین نے اس واقعہ کا ذرا سی بھی اثر نہیں لیا تھا، اب عائشہ ایک پل کے لیے بھی بچوں کو اپنی نظروں سے دور نہیں ہونے دیتی تھی، اس نے بچوں کو گلی میں جانے سے بھی منع کر دیا تھا، اسے جب کوئی ذرا سا بھی شک ہوتا یا خطرے کی بو محسوس ہوتی، وہ تینوں بچوں کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور اس وقت تک اپنے سینے سے لگائے بیٹھی رہتی جب تک خطرہ ٹل نہ جاتا، بچے ابھی تک اس بات سے لاعلم تھے کہ انہیں گلی میں کھیلنے سے کیوں روکا گیا ہے اور گھر میں کھیلتے ہوئے بھی ان کی

نگرانی کیوں کی جاتی ہے، انہوں نے محض ماں کا حکم جان کر خاموشی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

شام کا وقت تھا عمر، حاجرہ اور ماجدہ صحن میں کھیل رہے تھے، عائشہ چارپائی پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور ساتھ ہی بچوں کی نگرانی بھی کر رہی تھی، اچانک حاجرہ ایک جگہ پر رک گئی، بظاہر یہ معمولی سی بات تھی لیکن عائشہ کے ذہن میں گھنٹیاں بج اٹھی تھیں، وہ انہیں اپنے پاس بلانے ہی والی تھی کہ حاجرہ کی ایڑھیاں اٹھ گئیں اور اس کا سارا وزن پاؤں کے پنجوں پر آ گیا، ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر کھینچ رہا تھا، عائشہ نے حاجرہ کی یہ حالت دیکھی تو فوراً چارپائی سے چھلانگ لگائی اور جوتا پہنے بغیر اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑی۔

عائشہ بجلی کی سی تیزی سے حاجرہ کے پاس پہنچی تھی مگر تب تک حاجرہ کا جسم دو اڑھائی فٹ اوپر اٹھ چکا تھا، عمر اور ماجدہ ڈر کر ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے تھے، عائشہ نے لپک کر حاجرہ کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، اس کے باوجود کوئی ان دیکھی طاقت اسے اوپر اٹھائے جا رہی تھی، خوف کے مارے عائشہ کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کوئی طاقت حاجرہ کے ساتھ ساتھ اسے بھی اٹھائے لے جا رہی تھی، اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جواب دے گئی تھیں، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

عائشہ نے سن رکھا تھا کہ اگر کسی مشکل گھڑی میں سورہ یاسین پڑھی جائے تو خدا کے فضل و کرم سے وہ مشکل ٹل جاتی ہے، یہ خیال آتے ہی اس نے خدا کو یاد کیا اور سورہ یاسین پڑھنے لگی، سورہ یاسین کا پڑھنا تھا کہ انہیں زمین پر پٹخ دیا گیا، عائشہ پہلے زمین پر گری تھی پھر حاجرہ بھی اس کے اوپر ہی گر پڑی، عائشہ کے سر اور کمر میں چوٹ آئی تھی جبکہ حاجرہ مکمل طور پر محفوظ رہی تھی۔

عائشہ نے اپنی چوٹ بھول کر بیٹی کو گلے لگا لیا اور وہیں بیٹھی رونے لگی۔ عمر اور ماجدہ ابھی تک پاس ہی ایک دوسرے سے چمٹے سہمے کھڑے تھے، ماں اور بہن کو روتے دیکھ کر وہ بھی ماں کے گلے لگ کر رونے لگے تھے، ان چاروں کے رونے کی آواز کرم دین نے بھی سن لی تھی مگر وہ کمرے سے باہر نہیں آیا تھا، کچھ دیر تک وہ چاروں وہیں فرش پر ہی بیٹھے ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتے رہے، پھر جب آنسو تھمے تو عائشہ وہاں سے اٹھی اور بچوں کو ساتھ لیے چارپائی پر جا لیٹی۔

چوٹ لگنے سے عائشہ کی کمر اور سر میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی، ماں کو تکلیف میں دیکھ کر تینوں بہن بھائی اس کا جسم دبانے لگے، حاجرہ سر دبا رہی تھی جبکہ عمر اور ماجدہ کمر اور ٹانگیں دبا رہے تھے۔

”امی خون!“ حاجرہ نے ہاتھوں میں لگا خون دیکھ کر ڈرتے ہوئے کہا۔

حاجرہ کے منہ سے خون کا سن کر عائشہ بھی جلدی سے اٹھ بیٹھی اور اس کے ہاتھوں میں لگے خون کو دیکھنے لگی۔

”امی! یہ دیکھو سرہانے پر بھی خون لگا ہوا ہے“ عمر نے سرہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے سر پھٹ گیا ہے، جس کی وجہ سے خون بہہ رہا ہے“ عائشہ نے سرہانے پر لگے خون کو دیکھ کر بات کی۔

وہ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ماجدہ نے باپ کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

”ابو! دروازہ کھولو......ابو......ابو...... ابو دروازہ کھولو...... امی کے سر سے خون بہہ رہا ہے......ابو

جلدی سے آ کر دیکھو..... ابو..... ابو میری بات سن رہے ہو کہ نہیں..... خدا کے لیے جلدی دروازہ کھولو ابو.....'' ماجدہ نے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دروازہ پیٹتے ہوئے رو کر کہا۔

کرم دین کچھ دیر تک دروازہ پیٹے جانے کی آوازیں سن کر برداشت کرتا رہا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول کر چیخا۔ ''کیوں شور مچا رہے ہو؟'' کرم دین جس قدر چیخ کر بولا تھا، اس سے ماجدہ سہم گئی، پھر بھی ماں کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''وہ دیکھو ابو! امی کے سر سے کتنا خون بہہ رہا ہے۔''

''خون بہہ رہا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو؟'' کرم دین نے انتہائی غصے کے عالم میں بات کی اور زور سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگالی۔

کرم دین اس قدر غصے سے چیخا تھا کہ ماجدہ کے آنسو نکل پڑے تھے اور وہ روتی ہوئی ماں کے پاس آ گئی تھی، عائشہ سر پر ہاتھ رکھے چارپائی پر لیٹی سب کچھ دیکھ رہی تھی، اس نے ماجدہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے پیار سے بہلانے لگی، اس کے تسلی دینے سے تھوڑی ہی دیر بعد ماجدہ بہل گئی اور اپنے ہاتھوں سے آنسو صاف کر لیے۔

ماجدہ کے دروازہ کھٹکھٹانے اور زور زور سے آوازیں دینے پر کرم دین کو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا تھا اور پھر وہ ماجدہ کو ڈانٹ کر دوبارہ کمرے میں چلا گیا تھا، کچھ دیر بعد غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ سوچنے لگا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، اب کم از کم باہر نکل کر دیکھ تو لیا جائے کہ عائشہ کا سر کس وجہ سے پھٹ گیا۔ وہ اپنے حجرے سے باہر آیا تو تینوں بچے باپ کے ڈر سے سہم کر ماں کے پیچھے سمٹ کر بیٹھ گئے۔

''ماجدہ کہہ رہی تھی۔ تمہارے سر سے خون بہہ رہا ہے۔'' کرم دین نے عائشہ سے دریافت کیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا۔'' کرم دین کی بات سن کر عائشہ نے غصے کو دباتے ہوئے جواب دیا اور چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

ماں کی بات سن کر تینوں بچے سمجھ گئے تھے کہ وہ غصے کی وجہ سے جان بوجھ کر ایسا کہہ رہی ہے، مگر کسی بچے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ کر باپ کو حقیقت حال سے آگاہ کرتا، عائشہ کے لہجے کو دیکھ کر کرم دین بھی جان گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے مگر وہ جان بوجھ کر بتانے سے گریز کر رہی ہے۔

''تو تو کہہ رہی تھی، امی کے سر سے بہت خون بہہ رہا ہے، مگر تمہاری ماں تو کہہ رہی ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔'' کرم دین نے صحیح صورت حال جاننے کے لیے ماجدہ سے بات کی۔

''امی جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتا رہی۔'' ماجدہ نے ڈرتے ڈرتے بات کی اور پھر سرہانے پر لگا خون دکھاتے ہوئے بولی ''یہ دیکھیں سرہانے پر بھی خون لگا ہوا ہے۔''

''مگر چوٹ لگی کیسے؟'' کرم دین نے حیران ہو کر پوچھا۔

باپ کا سوال سن کر ماجدہ نے تمام تفصیل بیان کر دی، اس کی بات سن کر کرم دین تلخ لہجے میں بولا ''تم لوگ وہ بات کیا کرو جسے عقل تسلیم بھی کر لے۔''

''ابو! اگر یقین نہیں آتا تو ان سے پوچھ لیں۔'' ماجدہ نے عمر اور حاجرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ کرم دین کچھ کہتا، عائشہ بول پڑی ''تم کن باتوں میں پڑ گئی ہو ماجدہ۔ تمہارا ابو ہماری بات پر کہاں یقین کرنے گا۔''

''تم لوگ بھی تو ہر بات کو میرے عملیات اور وظائف سے جوڑ دیتے ہو۔ کیا اس گھر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ سب میری وجہ سے ہی ہو رہا ہے؟'' کرم دین نے عائشہ کی بات سن کر غصے میں بات کی، پھر جیب میں سے کچھ روپے نکال کر عائشہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''یہ پیسے لو اور جا کر ڈاکٹر سے پٹی کروا لو۔''

عائشہ نے کرم دین کی بات کا کوئی جواب دیا تھا اور نہ ہی جو رقم وہ دے رہا تھا وہ لی تھی، کرم دین نے پیسے اس کے پاس ہی چارپائی پر رکھے اور پھر سے اپنے حجرے میں جا گھسا۔

☆☆☆☆☆

عائشہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ کرم دین جن چکروں میں پڑا ہوا ہے، ان کی وجہ سے وہ اور اس کے بچے خطرے میں ہیں، اس لیے اس نے بچوں کی نگرانی اور بھی سخت کر دی تھی، وہ جس عذاب میں مبتلا تھی، اسے اکیلے ہی برداشت کیے جا رہی تھی، اسے کسی پل بھی سکون نصیب نہیں تھا، سوتے جاگتے خطرے کی گھنٹیاں اس کے کانوں میں بجتی رہتیں مگر وہ اس قدر بے بس تھی کہ کسی سے کچھ کہہ سکتی تھی نہ خود ہی کچھ کر سکتی تھی۔

تینوں بچے ایک ہی چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، عائشہ پاس ہی بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی، باتیں کرتے کرتے حاجرہ اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی، گو کہ یہ معمول کی بات تھی مگر عائشہ کی نظر اس پر لگ گئی کچھ دیر بعد وہ باتھ روم سے نکل کر باہر آئی تو عائشہ نے سکھ کا سانس لیا، حاجرہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے وہ اس قدر سہم گئی تھی کہ جب تک وہ فارغ ہو کر باتھ روم سے باہر نہیں نکل آئی، عائشہ کی جان سولی پر لٹکی رہی تھی۔

حاجرہ باتھ روم سے نکل کر آ رہی تھی کہ اچانک اس کے چلنے کی رفتار میں تیزی آ گئی، پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی زبردستی اسے دھکیل رہا ہو، اس لمحے عائشہ کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے اور وہ جان گئی کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے، وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی تا کہ حاجرہ کو تھام لے مگر اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچ پاتی، حاجرہ کی رفتار میں اس قدر تیزی آ گئی تھی کہ وہ اڑتی ہوئی سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی، عائشہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا، حاجرہ کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

''آنکھیں کھولو..... آنکھیں کھولو حاجرہ! میری بچی آنکھیں کھولو۔'' عائشہ نے حاجرہ کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

عائشہ، حاجرہ کو اپنی بانہوں میں لیے چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر حاجرہ کے چہرے پر گر رہے تھے، اسے اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنی بچی کی لاش بازوؤں میں لیے بیٹھی ہے، اس لیے اسے ہوش میں لانے کے لیے مسلسل اس کے گالوں کو تھپتھپا رہی تھی۔

عمر اور ماجدہ کچھ دیر تک گم صم کھڑے ماں اور بہن کی حالت دیکھتے رہے، پھر دونوں باپ کے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگے، مگر کرم دین اتنی آسانی سے دروازہ کھولنے والا کہاں تھا، وہ دروازہ کھلنے کے انتظار میں تھوڑی دیر کے لیے دروازہ پیٹنا بند کر دیتے مگر اندر سے کوئی جواب نہ پا کر پھر سے دروازہ پیٹنے لگتے، آخر کار ان دونوں کی کوشش رنگ لے آئی اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولتے ہی کرم دین ان دونوں پر برس پڑا، قریب تھا کہ وہ غصے میں بے قابو ہو کر انہیں برا بھلا کہتا یا ان کی پٹائی کرنے لگتا، عائشہ نے بانہوں میں

لی ہوئی حاجرہ کی لاش کرم دین کے سامنے کر دی اور بولی۔ ''یہ لو ایک اور بچے کی لاش قبول کرو۔''

''کیا ہوا اسے؟'' کرم دین نے حاجرہ کو عائشہ کی بانہوں میں خون میں لت پت دیکھ کر دریافت کیا۔

''تمہارے کرتوتوں کی سزا ملی ہے اسے۔''

کرم دین، عائشہ کی بات کا مطلب پوری طرح سمجھ گیا تھا پھر بھی انجان بن کر بولا ''میں نے ایسا کیا کیا ہے جس کی سزا اسے ملی ہے؟''

''کرم دین! جس دولت کو پانے کے لیے تم نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا ہے، ایسا نہ ہو کہ اسے پانے کے چکر میں، جو نعمتیں خدا نے تمہیں دے رکھی ہیں وہ بھی چھن جائیں اور تم خالی ہاتھ رہ جاؤ۔''

''تم اپنی بے وقت کی تقریر بند کرو اور اسے چارپائی پر لٹاؤ۔'' کرم دین دہاڑا۔

عائشہ روتی ہوئی وہاں سے چل پڑی اور حاجرہ کی لاش کو چارپائی پر لٹا کر اس پر چادر ڈال دی، ماں کو روتے دیکھ کر عمر اور ماجدہ بھی مسلسل روئے جا رہے تھے مگر پتھر دل باپ کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جو بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ہو، کسی بھی طرح ایسی قوتوں کو اپنے ہاتھ میں کرنا ہے جن سے کام لے کر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے اور وہ سب کچھ پالے جس کے لیے اس نے ہمیشہ سے خواہش کی تھی، بابا سائیں نے اسے جو عملیات بتائے تھے انہیں گھر کے ہی کسی کونے میں تنہا بیٹھ کر مکمل کرنے کو کہا تھا مگر اس نے کتاب سے پڑھ کر اپنی مرضی سے جو عملیات شروع کر دیے تھے، ان میں درج ہدایات کے مطابق آبادی سے دور کھلے آسمان تلے بیٹھ کر چلّہ کاٹنا تھا، ورنہ کوئی بھی نقصان ہو سکتا تھا، لیکن کرم دین نے کتاب میں دی گئی ہدایات کی کوئی پروا نہیں کی تھی اور جو الٹا سیدھا سمجھ میں آیا، کرتا گیا تھا۔

وہ اپنے ارادوں کا مضبوط نکلا اور آخر کار اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ گیا تھا، اس دوران کئی ناخوش گوار واقعات بھی پیش آئے تھے مگر کوئی بھی چیز اسے اس کے ارادوں سے روک نہ سکی تھی، ان ایام میں عائشہ کئی بار ڈری، کئی بار کسی انجانے اور ان دیکھے خوف نے اسے رات بھر جگائے رکھا، لیکن وہ خاوند کی ضد کی وجہ سے مجبوراً سب کچھ برداشت کر گئی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا جب کرم دین نے چلّے میں پڑھنے والی تسبیح مکمل کر لی، جونہی اس نے تسبیح کا آخری دانہ پھینکا، اسی لمحے اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور جذبات سے بے قابو ہو کر اس کمرے کی طرف دوڑ پڑا جہاں اس کی بیوی اور بچے لیٹے تھے۔ عائشہ اور بچے گہری نیند سو رہے تھے، دروازے پر پہنچتے ہی کرم دین نے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی تھی، جیسے ہی کنڈی کھٹکنے کی آواز عائشہ کے کانوں میں پڑی تو اس کی آنکھ کھل گئی، وہ ڈر کر سمٹ گئی تھی اور اپنے ساتھ لیٹے ہوئے بچے کو زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا، اب عائشہ کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ سانس روکے خاموشی سے لیٹی تھی اور اس کے کان پوری طرح دروازے پر لگے ہوئے تھے، کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''کک.....کک.....کون ہے؟'' عائشہ نے چارپائی پر لیٹے، ڈرتے ہوئے دریافت کیا۔

''دروازہ کھولو عائشہ۔'' کرم دین نے آہستہ سے کہا۔

آواز عائشہ کے کانوں سے ٹکرائی تھی مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، اس لیے پھر سے بولی ''کون ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟''

''میں کرم دین ہوں عائشہ! دروازہ تو کھولو۔''

اس بار عائشہ نے کرم دین کی آواز سن لی تھی مگر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس وقت حجرے میں بیٹھا چلّہ کاٹنے میں لگا ہوگا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کرم دین کسی بھی صورت میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر وہاں آنے والا نہیں تھا۔

''کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تم کرم دین نہیں ہو سکتے۔'' عائشہ نے اپنی تسلی کے لیے بات کی۔

''تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں کرم دین ہوں۔ تمہیں اس بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا؟''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو اس وقت اپنے کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔''

''دروازہ کھولو گی تو کوئی بات ہوگی۔ میں یہاں باہر کھڑا تمہیں کیا بتاؤں۔''

اب تک عائشہ تمام باتیں چارپائی پر ہی لیٹی ہوئی کر رہی تھی مگر کرم دین کی آواز پہچان کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن کنڈی کھولنے سے پہلے اس نے اپنی تسلی کے لیے چھوٹے سے سوراخ میں سے آنکھ لگا کر دیکھا تھا، جب اسے مکمل یقین ہو گیا کہ دروازے پر کھڑا شخص کرم دین ہی ہے تو اس نے کمرے کی لائٹ جلا دی اور دروازہ کھول دیا۔

عائشہ کے پوچھنے پر کرم دین نے اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا، بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقوں اور کتاب میں دی گئی ہدایات کے مطابق اپنے عملیات مکمل کرنے پر اسے جو خوشی حاصل ہوئی تھی وہ اس کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی، کرم دین اپنی کامیابی پر خوش تھا اور عائشہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ اب خاوند کے ہوتے ہوئے اسے ڈر ڈر کر راتیں نہیں گزارنی پڑیں گی۔

☆☆☆☆☆

ایک عرصے کے بعد کرم دین اپنے حجرے سے نکل کر محلے والوں کے سامنے آیا تھا، وہ گھر سے نکل کر باہر آ کھڑا ہوا تھا اور ہر آنے جانے والے کو انتہائی پرتپاک طریقے سے مل رہا تھا، لوگ اس کی خیریت دریافت کرتے اور آگے بڑھ جاتے تھے، کرم دین کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جس کے سامنے وہ کچھ کر کے دکھا سکے تاکہ پھر اس کے ذریعے دوسرے لوگوں تک بھی بات پہنچ جائے۔ کچھ ہی دیر بعد دور سے اسے مبارک آتا ہوا دکھائی دیا، وہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، کرم دین کا دماغ اتنی ہی تیزی سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

''کہاں ہوتے ہو کرم دین۔ آج بہت دنوں بعد شکل دکھائی ہے؟'' مبارک نے آتے ہی سوال کیا۔

''میں نے کہاں جانا ہے۔ میں تو گھر پر ہی ہوتا ہوں۔''

''مگر کبھی دکھائی تو نہیں دیے!''

''دراصل آج بہت دنوں کے بعد گھر سے نکلا ہوں۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔''

''چلو اب مل گئے ہو تو آؤ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں۔''

''پھر کبھی سہی۔''

''آؤ تو سہی کچھ دیر کے لیے بیٹھو پھر چلے جانا۔'' کرم دین نے مبارک کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ بضد تھا، اس لیے مبارک نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا اور خاموشی سے کرم دین کے ساتھ ساتھ چل دیا۔

''کیا کھاؤ گے؟ کیا پیئو گے۔؟'' کمرے میں

بیٹھتے ہی کرم دین نے مبارک سے دریافت کیا۔
''فی الحال تو کسی چیز کی طلب نہیں۔
''شرماؤ نہیں یار! جو چاہو بتاؤ۔''
''کہا ناں کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو ابا کے لیے دکان سے سگریٹ لینے جارہا تھا۔''
''کمال ہے یار۔ میرے ہوتے ہوئے سگریٹ لینے کے لیے دکان پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس تم یہ بتاؤ کون سے سگریٹ چاہئیں؟''
''کوئی سے بھی۔ اچھے سے سگریٹ ہوں''
''لاؤ بھئی مبارک کے لیے سگریٹ لاؤ۔'' کرم دین چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔
کرم دین کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر مبارک کبھی چھت کبھی کرم دین کو دیکھنے لگا، مگر جب تھوڑی ہی دیر بعد سگریٹ کا پیکٹ اس کے سامنے آکر گرا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی سگریٹ کے پیکٹ کو دیکھنے لگتا اور کبھی اس جگہ کا جائزہ لینے لگتا جہاں سے کچھ ہی دیر پہلے سگریٹ کی ڈبی پھینکی گئی تھی۔
''یہ سب کیا ہے کرم دین؟'' مبارک نے سگریٹ کا پیکٹ حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''بس یوں سمجھ لو۔ میں نے اپنے وظائف اور چلوں کے ذریعے کچھ طاقتوں کو اپنے ہاتھ میں کرلیا ہے، اسی وجہ سے میں ایک عرصے تک ایک ہی کمرے میں قید رہا ہوں اور کہیں باہر نہیں نکلا۔''
''یہ تو کمال ہوگیا۔''
''ہاں۔ لیکن اصل کمال تو اس وقت ہوگا، جب مختلف پریشانیوں میں گھرے ہوئے لوگ میرے پاس آئیں گے اور میں ان کے کام آؤں گا۔ سگریٹ کی ڈبی تو تمہیں مفت میں مل گئی لیکن تب ہر کام پیسوں سے ہوگا۔''

کرم دین کو یقین تھا کہ اس نے مبارک کے سامنے جو کام کر دکھایا ہے، اس کی دھوم جلد ہی ساری بستی میں پھیل جائے گی اور وہ دن دور نہیں جب دور و نزدیک سے لوگ تعویز دھاگے کے لیے اس کے پاس چلے آئیں گے، پھر پیسہ ہی پیسہ اور موجیں ہی موجیں ہوں گی۔
مبارک نے سگریٹ کی ڈبی جیب میں ڈالی اور وہاں سے نکل گیا، وہ گھر پہنچنے تک بھی سوچتا رہا تھا۔
''یہ لو سگریٹ۔ اور یہ لو اپنے پیسے۔'' مبارک نے سگریٹ کی ڈبی اور پیسے اپنے باپ کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔
سگریٹ کی ڈبی اور پیسے اللہ داد کے ہاتھ میں تھے، وہ حیرانی سے مبارک کو دیکھتے ہوئے بولا ''تم سگریٹ کی ڈبی کے پیسے دے کر نہیں آئے؟''
''نہیں۔ آج سگریٹ مفت ملے ہیں۔''
''کیا مطلب؟''
''یہ سگریٹ کرم دین نے اپنے جنوں سے منگوا کر دیے ہیں''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
''میں سچ کہہ رہا ہوں ابا! یہ ڈبی اس نے میرے سامنے منگوائی ہے۔''
''اچھا!'' اللہ داد نے حیران ہوکر تصدیق چاہی۔
''ہاں ابا! اور پتا ہے کرم دین کہہ رہا تھا کہ اب کسی کا کوئی بھی مسئلہ ہو، وہ میرے پاس چلا آئے''
ان کی باتیں سن کر فاطمہ بھی وہاں آگئی اور بولی
''یہ تم کس کی باتیں کررہے ہو؟''
''آؤ تم بھی سن لو اور سن کر تم بھی میری طرح حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکو گی'' اللہ داد نے بات کی اور پھر مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''ذرا اپنی ماں کو بھی سنادو۔''

''ماں تمہیں پتا ہے کرم دین کے پاس جن ہیں۔''
''واقعی؟''
''ہاں ماں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میرے سامنے ہی اس نے سگریٹ کی ڈبی جن سے منگوائی تھی۔''
''اس کا مطلب ہے کرم دین تو اپنے میاں جی سے بھی آگے نکل گیا۔'' فاطمہ نے حیران ہوکر بات کی۔
فاطمہ کی بات سن کر اللہ داد بول پڑا ''یہ نہ کہو، کیونکہ میاں جی آل رسول ﷺ میں سے ہیں اور کرم دین تو کیا، ہم میں سے کوئی بھی ان کے قدموں کی خاک کی برابری بھی نہیں کرسکتا''
''لیکن پھر بھی اب میاں جی کو کون پوچھے گا۔ ویسے بھی میاں جی کے دم میں بھی اب کچھ نہیں رہ گیا۔''
''ایسا نہ کہو، کیونکہ میاں جی جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ بغیر کسی لالچ کے ہوتا ہے...... لوگ اپنی مرضی سے اگر انہیں کچھ دے بھی آتے ہیں تو وہ اس سے بھی لنگر پکوا کر غریبوں میں تقسیم کردیتے ہیں اور کبھی ایک پیسہ بھی اپنی جیب میں نہیں ڈالتے'' اللہ داد نے بات کی تو فاطمہ کوئی جواب نہ دے سکی اور خاموش بیٹھی رہی۔
مبارک کے ذریعے کرم دین کے متعلق جو بات اس کے ماں باپ تک پہنچی تھی، وہ آہستہ آہستہ علاقے میں سفر کرتی ہوئی چاچی خبری کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ جیسے ہی چاچی کے کانوں میں بات پڑی، اس نے حسب عادت برقعہ اٹھایا اور کرم دین کے ہاں پہنچ گئی۔
دوپہر کا وقت تھا کرم دین چارپائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ ''سنا ہے تمہارے پاس جن ہیں؟ اور تم جو چاہو ان سے کام کرواسکتے ہو۔'' چاچی خبری نے آتے ہی دریافت کیا۔
''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' کرم دین نے جان بوجھ کر چاچی سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بات کی۔
''سارے محلے والے ہی باتیں کررہے ہیں۔''
''کیا کہتے ہیں محلے والے؟''
''سچ پوچھو تو کچھ حیران ہیں اور کچھ کو یقین ہی نہیں آرہا۔''
''یقین نہیں آرہا تو آجائے گا چاچی۔ مگر تم اپنی بتاؤ، تمہیں یقین آیا کہ نہیں؟''
''مجھے بھی تب یقین آئے گا، جب تم میرا کام کردو گے''
''چاچی تم اس کونے والے کمرے میں جاکر بیٹھو، میں ابھی کھانا کھاکر آتا ہوں اور پھر تم سے بات کرتا ہوں۔''
کرم دین کی بات سن کر چاچی وہاں سے اٹھی اور خاموشی سے اس کمرے میں جابیٹھی جہاں کرم دین نے اشارہ کیا تھا، فرش پر بچھی ہوئی سفید چادریں دیکھ کر چاچی نے اپنے جوتے باہر ہی اتار دیے تھے، کمرے میں اگربتیاں جل رہی تھیں اور ان کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، ابھی چاچی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ کرم دین وہاں آگیا اور آتے ہی ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔
''ہاں چاچی! اب بتاؤ کیا کہتی ہو۔''
''تم تو جانتے ہی ہو، میری بہو نے میرے بیٹے کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔ کچھ ایسا کردو کہ وہ میرے کہنے میں آجائے اور اس کی بیوی بھی میرے اشاروں پر ناچنے لگے۔''
''یہ کام تو اتنا بڑا نہیں ہے چاچی۔ کام تو تمہارا میں کردوں گا، مگر کچھ پیسے خرچ کرنا پڑیں گے۔''
''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بس میرا کام ہوجائے، میں گیارہویں والے کے نام پر پورے گیارہ روپے

دوں گی۔"

"اب گیارہ روپے سے کام نہیں چلے گا چاچی۔"

"مگر میاں جی کو تو ہم گیارہ روپے ہی دیتے ہیں۔"

"اسی لیے تو کام بھی نہیں ہوتا۔ میں اس کام کے پانچ سو روپے لوں گا اور اس بات کی بھی گارنٹی ہے کہ جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔"

☆☆☆☆☆

کرم دین کی بات سن کر چاچی خاموش ہوگئی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے، اس کا کام یونہی کردے گا اور اس کام کے لیے اسے میاں جی کی طرح گیارہ روپے بھی نہیں دینے پڑیں گے۔ چاچی خبری نے اپنی بہو اور بیٹے کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے کئی بار میاں جی سے تعویز لیے تھے اور ہر بار انہیں نیاز کے لیے گیارہ روپے بھی ادا کرتی رہی تھی لیکن تعویزوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، اسے میاں جی سے یہی گلہ تھا کہ وہ اس سے کتنی ہی بار گیارہویں والے کے نام کے گیارہ روپے لے چکے تھے مگر اس کا کام پھر بھی نہیں ہوا تھا۔

کرم دین کی بات سن کر چاچی خاموشی سے اپنے گھر واپس چلی آئی تھی لیکن اسے بار بار یہ سوچ کر دکھ ہو رہا تھا کہ کرم دین کو جو کام بغیر پیسوں کے بخوشی کر دینا چاہئے تھا، اس نے اس کے لیے پانچ سو روپے مانگے تھے، وہ سوچنے لگی کہ کرم دین کو بغیر کسی لالچ کے اس کا کام کر دینا چاہئے تھا، بعد میں وہ خود اپنی خوشی سے کچھ دے دیتی تو اور بات تھی، مگر اس نے تو منہ کھول کر پانچ سو روپے مانگ لیے تھے۔

کرم دین کی باتوں نے چاچی کو پریشان کر دیا تھا لیکن وہ ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر کرم دین کو پانچ سو روپے دینے سے اس کے بہو بیٹا ہاتھوں میں آ جاتے ہیں تو پھر بھی سودا برا نہیں، لیکن سوال یہ تھا کہ پانچ سو روپے کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔

گھر کا تمام نظام چاچی کے بیٹے کے پاس تھا اور وہ روپیہ پیسہ اپنی بیوی کے پاس رکھتا تھا، اسے کھانے پینے کے لیے دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی مگر پیسے کی شکل دیکھنا اسے کم ہی نصیب ہوتا تھا، میاں جی سے تعویز بنوانے کے لیے اسے جو دو تین بار گیارہ گیارہ روپے دینے پڑے تھے ان کے لیے بھی اس نے بہو سے چوری مرغیوں کے انڈے بیچے تھے تب جا کر وہ میاں جی کو دینے کے لیے جمع کر پائی تھی، اب اٹھتے بیٹھتے چاچی کے ذہن میں ایک ہی سوال اٹھتا تھا کہ وہ کرم دین کو دینے کے لیے پانچ سو روپے کا انتظام کس طرح کرے، گھر کا مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے صرف پانچ سو روپے درکار تھے، وہ پانچ سو روپے اسے کہیں نہ کہیں سے بھی حاصل کرنا تھے مگر نہیں ہو پا رہے تھے۔

کئی منصوبے چاچی کے دماغ میں بنے تھے مگر ہر منصوبے میں کہیں نہ کہیں جھول ہوتی تھی، اس لیے وہ منصوبہ ختم ہو جاتا اور پھر کوئی نئی منصوبہ بندی شروع ہو جاتی تھی، وہ کوئی نہ کوئی قدم اٹھا تو لیتی مگر اسے کسی بھی جگہ پکڑے جانے کا ڈر ہوتا تھا اس لیے اپنے منصوبے پر عمل نہ کر پاتی۔

جب سے چاچی خبری، کرم دین کے ہاں سے ہو کر آئی تھی، بہو اور بیٹے کو اپنے ہاتھوں میں کرنے کی امید بندھ گئی تھی لیکن پانچ سو روپے کی رقم مسئلہ بنی ہوئی تھی، جب پیسوں کے حصول کی کوئی راہ دکھائی نہ دی تو چاچی نے رقم اکٹھی کرنے کے لیے اپنے ذہن میں لائحہ عمل تیار کر لیا اور اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح جوڑ توڑ کر کے ڈیڑھ سو روپے اکٹھے کر لیے، ڈیڑھ سو روپے جمع کرنے میں بھی اسے

کئی دن لگ گئے تھے، اب مزید انتظار اس کے بس میں نہیں تھا، اس نے انتہائی احتیاط سے پیسے نکال کر گنے اور پھر تھیلی میں ڈال کر اپنے پاس محفوظ کیے اور کرم دین کے پاس پہنچ گئی۔

کرم دین اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، چاچی بھی عائشہ سے پوچھ کر وہیں پہنچ گئی۔

"آؤ چاچی آؤ۔" کرم دین نے چاچی کو دیکھ کر سنبھلتے ہوئے کہا۔

وہ کرم دین کے سامنے ہی بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ بات کا آغاز کس طرح سے کرے، ابھی وہ بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی کہ کرم دین کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"بہت دنوں کے بعد چکر لگایا ہے چاچی؟"

"ہاں۔ آنا تو میں کئی دن سے چاہ رہی تھی مگر تم نے پیسے ہی اتنے زیادہ مانگے تھے کہ انتظام ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔"

"چاچی۔ پانچ سو روپے کیا بہت زیادہ ہوتے ہیں؟"

"ہاں۔ مجھ جیسی غریب اور بے بس کے لیے تو زیادہ ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھا اب تو پیسوں کا انتظام کر لیا ہے ناں؟"

"مشکل سے یہ ڈیڑھ سو روپے اکٹھے ہوئے ہیں" چاچی نے تھیلی میں سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

"صرف ڈیڑھ سو؟"

"فی الحال یہ تو رکھو۔ باقی بھی تھوڑے تھوڑے کر کے لا دوں گی۔"

"چاچی کام تو پورا کروانا چاہتی ہو اور پیسے قسطوں میں۔"

"تو میرا کام تو کر دے۔ پھر میں تمہیں سو دو سو زیادہ ہی دے دوں گی۔"

کرم دین کے وظائف اور چلوں کے بارے میں پورے علاقے کے لوگ جان چکے تھے مگر اس کے پاس کوئی بھی نہیں آیا تھا، لوگ اب بھی میاں جی کے پاس ہی جاتے تھے، صرف چاچی خبری تھی جو اپنی کوئی غرض لے کر اس کے پاس آئی تھی، جس کے لیے اس نے پانچ سو روپے مانگے تھے مگر وہ ڈیڑھ سو روپے لے کر آئی تھی، کرم دین کے بھی اتنے اچھے حالات نہیں تھے، اس لیے اس نے چاچی سے ڈیڑھ سو روپے ہی لینے کا فیصلہ کر لیا اور بولا۔ "تم بھی کیا یاد کرو گی چاچی۔ لاؤ یہ پیسے مجھے دو میں تمہارا کام کر دیتا ہوں لیکن کام ہونے کے بعد میرے پیسے بھول نہ جانا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم بھی...... میں بھلا ایسی ہوں کیا؟ بس میرا کام ہو جائے پھر دیکھنا میں تمہیں خوش کر دوں گی۔"

دونوں ہی ضرورت مند تھے، اس لیے کچھ ہی دیر میں دونوں کی ضرورتوں کا تبادلہ ہو گیا، چاچی تعویز اور کچھ پڑھنے کے لیے کلمات لیے اپنے گھر روانہ ہو گئی تھی جبکہ کرم دین نے چاچی سے ڈیڑھ سو روپے لے کر جیب میں ڈال لیے تھے۔

گھر پہنچتے ہی چاچی نے پہلے اس بات کی تسلی کر لی کہ اس کی بہو اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھی اور اس کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی، پھر اس نے احتیاط سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ وہ کرم دین کے دیے ہوئے تعویز کہیں سنبھال کر رکھ سکے، چاچی کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ اس کی بہو کبھی بھی اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی، اس کے لیے کھانا بھی وہ بچوں کے ہاتھ کمرے میں ہی بھجوا دیا کرتی تھی، مگر اس کے باوجود ڈر اور خوف نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا، کچھ ہی دیر میں چاچی نے تعویز ٹھکانے لگا دیے اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا لیکن چاچی کو یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو، رات ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی، پھر جیسے ہی عشاء کی اذان ہوئی چاچی نے جلدی سے نماز پڑھی اور تسبیح لے کر اپنی چارپائی پر بیٹھ کر کرم دین کے بتائے ہوئے کلمات پڑھتے ہوئے تسبیح کرنے لگی اور دانے پہ دانہ گرنے لگا، تسبیح مکمل ہونے میں قریب قریب ایک گھنٹہ لگا تھا، اس کام سے فارغ ہو کر چاچی سکون سے لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

جمعہ کے خطبے میں میاں جی کی تقریر کا موضوع والدین کی خدمت تھا، وہیں چاچی خیری کا بیٹا اسلم بھی موجود تھا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں کو غور سے سن رہا تھا، میاں جی نے والدین کی نافرمانی کرنے والوں کے متعلق ایسی ایسی احادیث اور واقعات سنائے تھے کہ اسلم کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس طرح کی باتیں اس نے پہلے بھی کئی بار سنی تھیں، جو اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی تھیں، شائد اس نے زندگی میں پہلی بار یہ باتیں غور سے سنی تھیں یا میاں جی کا انداز بیان ایسا تھا کہ اس روز میاں جی کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔

نماز جمعہ کے بعد اسلم خود کو ٹٹولنے لگا کہ کہیں وہ بھی والدین کے نافرمانوں میں سے تو نہیں، اس کا باپ تو بہت سال پہلے ہی اس جہاں سے چل بسا تھا، اس کی زندگی میں وہ ہمیشہ باپ کا محتاج رہا تھا اور اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی اپنے باپ کی نافرمانی کی ہو۔ باپ کی وفات کے بعد تمام تر معاملات اس کے ہاتھوں میں آ گئے تھے اور وہ اپنے طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری طرح نبھا رہا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو ابھی تک میاں جی کی کہی ہوئی باتوں کے حصار میں تھا، وہ معمول کے مطابق اپنے دیگر امور نمٹاتا رہا مگر اس کا ذہن اسی معاملے میں الجھ کر رہ گیا تھا، شام ہوئی تو اس کی بیوی شہناز، اس کے لیے کھانا لے آئی۔

''اماں نے کھانا کھا لیا ہے؟'' اسلم نے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ اماں کو تو میں نے بچوں سے بھی پہلے گرم گرم روٹی بجھوا دی تھی۔''

''اچھی بات ہے۔''

''مگر آج تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس یونہی۔ میں سوچ رہا تھا کہیں کسی وجہ سے اماں ہم سے ناخوش نہ ہو۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ میں اپنی طرف سے ان کا پورا خیال رکھتی ہوں۔''

''یہ تو میں سمجھتا ہوں، لیکن پھر بھی رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ہم اماں کے پاس جا کر نہیں بیٹھتے، اسے وقت نہیں دیتے۔''

''سارا دن تو اماں یہیں میرے پاس ہی ہوتی ہیں اور رات کا کھانا میں انہیں ان کے کمرے میں ہی بچوں کے ہاتھ بجھوا دیتی ہوں، بس اسی وجہ سے اماں کے پاس کبھی جا کر بیٹھنا نہیں ہوتا۔''

''ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہے۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی اور رات کو وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں اس وقت لیٹی ہوں گی، اب انہیں کیا تنگ کرنا ہے۔'' باتوں کے دوران ہی اسلم کھانے سے فارغ ہو گیا تھا، شہناز نے برتن اٹھائے اور انہیں کچن میں رکھ کر واپس وہیں آ بیٹھی۔

''آج اماں کے پاس جا کر نہ بیٹھیں؟'' اسلم نے دل کی بات کی۔

''چلیں ابھی چلتے ہیں'' بات کرتے ہی شہناز اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہناز کو اٹھتے دیکھ کر اسلم بھی اٹھ گیا، پھر وہ

دونوں اماں کے کمرے کی طرف چل پڑے، وہ کمرے میں داخل ہوئے تو چاچی تسبیح کرنے میں مشغول تھی، چاچی کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اچانک وہاں آ جائیں گے، پھر بھی وہ خوش تھی کہ کرم دین کے تعویزوں نے کام کر دکھایا تھا اور اس کی بہو اور بیٹا، جو کبھی بھی اس کے کمرے میں نہیں آئے تھے، وہ آج چلے آئے تھے۔

''کیا کر رہی ہو اماں؟'' ماں کے پاس بیٹھتے ہی اسلم نے سوال کیا۔

''میں نے کیا کرنا ہے پتر۔ بس نماز پڑھ کر تسبیح کر رہی تھی۔''

''کبھی ادھر ہمارے کمرے میں بھی آ کر بیٹھ جایا کرو۔''

''بس تم لوگ اپنی باتوں میں لگے ہوتے ہو۔ میں یہاں اللہ اللہ میں لگی رہتی ہوں۔''

''اماں تم ہم سے خوش تو ہو ناں؟'' اسلم نے ماں کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔

''میں تو خوش ہوں، لیکن آج تم لوگوں کو میرا خیال کیسے آ گیا؟''

''اماں اب ایسے تو نہ کہو۔ کیا میں ہر روز وقت پر تمہیں تازہ روٹی پکا کر نہیں دیتی؟'' چارپائی پر بیٹھی چاچی کی ٹانگیں دباتے ہوئے شہناز نے پیار سے کہا۔

''میں نے تو کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا، تم لوگ خود ہی ایسا سوچ رہے ہو۔''

''بس اماں آج میرا دل چاہ رہا تھا تمہارے پاس بیٹھوں، اس لیے ہم دونوں آ گئے۔ سچ پوچھو تو اب کچھ دیر تمہارے پاس بیٹھنے سے سکون سا مل گیا ہے'' اسلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''خوش رہو میرے بچو۔ خدا تمہیں کبھی کوئی پریشانی نہ دکھائے'' چاچی نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں جانے لگے تو اچانک اسلم کی نظر تکیے پر پڑ گئی جو بہت گندہ ہو رہا تھا۔

''تکیے کا غلاف دیکھو کس قدر گندا ہو رہا ہے، اسے تو بدلو۔'' اسلم نے تکیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہناز سے کہا۔

''میں ابھی بدل دیتی ہوں۔'' شہناز نے تکیہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں۔ پھر کبھی بدل دینا'' چاچی نے شہناز سے تکیہ جھپٹتے ہوئے کہا۔

''اماں کیا ہو گیا۔ دو منٹ لگیں گے میں ابھی بدل کے لا دوں گی'' شہناز نے چاچی سے سرہانہ پکڑتے ہوئے کہا۔

چاچی نے سرہانہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، جیسے کسی نے لے لیا تو اس کے ہاتھ سے بہت بڑا خزانہ چھن جائے گا، پھر شہناز کو سمجھاتے ہوئے بولی ''میں کہہ جو رہی ہوں، کل دن میں کسی وقت بدل دینا، اس وقت بدلنے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

''چلو اماں جیسے کہتی ہے ویسے کر لو۔ مگر یاد سے کل صبح ہی بدل دینا'' اسلم نے بات ختم کرنے کے لیے کہا پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے بولا ''اچھا اماں اب تم آرام کرو، ہم چلتے ہیں۔''

وہ کمرے سے نکلے تو چاچی کی جان میں جان آئی، وہ کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہی، جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ دونوں ہی اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں تو اٹھی اور احتیاط سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی، اسے معلوم تھا کہ اب وہاں کوئی نہیں آئے گا مگر پھر بھی اس نے اپنی تسلی کے لیے چٹخنی چڑھا دی تھی تا کہ کہیں ان دونوں میں سے پھر کوئی

وہاں نہ آدھمکے۔ سب سے زیادہ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں اس کی بہو ابھی تکیے کا غلاف بدلنے کے لیے نہ چلی آئے، اس لیے اس نے جلدی سے سرہانے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے وہ تعویز نکال لیے جو اس نے کرم دین کے کہنے کے مطابق وہاں رکھے تھے۔

چاچی نے بہو اور بیٹے کے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا اور تعویز ٹھکانے لگانے کے بعد اپنی چارپائی پر بیٹھی پھر سے تسبیح کرنے لگی تھی، بیٹے اور بہو کے آنے سے قبل وہ مکمل یکسوئی کے ساتھ تسبیح کر رہی تھی مگر اب تسبیح تو اسی طرح ہو رہی تھی لیکن ذہن اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ تکیہ غلاف میں رکھے ہوئے تعویزوں پر اگر ان کی نظر پڑ جاتی تو کیا ہوتا۔

شہناز، خاوند کے کہنے پر خاموشی سے ساس کے کمرے سے چلی تو آئی تھی مگر اس کے ہاتھوں سے چاچی کے تکیہ چھیننے پر اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا اور اس کے دماغ میں بہت سے سوال اٹھنے لگے تھے، وہ سوچنے لگی تھی کہ ہو نہ ہو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے، ورنہ وہ اس کے ہاتھوں سے سرہانا کبھی نہ چھینتی۔

چاچی کا روز کا معمول تھا کہ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر برقعہ اٹھاتی اور کسی نہ کسی کے ہاں جا بیٹھتی، پھر دو چار گھروں میں ضرور ہو کر آتی، جس سے لوگوں کو گھر بیٹھے ہی محلے کی ساری خبریں مل جایا کرتیں۔ صبح ہوئی تو شہناز اس ٹوہ میں لگ گئی کہ وہ کب برقعہ لے کر نکلتی ہے۔

بچے اپنے اپنے اسکولوں کو جا چکے تھے اور اسلم بھی اپنی دکان پر چلا گیا تھا، چاچی نے حسب عادت برقعہ اٹھایا اور گھر سے نکل گئی، شہناز کو علم تھا کہ اب وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی، اس نے دھلے ہوئے کپڑوں میں سے تکیے کا غلاف لیا اور چاچی کے کمرے میں پہنچ گئی، اس نے جلدی سے تکیے کا غلاف اتار ڈالا تھا، اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی وہ غلاف اتارے گی اس میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور نکلے گی لیکن غلاف اتارنے پر جب کوئی بھی چیز برآمد نہ ہوئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔

اس نے غلاف تبدیل کر دیا تھا مگر اس کی الجھن ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، اس کے دماغ میں اٹھنے والے سوال ابھی تک اپنی جگہ قائم تھے، چاچی اپنی عادت کے مطابق اتنی جلدی آنے والی نہیں تھی، اس لیے اس نے کمرے کی تلاشی لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا، تھوڑی ہی دیر میں اس نے کمرے کے کونے کھدروں کی تلاشی لے لی تھی مگر کوئی بھی قابل اعتراض چیز اس کے ہاتھ نہیں لگی تھی۔

اچانک شہناز کی نظر اس طرف اٹھ گئی جہاں قرآن مجید رکھا تھا، کمرے میں وہی ایک جگہ باقی رہ گئی تھی جس کی اس نے تلاشی نہیں لی تھی، اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی، قرآن مجید کے نیچے رکھے ہوئے کچھ تعویز اس کے ہاتھ لگ گئے تھے مگر ساتھ ہی وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ اس نے وہ تعویز کیوں کروائے تھے، تعویزوں کے پاس ہی پڑی ہوئی سوئی اور اس میں پڑے ہوئے کالے دھاگے نے اسے مزید الجھا دیا تھا، اس نے تعویزوں کو وہیں پڑا رہنے دیا اور کمرے سے نکل آئی۔

چاچی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گھر کا کوئی فرد کبھی اس کے کمرے کی تلاشی لے گا، ورنہ وہ تعویز کسی ایسی محفوظ جگہ پر چھپاتی جہاں سے ڈھونڈنے پر بھی کسی کے ہاتھ نہ لگتے، یہ جانے بغیر کہ وہ تعویز کس مقصد کے لیے کروائے گئے تھے، شہناز کے دل میں ساس کے خلاف نفرت اور غصہ بھر گیا تھا، وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسلم دکان سے رات کو واپس آئے گا، دوپہر سے ہی اس کا انتظار کرنے لگی تھی، اس نے خاوند کے آنے پر جو کچھ کرنا تھا اس کی ہر طرح سے منصوبہ بندی کر لی تھی، وہ بظاہر اپنے معمولات میں مشغول تھی مگر اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ رات کو اسلم کے دکان سے واپس آتے ہی گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ بھلا ماں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ تعویز کرواتی پھرے" بیوی کی بات سن کر اسلم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم ہمیشہ اپنی ماں کی ہی حمایت کرو گے، کیونکہ تمہاری نظر میں تو میں جھوٹی ہوں" شہناز نے چیختے ہوئے کہا۔

"ذرا سی بات ہے اور تم اس طرح چلا رہی ہو جیسے آسمان سر پر گر پڑا ہو۔"

"تمہارے لیے یہ ذرا سی بات ہو گی مگر میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

"بات کو خواہ مخواہ بڑھانے سے بہتر ہے کہ ماں کے پاس چل کر بات کر لی جائے" اسلم نے شہناز کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"چلو اور چل کر اپنی نظروں سے بھی دیکھ لو۔ پھر شاید تمہیں میری بات کا یقین آ جائے" شہناز نے تلخ لہجے میں بات کی۔

چاچی عشاء کی نماز کے بعد اپنی چارپائی پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھی اسلم اور شہناز وہاں آئے تو انہیں اچانک اپنے کمرے میں دیکھ کر ایک پل کے لیے وہ تھوڑا سا گھبرا گئی تھی، کیونکہ اس کمرے میں ان کا آنا کم ہی ہوتا تھا، ایک روز قبل بھی وہ دونوں وہاں آئے تھے اور آج پھر وہ ایک ساتھ اس کے کمرے میں آئے تھے، اس لیے کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی جبکہ دوپہر کو اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں تکیے کا غلاف بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔

"آجاؤ پتر آجاؤ۔" چاچی نے ان دونوں کو دیکھ کر چارپائی پر جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"اماں! تم نے قرآن مجید کے نیچے کوئی تعویز رکھے ہوئے ہیں؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی اسلم نے بلا تمہید بات کی۔

تعویزوں کا سنتے ہی چاچی کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ یہ سن کر سنبھل گئی تھی کہ تعویز قرآن مجید کے نیچے رکھے ہیں اور حیران ہو کر بولی "کون سے تعویز؟"

"اماں، شہناز کا کہنا ہے کہ تم نے قرآن مجید کے نیچے تعویز چھپا رکھے ہیں اور تعویزوں کے ساتھ ایک سوئی بھی رکھی ہے جس میں کالے رنگ کا دھاگہ ڈالا ہوا ہے۔" اسلم نے تفصیل سے بات کی۔

بیٹے کی بات سن کر چاچی مکمل اعتماد کے ساتھ چارپائی سے اٹھی اور قرآن مجید کے نیچے سے کاغذ کے دو ٹکڑے اور سوئی دھاگہ اٹھا لائی اور انہیں دکھاتے ہوئے بولی "کہیں تم ان کی بات تو نہیں کر رہے؟"

شہناز نے ساس کے ہاتھ میں تہہ کیے ہوئے کاغذ کے دو ٹکڑے اور سوئی میں کالے رنگ کا پڑا ہوا دھاگہ دیکھ کر فاتحانہ انداز میں خاوند کی طرف دیکھا تھا، اس کے اس طرح دیکھنے پر کسی شکست خوردہ شخص کی مانند اسلم کی گردن جھک گئی تھی۔

"میں تو حیران ہوں تم لوگوں کی سوچ پر۔" ماں کی آواز بیٹے کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے گردن اٹھا کر دیکھا، ماں کہہ رہی تھی "انہیں کھول کر دیکھو اور پڑھ کر بتاؤ۔ کیا یہ تعویز ہیں؟" چاچی نے تہہ کیے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے اسلم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی بولی "ان میں سے ایک پر لکھا ہوا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد یہ آیات پڑھنے سے گھر میں کبھی

تنگدستی نہیں آتی اور دوسرے پر لکھا ہے کہ یہ آیات فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے سے پہلے پڑھی جائیں تو گھر والوں پر آنے والی آفات ٹل جاتی ہیں۔"

ماں کی بات سن کر تصدیق کے لیے اسلم کاغذ کے ان ٹکڑوں پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگا، ابھی وہ پڑھ ہی رہا تھا کہ چاچی ایک قمیض نکال لائی اور بولی "اور یہ ہے وہ قمیض جو ادھڑ گئی تھی جسے میں نے اس سوئی دھاگے سے سیا تھا۔ اگر اس میں بھی کوئی شک ہو تو کالے رنگ کے دھاگے سے کی ہوئی سلائی دیکھ کر اپنی تسلی کرلو۔"

کچھ دیر پہلے تک شہناز کا پلڑا بھاری تھا اور اسلم ڈرا سہا نظریں نیچی کیے گردن جھکائے کھڑا تھا مگر اب اصل حالات سے آگاہی کے بعد وہ شیر بن گیا تھا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے دونوں کاغذ شہناز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "لو۔ انہیں پڑھ کر تم بھی اپنا شک دور کرلو۔"

اب شرمندہ ہونے کی باری شہناز کی تھی، وہ حقیقت جان چکی تھی، پھر بھی اپنی تسلی کے لیے وہ کاغذ پڑھنے لگی جنہیں تعویز سمجھ کر اس نے بلا تحقیق آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اسلم اور شہناز کچھ دیر تک وہیں گم صم کھڑے رہے پھر خاموشی سے وہاں سے نکل گئے اور چاچی کی جان میں جان آئی۔

"کیا ملا تمہیں اس سارے ڈرامے سے؟ میں کہہ بھی رہا تھا کہ اماں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ تعویز کرائے لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی اور بغیر سوچے سمجھے چیخنے چلانے لگی۔"

"میری جگہ اگر تم بھی ہوتے تو ایسا ہی کرتے۔"

"میں تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ سوچ کر بھی شرمندگی ہو رہی ہے کہ اماں کیا سوچتی ہو گی۔"

"اچھا اب اس بات کو یہیں ختم کرو اور بھول جاؤ کہ کوئی بات ہوئی تھی۔"

"میں تو بھول جاؤں گا۔ مگر تم یہ نہ بھول جانا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا" اسلم نے جان بوجھ کر اس انداز میں بات کی تھی کہ شہناز ہنس پڑی اور جلدی سے اس کے لیے کھانا لانے چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

پہلے بچے کے بعد دوسرے بچے کی موت کا بھی کرم دین نے کوئی خاص اثر نہیں لیا تھا، اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے سینے میں دل کی جگہ کوئی پتھر رکھا ہوا تھا جبکہ عائشہ بری طرح نڈھال تھی، وہ گھر کے ضروری کام نمٹاتی اور دونوں بچوں کو اپنے دائیں بائیں لٹا کر خاموشی سے چارپائی پر پڑی آنسو بہائے جاتی۔

کرم دین کتاب میں سے پنجہ اور وظائف پڑھنا چاہتا تھا مگر وہ وقتی طور پر رک گیا تھا، لیکن جب اسے حالات معمول پر آتے دکھائی دینے لگے، صبر کے بھی پیمانے لبریز ہو گئے اور مزید انتظار اس کے بس میں نہ رہا تو اس نے پھر سے ادھورے وظائف مکمل کرنے کا پروگرام بنالیا۔

"میں جانتا ہوں، ایک ماں کے لیے اولاد کی موت کا صدمہ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے، لیکن اس دنیا میں رہنے کے لیے بہت سے دکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ تم بھی خود کو سنبھالو۔ بچے خدا کی دی ہوئی نعمت تھی، اس نے واپس لے لی۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔" موقعہ پاتے ہی کرم دین نے بات شروع کی۔

"میں جانتی ہوں۔ یہ سب تمہارے اعمال کی سزا ہے جو میرے بچوں کو بھگتنا پڑی۔"

"تم تو خوامخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔ جس طرح وہ

تمہارے بچے تھے، اسی طرح وہ میرے بھی تھے، جتنا تمہیں دکھ ہے اتنا ہی مجھے بھی دکھ ہے۔"

"تمہیں دکھ کیوں ہونے لگا۔ تمہیں تو دولت چاہئے۔ تمہاری طرف سے تو چاہے ہم سارے ہی مرجائیں۔"

"تم نے کبھی میری طرح غربت دیکھی ہوتی تو آج اس طرح کی بات نہ کرتی۔"

"غربت دور کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری طرح ڈھکوسلوں سے غربت کبھی دور نہیں ہوتی۔"

"تم کیا جانو دولت میں کتنی طاقت ہے۔"

"نہیں چاہئے مجھے ایسی دولت، جس کے لیے مجھے اپنے بچوں کی قربانی دینا پڑے۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا۔ دولت سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی نہیں۔"

"اور تم بھی یاد رکھنا۔ میری دولت میرے بچے ہیں۔ اگر مجھ سے یہی چھن گئے تو مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا۔"

"میں تمہیں دولت دینا چاہتا ہوں اور تمہیں بچوں کی پڑی ہے۔"

"کرم دین۔ ایک ماں کا امتحان مت لو۔ ایسا نہ ہو کسی روز میں تمہارے سامنے آکھڑی ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اپنے بچوں کو اٹھاؤ اور یہاں سے چلتی بنو، کیونکہ مجھے نہ تم چاہئے اور نہ تمہارے بچے۔ مجھے دولت چاہئے۔ صرف دولت۔ سمجھی۔"

عائشہ کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ کرم دین کو سمجھا کر راہ راست پر لے آئے مگر وہ اسی کو بچوں سمیت گھر سے نکل جانے کا حکم سنا رہا تھا، یہی وہ لمحہ تھا، جب دونوں کے درمیان دیوار کھڑی ہوگئی اور وہ بندھن جو پچھلے کئی سالوں سے جڑا ہوا تھا اس میں دراڑ پڑ گئی۔

"سوچ لو کرم دین۔ ایسا نہ ہو پھر تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے۔"

"پچھتایا ہمیشہ غلط فیصلوں پر جاتا ہے اور میرے خیال میں، میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کر رہا۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تم دولت کی خاطر ہمیں ٹھوکر مارنا ہی چاہتے ہو تو میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گی" عائشہ نے بھرائی ہوئی آواز میں حوصلے سے بات کی، پھر رات بھر وہ پاس پاس لیٹے رہے مگر ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

عائشہ رات بھر جاگتی رہی، سو کرم دین بھی نہیں سکا تھا مگر وہ اس امید پر جاگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے عائشہ اپنی غلطی پر پچھتاتے ہوئے اس سے معافی مانگ لے گی جبکہ عائشہ صبح ہونے کے انتظار میں رات بھر سو نہ سکی تھی۔

رات کو دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے جب کرم دین کی آنکھ لگی تو اسے کچھ ہوش نہ رہا، صبح جب کرم دین کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی اور عائشہ بچوں کو ساتھ لیے گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت عائشہ نے سوچا تھا کہ اپنے والدین کے پاس جانے کی بجائے وہ کہیں اور جائے لیکن پھر اپنے خاندان کی بدنامی کے ڈر سے اس نے اپنے والدین کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆☆☆

عائشہ کا گھر اسی شہر میں تھا، وہ چاہتی تو فون کر کے اپنے باپ اور بھائیوں کو بلا سکتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، اسے ڈر تھا کہ وہ آئیں گے اور سمجھا بجھا کر پھر سے اسے کرم دین کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیں گے، جو اسے کسی بھی حال میں قبول نہیں تھا، اسی لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچوں کو لے کر

خود اپنے گھر پہنچ جائے گی، اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اس وقت گھر پہنچے گی جب اس کے بھائی اور باپ اپنے اپنے کام پر جا چکے ہوں گے تاکہ جب تک وہ گھر واپس آئیں تب تک وہ اپنی ماں کو تمام حالات بتا کر اس بات کے لیے راضی کرلے کہ وہ کسی طرح اس کے بھائیوں اور باپ کو یہ بات اچھی طرح بتا دے کہ وہ کن حالات میں گھر سے نکل کر آئی ہے اور اس کا واپسی کا بھی کوئی ارادہ نہیں۔

وہ گھر پہنچی تو گھنٹی بجانے پر اس کی ماں نے دروازہ کھولا تھا، اس کی تجربہ کار نگاہوں نے عائشہ کو بچوں کے ساتھ اکیلا آنے اور اس کا اترا ہوا چہرہ اور اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے، اس کے اس خیال پر عائشہ کے آنسوؤں نے مہر ثبت کردی تھی۔

"اکیلی آئی ہو؟ وہ بھی صبح صبح۔ کرم دین ساتھ نہیں آیا؟" اپنی تسلی کے لیے غفوراں نے سوال کیا۔

"میں وہ گھر چھوڑ آئی ہوں ماں۔"

"ہائے...... ہائے...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو" غفوراں نے اپنے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں ماں۔ اسی لیے تو بچوں کو لے کر اکیلی یہاں آئی ہوں۔"

"کوئی ایسی بات تھی تو ہمیں فون کردیتی۔ تمہارا باپ آجاتا یا تمہارے بھائی وہاں آکر کرم دین کو سمجھا دیتے۔ یوں گھر چھوڑ کر تو نہ آتی۔"

غفوراں نے روتے ہوئے کہا۔

"ماں تم اندر تو چلو۔ میں تمہیں سکون سے بیٹھ کر پوری بات بتاتی ہوں"

"اب کیا سنوں میں۔ تم نے جو کرنا تھا وہ تو کر آئی۔"

"ماں ایک بار میری بات سن لو۔ پھر تم جو کہو گی میں وہی کروں گی" عائشہ نے گڑگڑا کر التجا کی۔

دونوں بچے بھی اس کے پاس ہی سہمے کھڑے تھے، عائشہ کی بھابیاں اور بہن بھی وہیں آکھڑی ہوئی تھیں، کچھ دیر تک سبھی افراد گردنیں جھکائے افسردہ کھڑے رہے پھر اچانک غفوراں دھاڑیں مار کر رونے لگی اور عائشہ کو اپنے سینے سے چمٹا لیا، ماں کو روتے دیکھ کر عائشہ بھی رونے لگی تھی، پاس کھڑی گھر کی دوسری خواتین بھی رو رہی تھیں، دونوں بچے بھی اپنی ماں کو روتا دیکھ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر بلک پڑے تھے۔

کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی، ہر آنکھ میں آنسو تھے اور وہ سبھی عائشہ کو گھر سے نکالے جانے پر تڑپ رہے تھے۔ "چلیں آپی اندر چل کر بیٹھیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا" عائشہ کی چھوٹی بہن، آمنہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔

عائشہ کے قدم اٹھے تو جیسے سب کے مردہ جسموں میں جان آگئی اور وہ بھی آہستہ آہستہ عائشہ اور آمنہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، کچھ ہی دیر میں عائشہ یوں دکھائی دینے لگی تھی جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا تھا، آمنہ نے اسے کمرے میں بچھی چارپائی پر لٹا دیا اور خود بھی اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی دینے لگی، عائشہ کی ماں، بھابیاں اور دونوں بچے اس کے پاس ہی افسردہ چہرے لیے ہمدردی جتا رہے تھے، ان سب کی ہمدردیاں پا کر ایک بار پھر عائشہ کا دل بھر آیا اور وہ آنسو بہانے لگی۔

"بھابھی! آپی کے لیے پانی لے کر آؤ۔" آمنہ نے اپنی بھابھی کو پانی لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس کر میری بچی۔ اتنا نہ رو۔ دیکھ بچے بھی جب سے آئے ہیں سہمے کھڑے ہیں۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ لیکن تم مجھے کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے، پھر دیکھنا میں ابھی تمہارے باپ اور بھائیوں کو فون کرتی ہوں۔ وہ خود ہی معاملے کو سنبھال لیں گے۔"

"میں بتاتی ہوں ماں۔ لیکن ابھی تم بھائیوں کو فون نہ کرو۔ وہ پریشان ہوکر ابھی دوڑے چلے آئیں گے۔"

"انہیں بتانا تو پڑے گا ناں۔"

"شام کو گھر آئیں گے تو آرام سے بیٹھ کر بات کرلیں گے۔" عائشہ نے اپنی ماں کو سمجھایا اور پھر وہ تمام حالات بتانے لگی، جن کی وجہ سے اسے گھر چھوڑ کر وہاں آنا پڑا تھا۔

عائشہ نے اپنے گھر والوں کی پریشانی سے ڈرتے ہوئے اب تک جو باتیں ان سے چھپائی ہوئی تھیں، جب اس نے وہ تمام باتیں انہیں بتائیں تو انہوں نے حیران ہوکر اپنی انگلیاں منہ میں ڈال لیں اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جیسے جیسے وہ کرم دین کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتی جارہی تھی ان کی حیرانی بڑھتی جارہی تھی۔

"واہ بیٹی واہ تم کرم دین کے ظلم اور زیادتیاں سہتی رہی اور ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔" غفوراں نے بیٹی کی بات سن کر افسردہ لہجے میں بات کی۔

"جہاں تک ہوسکا۔ میں نے آپ لوگوں کو پریشانی سے بچانے کی کوشش کی اور کرم دین کو سمجھاتی رہی، لیکن جب حالات میرے بس سے باہر ہوگئے تو میں یہاں چلی آئی۔"

"اچھا۔ اب تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتہ بھجواتی ہوں، بچے بھی بھوکے ہوں گے، ان کو بھی کچھ کھانے کو دے دوں۔ بس اب تم نے اپنے دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"اچھا ماں۔" عائشہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر غفوراں بچوں کو ساتھ لیے وہاں سے نکل گئی، اس کے جاتے ہی عائشہ کی دونوں بھابیاں بھی کمرے سے چلی گئی تھیں، آمنہ وہیں چارپائی پر خاموشی سے بیٹھی عائشہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی، آمنہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے اور کمرے میں خاموشی کی وجہ سے عائشہ کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں، وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اس لیے جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ آمنہ کو جب اس بات کی تسلی ہوگئی کہ وہ سوگئی ہے تو اس نے اپنی گود میں رکھا ہوا عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اس کے سینے پر رکھ دیا اور خود اس قدر احتیاط سے چارپائی سے اٹھی کہ عائشہ کو اس کے اٹھنے کا احساس تک نہ ہوسکے اور وہ کچھ دیر سکون سے سولے۔

آمنہ وہاں سے چلی گئی تھی، اس نے چارپائی سے اٹھتے وقت بہت احتیاط کی تھی مگر پھر بھی عائشہ کو محسوس ہوگیا تھا، لیکن اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند رکھی تھیں، آمنہ کے جانے کے بعد عائشہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی مگر اس کا ذہن کرم دین کے ساتھ گزارے ہوئے سالوں کا جائزہ لینے لگا تھا، وہ سوچنے لگی کہ اس نے ہر دکھ سکھ، مشکل وقت اور تنگ دستی میں کس طرح کرم دین کا ساتھ نبھایا تھا مگر اس شخص نے اس پر کسی بھی ذریعے سے دولت کمانے کو ترجیح دی تھی، سوچتے ہوئے وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگا تھا۔

......☆☆☆......

دروازہ کھلا، پھر کھل کر بند ہوا اور کرم دین اپنی سائیکل کے ساتھ منہ لٹکائے اندر داخل ہوا، کرم دین نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا صحن میں بچھی ہوئی

چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ جان گئی تھی کہ پچھلے دنوں کی طرح آج بھی کرم دین کو کوئی کام نہیں ملا تھا اور وہ خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا، اپنے مجازی خدا کی جانب دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی اور تیزی سے کرم دین کے پاس پہنچ گئی۔

"کیا بات ہے کرم دین! بہت افسردہ دکھائی دے رہے ہو۔"

"اپنی زندگی میں دکھوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کے سوا ہے ہی کیا۔"

"لگتا ہے آج پھر کوئی کام نہیں ملا۔"

عائشہ نے سوال کیا تو کرم دین نے ہاں میں گردن ہلا دی مگر زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا۔

"اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔ آج کام نہیں ملا تو کل مل جائے گا۔" عائشہ نے کرم دین کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر بولی "اور خدانخواستہ ایک دو دن کام نہیں ملے گا تو کیا ہم بھوکے مر جائیں گے۔"

"میں جانتا ہوں، گھر میں پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ پھر اس طرح دن کیسے گزریں گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ اللہ کا دیا ہوا اس گھر میں بہت کچھ ہے، بس تم منہ ہاتھ دھو کر آؤ، میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

عائشہ کی بات سن کر کرم دین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ بے روزگاری کی وجہ سے گھر کی جو حالت ہو چکی تھی وہ اس سے پوشیدہ نہیں تھی اس لیے وہ بے یقینی کے عالم میں چارپائی سے اٹھا اور ہاتھ منہ دھونے لگا۔

کرم دین گھر آنے سے پہلے یہ سوچ کر آیا تھا کہ آج کی رات یقیناً بھوکے رہ کر ہی گزارنی پڑے گی مگر عائشہ کی بات اس کے لیے حیران کر دینے والی تھی، اس لیے اس نے بے یقینی کے عالم میں ہی منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ گیا، وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ شائد عائشہ اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چارپائی پر چھابی میں روٹی اور پلیٹ میں سالن پڑا تھا، پاس ہی پانی کا جگ اور گلاس بھی رکھا تھا، اس نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا، اسے سخت بھوک لگ رہی تھی، کھانا دیکھ کر اس کی بھوک اور بھی چمک اٹھی تھی، اس نے کسی ایسے شخص کی طرح کھانا پیٹ میں ڈالا جسے اس بات کی فکر ہو کہ اس نے جلدی سے نہ کھایا تو کھانا اس سے چھین لیا جائے گا، کھانا کھانے کے بعد اس نے اوپر تلے تین چار گلاس پانی کے بھی پیٹ میں انڈیل لیے تھے۔

کرم دین کے کھانا کھانے کے دوران عائشہ جان بوجھ کر اس کے پاس نہیں آئی تھی کہ کہیں وہ کھانے کے متعلق کوئی ایسا سوال نہ کر بیٹھے جس کا جواب اس کے پاس نہ ہو اور کھانا کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ رک جائیں، کرم دین کے کھانا کھانے کے بعد عائشہ وہاں آئی اور خالی برتن اٹھا کر لے گئی، وہ جب تک واپس آئی کرم دین سو چکا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوئی بات کیے بغیر اس اطمینان کے ساتھ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تھی کہ اگر وہ بھوکی سو رہی ہے تو کم از کم اس کا شوہر تو کھانا کھا کر سویا ہے۔

ان کے سر پر اس قدر ادھار چڑھ چکا تھا کہ کوئی بھی دکاندار انہیں ادھار سودا دینے کے لیے تیار نہیں تھا، فیکٹری سے ملازمت چھوٹ جانے کے بعد کرم دین کئی دن سے بے کار پھر رہا تھا، اسے نہ کوئی ڈھنگ کا کام مل رہا تھا اور نہ ہی کوئی مزدوری وغیرہ مل رہی تھی، کچھ دن تو جیسے تیسے جوڑ توڑ کر کے گزر گئے تھے مگر اب بات فاقوں تک پہنچ گئی تھی، عائشہ کو معلوم تھا کہ اگر اسے کہیں محنت مزدوری کا کام مل بھی گیا تو جو تھوڑے بہت پیسے ملیں گے وہ تو شام کو ہی ملیں گے، اس وقت وہ تھکا ہارا گھر لوٹے گا اسے بھوک بھی لگی ہو گی اور کھانا

پکانے میں خاصی دیر لگ جاتی، اس لیے اس نے ہمسایوں کے ہاں بچوں کو بھیج کر تھوڑا سا سالن منگوا لیا تھا، ایک اور گھر سے وہ خود ادھار کے طور پر تھوڑا سا آٹا لے آئی تھی، اس آٹے کی روٹی پکا کر کچھ اس نے بچوں کو کھلا دی تھی اور باقی کی روٹی اس نے کرم دین کے لیے رکھ دی تھی، کرم دین کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹا سکون کی نیند سویا خراٹے لے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ایک بار جھوٹے منہ سے بھی اتنا نہیں پوچھا تھا کہ اس نے بھی کھانا کھایا ہے کہ نہیں۔

سوچوں کا دھارا نہ جانے اسے کس طرف بہائے جا رہا تھا، وہ جس واقعہ کے متعلق سوچ رہی تھی، وہ سالوں پہلے کا تھا مگر آج بھی سوچ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، بظاہر یہ چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا، قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی مگر اس نے کسی کے قدموں کی آواز سنی تھی، کوئی اسی طرف آ رہا تھا، اس لیے اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا اور جلدی سے انہیں دوپٹے کے پلو سے صاف کر کے پھر سے آنکھیں یوں بند کر لیں جیسے وہ سو رہی تھی۔

"آپی۔" آمنہ ٹرے میں ناشتہ رکھے کمرے میں آئی تو عائشہ کو سوتے دیکھ کر آہستہ سے آواز دی۔

غفوراں جب سے کمرے سے گئی تھی، مسلسل روئے جا رہی تھی اس لیے اس نے ناشتہ دے کر عائشہ کے پاس آمنہ کو بھیجا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا سامنا نہیں کر پائے گی، آمنہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی، دونوں بہنوں کا آپس میں پیار بھی بہت تھا، اور آمنہ بھی اپنی بہن کے پاس بیٹھ کر باتوں سے اس کا دل بہلانا چاہتی تھی۔

آمنہ کی آواز پر عائشہ نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے "ہوں" کہا۔

"آپی ناشتہ کر لو۔" آمنہ نے ٹرے ہاتھوں میں لیے کھڑے کھڑے بات کی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"آپی تھوڑا سا ہی کھا لیں۔"

"میں نے کہا ناں مجھے بھوک نہیں۔"

"چلیں۔ آج میں اپنی آپی کو خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں۔" ٹرے ایک طرف رکھتے ہوئے آمنہ نے عائشہ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے...... بھوک...... نہیں ہے...... سمجھی تم۔" عائشہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

عائشہ جس انداز میں بولی تھی، آمنہ کو اس کا دکھ پہنچا تھا مگر اس نے اپنے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے اور پیار سے بولی۔ "جب میں اپنی آپی کو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے کھلاؤں گی تو پھر دیکھنا بھوک نہیں بھی ہو گی تو کھانے کا کتنا مزہ آئے گا۔"

آمنہ کی بات سن کر عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے مگر وہ جانتی تھی کہ وہ جس حالت سے گزر رہی ہے ایسے میں ایک نوالہ بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر پائے گا۔

"جب میں نے ایک بار کہہ دیا۔ میں نے کچھ نہیں کھانا۔ تو پھر کیوں ضد کیوں کیے جا رہی ہو۔ خدا کے لیے جاؤ یہاں سے اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" عائشہ چیخی۔

آمنہ کا خیال تھا کہ وہ اپنی آپی کو منا لے گی، اس کے لیے اس نے کوشش بھی کی تھی مگر عائشہ نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور اسے بری طرح ڈانٹ دیا، بہن کی بات سن کر آمنہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے، اس نے اس خیال سے کہ کہیں اس کے آنسو اس کی بہن کو اور کمزور نہ کر دیں، ٹرے اٹھائی اور جلدی

سے وہاں سے نکل گئی۔

آمنہ کے جانے کے بعد عائشہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی، وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی مگر اس کے پاس کمرے میں کوئی نہ آیا، آمنہ نے اپنی ماں کو جو حالت باہر جا کر بتائی تھی وہ جان کر نہ غفوراں خود آئی اور نہ ہی اس نے کسی اور کو کمرے میں جانے کی اجازت دی، اس نے دونوں بچوں کو بھی اپنے پاس بٹھائے رکھا کہ کہیں انہیں دیکھ کر عائشہ مزید پریشان نہ ہو جائے، دیر تک روتے رہنے سے عائشہ کے سر کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تھا پھر آہستہ آہستہ خود ہی اس کی آنکھیں بوجھل ہوتی چلی گئیں اور وہ سو گئی۔

☆☆☆☆☆

عائشہ اور بچوں کو گھر میں نہ پا کر ایک پل کے لیے کرم دین کو ہلکا سا جھٹکا لگا تھا مگر پھر اگلے ہی لمحے بیوی اور بچوں کو غیر اہم جان کر اس نے اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹک دیا، کرم دین کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ عائشہ بچوں کو لے کر اپنے والدین کے سوا کہیں اور نہیں گئی ہو گئی، وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ والدین کے علاوہ کہیں اور بھی گئی ہو گی پھر بھی اسے اس کی کیا پروا، اسے یہ سوچ کر ہی اطمینان ہو رہا تھا کہ کم از کم اب اس کی بے وقت کی نصیحتوں اور روک ٹوک سے جان چھوٹی رہے گی۔

بیوی بچوں کے جانے پر کرم دین خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، وہ خود کو اس پنچھی کی طرح سمجھ رہا تھا جسے مدت کے بعد رہائی ملی ہو، اس کے استری کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھے تھے، اس نے نہانے کے بعد وہ کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور اچھی طرح تیار ہو کر اپنے حجرے میں چلا گیا، وہاں اس نے بہت سی اگر بتیاں جلا دیں، اگر بتیوں کے دھوئیں سے کمرے میں تیز خوشبو پھیل گئی تھی، پھر اس نے قوالیوں کی کیسٹ لگا دی اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کیے ہلکا ہلکا سر دھننے لگا۔

کچھ دیر ایسی سرور کی سی کیفیت میں گزر گئی، اس کی آنکھیں بند تھیں اور اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا، کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی، دستک سن کر کرم دین نے آنکھیں کھول دیں، اسی لمحے ایک ماڈرن خاتون کمرے میں داخل ہوئی، اگر بتیوں سے نکلنے والے دھوئیں کی وجہ سے کمرے کی فضا بوجھل تھی، جیسے ہی وہ خاتون کمرے میں داخل ہوئی، خوشبو کا ایک جھونکا بھی کمرے میں داخل ہوا جو کرم دین کے جسم و جان کو معطر کر گیا، کرم دین کو اسے پہچاننے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ وہی عورت تھی جو کچھ روز پہلے ہی اپنی بہو کو طلاق دلوانے کے لیے اس سے تعویز لے کر گئی تھی۔

وہ ماڈرن خاتون کرم دین کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی تھی، ساتھ ہی ایک اور عورت جو اپنی شکل و صورت اور پہناوے سے ملازمہ دکھائی دیتی تھی، ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ اور اس کے اوپر رکھا ہوا ایک مردانہ سوٹ لیے اندر داخل ہوئی، ملازمہ نے مٹھائی کا ڈبہ اور سوٹ کرم دین کے سامنے رکھ دیا اور خود اپنی مالکن سے تھوڑا سا ہٹ کر بیٹھ گئی۔

''سائیں جی! یہ مٹھائی اور کپڑوں کا جوڑا آپ کی نذر ہے۔'' خاتون نے دونوں چیزیں اٹھا کر کرم دین کے آگے رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے پرس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نئے نوٹ نکال کر کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ وہ رقم ہے جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔''

مٹھائی اور سوٹ دیکھ کر کرم دین کو کوئی زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن جب عورت نے ہزار ہزار کے

نئے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھے تو کرم دین کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ سائیں کرم دین کے پاس چل کر آئی ہیں، اور یہاں جو بھی آتا ہے جھولیاں بھر کر لے جاتا ہے اور اپنے دل کی سبھی مرادیں پوری کر لیتا ہے'' مٹھائی کا ڈبہ، سوٹ اور ان پر پانچ ہزار روپے رکھ کر کرم دین نے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''سچ کہا سائیں جی آپ نے۔ واقعی اس ڈائن سے جس طرح آپ نے میری اور میرے بیٹے کی جان چھڑائی ہے، وہ آپ کا ہی کام تھا، بس اب میرا ایک کام اور کر دیجیے، پھر جس قدر کہیں گے میں آپ کی خدمت کر دوں گی۔''

''سائیں کرم دین تو بیٹھا ہی لوگوں کی خدمت کے لیے ہے۔ آپ بتائیں مسئلہ کیا ہے۔''

''بس سائیں جی۔ کچھ ایسا کر دیجیے جہاں میں بیٹے کی شادی کرنا چاہوں۔ وہ انکار نہ کرے۔''

''اس طرح کا کام تو اور بھی بہت سے لوگ کر دیں گے۔ لیکن مزہ تو اس بات میں ہے کہ جہاں آپ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہیں، اس کے لیے وہ خود آپ سے کہے''

''کیا ایسا ممکن ہے سائیں جی؟''

''سائیں کرم دین اور دوسرے عاملوں میں یہی تو فرق ہے۔''

کرم دین کی بات سن کر عورت نے اپنا پرس کھولا اور ایک ہزار روپے کا کڑکڑاتا ہوا نوٹ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ''سائیں جی، فی الحال آپ یہ رکھ لیجیے۔''

ہزار کا نوٹ دیکھ کر کرم دین کا دل چاہا کہ وہ جلدی سے وہ نوٹ عورت کے ہاتھوں سے جھپٹ لے لیکن وہ جان چکا تھا کہ وہ موٹی آسامی ہے اور اس سے مزید رقم نکلوانا کوئی زیادہ مشکل نہیں، اس لیے اس نے خود کو کنٹرول کیا اور حیران کن لہجے میں بولا۔

''اتنے بڑے کام کے اتنے سے پیسے۔ بی بی کہیں آپ میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہی۔''

''سائیں جی ابھی آپ یہ تو رکھیں، کام ہونے پر اور بھی دوں گی۔''

''بی بی اگر یہ کام کروانا ہے تو ایڈوانس کے طور پر آپ کو دس ہزار تو دینے ہی ہوں گے۔''

کرم دین کی بات سن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی اور پھر کوئی بات کیے بغیر پرس میں سے گن کر نو ہزار روپے نکال کر پہلے سے پکڑے ہوئے نوٹ کے ساتھ ملاتے ہوئے کرم دین کو پکڑا دیے اور بولی۔

''لیں سائیں جی، پورے دس ہزار ہیں لیکن اب میرے کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

''بی بی آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں اور سائیں کرم دین کیا کر کے دکھاتا ہے اس کا انتظار کریں۔'' کرم دین نے رقم پکڑ کر گنے بغیر پہلے والے نوٹوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا سائیں جی۔ اب ہمیں اجازت دیں'' عورت نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اسے اٹھتا دیکھ کر پاس بیٹھی ہوئی ملازمہ بول پڑی ''باجی......وہ......''

ملازمہ کی بات سن کر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا اور وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی اور کرم دین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''اور ہاں' سائیں جی اس بے چاری کو بھی کوئی تعویز دے دیں۔ اس کا گھر والا اسے بات بات پر مارتا پیٹتا ہے۔''

کرم دین نے ملازمہ سے کوئی بھی سوال کیے بغیر کاغذ قلم اٹھایا اور تعویز لکھنے لگا، تعویز بنانے میں کرم

دین کو چند منٹ لگے اس نے کاغذ قلم ایک طرف رکھا اور ملازمہ کی طرف تعویز بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دو تعویز ہیں، ان میں سے ایک اپنے بازو پر باندھ لینا اور دوسرا کسی طرح پانی میں گھول کر اپنے گھر والے کو پلا دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ملازمہ نے تعویز پکڑ کر اپنے بائیں ہاتھ میں سنبھال لیے اور ایک سو کا نوٹ، جو اس نے مضبوطی سے اپنی مٹھی میں تھام رکھا تھا اور ہاتھوں میں آنے والے پسینے سے گیلا ہو چکا تھا، کرم دین کی طرف بڑھا دیا، کرم دین نے سو کا نوٹ لے کر کوئی بات کیے بغیر پہلے والے نوٹوں کے ساتھ رکھ دیا، ساتھ ہی دونوں خواتین اٹھ گئیں اور خدا حافظ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

وہ دونوں کمرے سے نکلیں تو کرم دین نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے کان ان کے قدموں کی آواز پر لگا دیے، آہستہ آہستہ قدموں کی آواز دور ہوتی گئی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ہی باہر چلی گئی ہیں، کرم دین کو جب اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ دونوں گھر سے نکل گئی ہیں تو اس نے نوٹ اٹھا کر گنے اور پھر احتیاط سے اپنی قمیض کی جیب میں ڈال لیے، رقم جیب میں ڈال کر اس نے جیب کو اچھی طرح تھپتھپایا، پھر مٹھائی کا ڈبہ کھول کر اس میں سے اپنی پسند کی مٹھائی کھائی اور ڈبہ اسی طرح بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

نوٹوں کو جیب میں ڈالنے اور مٹھائی کھانے سے فارغ ہو کر کرم دین نے وہی قوالیوں والی کیسٹ لگا لی جو وہ ان عورتوں کے آنے سے پہلے سن رہا تھا، قوالی سنتے ہوئے وہ پہلے بھی ہلکا ہلکا سر دھن رہا تھا مگر جیب میں رکھے ہوئے ہزار ہزار کے نوٹوں نے اس پر عجیب سا خمار چڑھا دیا تھا اور وہ نیم مدہوشی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔

چاچی خیری دیر تک باہر گلی میں کھڑی دروازہ پیٹتی رہی مگر جب کسی نے بھی آ کر دروازہ نہ کھولا تو اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا، اسے اپنی بیوقوفی پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹتی رہی جبکہ دروازہ تو پہلے سے کھلا تھا، اندر آتے ہی چاچی نے اپنا برقعہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور گھر میں ادھر ادھر عائشہ کو ڈھونڈنے لگی، وہ حیران تھی کہ وہ سب کہاں چلے گئے تھے، وہاں سے ناکامی کے بعد وہ اس کمرے کی طرف آ گئی جو کرم دین نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور جہاں سے قوالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، دروازہ بند تھا، جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، کرم دین نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔

''آ جا...... چاچی آ جا۔''

''میں نے گھر میں ہر جگہ دیکھ لیا عائشہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ کہیں گئی ہے کیا؟'' چاچی نے کرم دین کے سامنے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہ تو بچوں کے ساتھ اپنے مائیکے گئی ہے۔ تم اپنی سناؤ۔ اب تمہاری بہو اور بیٹا تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہیں ناں؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں۔ سچی بات ہے، وہ دونوں ہی اب میری بہت خدمت کرتے ہیں۔''

''دیکھ لو چاچی پھر۔ تم کتنی پریشان تھی۔''

''مجھے وہ سب کچھ یاد ہے جو تم نے میرے لیے کیا۔ اسی لیے تو اٹھتے بیٹھتے تمہارے لیے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔''

''اچھا چلو چھوڑ دو ان باتوں کو۔ لو مٹھائی کھاؤ۔''

کرم دین نے مٹھائی کا ڈبہ چاچی کے سامنے رکھتے

ہوئے کہا۔

''عائشہ کب تک آ جائے گی؟'' چاچی خیری نے مٹھائی کھاتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ مرضی کی مالک ہے چاچی! دیکھیں کتنے دن بعد آتی ہے۔''

''چلو اچھا۔ اپنے ماں باپ کے پاس گئی ہے کچھ دن رہ لے گی۔'' بات کرتے کرتے چاچی نے مٹھائی کے شیرے سے بھری انگلیاں اپنی زبان سے چاٹیں اور کھڑی ہو گئی۔

''بس چاچی جا رہی ہو؟''

''عائشہ کو دیکھے کئی دن ہو گئے تھے۔ اسے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا اس لیے چلی آئی تھی۔ اب وہی نہیں ہے تو بیٹھ کر کیا کروں؟''

''چاچی اگر جا رہی ہو تو میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو گی؟''

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔ بتاؤ کیا کام ہے؟''

''بس جاتے جاتے مبارک کو دیکھ لینا، اگر وہ گھر میں ہوا تو اسے کہنا کرم دین نے بلوایا ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔ میں کہہ دوں گی'' چاچی نے اتنا کہا اور برقعہ لیتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

محلے میں اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کے پاس کرم دین کا اٹھنا بیٹھنا تھا مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ کرم دین کے نئے روپ سے خوش نہیں تھے، مبارک محلے کا وہ واحد فرد تھا جسے اس نے پہلے ہی دن سے بہت متاثر کیا تھا اور وہ کرم دین کا گرویدہ ہو گیا تھا، کرم دین کے پاس آنے والوں کی زیادہ تعداد محلے سے باہر کے لوگوں کی تھی، ایسا کم کم ہی ہوتا تھا کہ کوئی میاں جی کے ہوتے ہوئے اس کے پاس آیا ہو، کیونکہ کرم دین کا ماضی ان سے بھولا ہوا نہیں تھا۔

چاچی نے مبارک کو کرم دین کا پیغام دے دیا تھا، پیغام ملتے ہی مبارک نے اپنے دوست، صابر کو بھی ساتھ لے لیا اور کرم دین کے ہاں پہنچ گیا، وہ دونوں بار بار دروازے پر دستک دے رہے تھے مگر قوالیوں کی کیسٹ لگی ہونے کی وجہ سے ان کے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز کرم دین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ دونوں واپس جانے والے تھے کہ اسی لمحے کرم دین نے کیسٹ تبدیل کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر بند کیا تو دروازہ پیٹے جانے کا شور اس کے کانوں میں پڑا، وہ یہ سوچ کر کہ جانے کوئی کب سے دروازے پر دستک دے رہا تھا، جلدی سے کمرے سے باہر نکل آیا اور دروازہ کھول دیا۔

''لگتا ہے کافی دیر سے دروازے پر دستک دے رہے ہو؟'' کرم دین نے مبارک اور صابر کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر کہا۔

''ہم تو بہت دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں لیکن کوئی کھول ہی نہیں رہا تھا بلکہ اب تو ہم تھک ہار کر واپس جانے والے تھے۔'' مبارک نے کرم دین سے شکوہ کیا۔

''بس یار میں نے سنا ہی نہیں۔ مگر جب میرے کانوں میں دروازہ بجانے کی آواز پڑی تو میں دوڑتا ہوا آ گیا'' کرم دین نے اپنی صفائی پیش کی پھر خود ہی بولا ''تم باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر آ جاؤ۔''

بات کرتے ہی کرم دین اپنے کمرے کی طرف چل پڑا اور وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

''تمہارا پیغام ملا تھا۔ خیر سے بلایا تھا؟'' کمرے میں بیٹھتے ہی مبارک نے سوال کیا۔

''تم سے ملے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس لیے پیغام بھجوا دیا''

''جب چاچی نے تمہارا پیغام دیا۔ میں تو ڈر ہی

گیا تھا۔"

"ارے نہیں یار۔ ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" کرم دین نے مبارک کو تسلی دی اور مٹھائی کا ڈبہ کھول کر ان دونوں کے سامنے رکھتے ہوئے بولا "پریشانی ختم کرو اور یہ کھاؤ۔"

"یہ کیا ہے؟" مبارک نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مٹھائی۔ مگر تم اسے سائیں کرم دین کا بھنڈارہ سمجھ کر کھا جاؤ۔"

"بڑی موجیں منا رہے ہو۔ لگتا ہے کام خوب چل نکلا ہے۔"

"میں نے یہ سب پانے کے لیے محنت بھی تو بہت کی ہے۔ اب اگر محلے والے میرے پاس نہیں آتے تو کیا ہوا۔ اور تھوڑی دنیا ہے۔"

"محلے والوں پر بھی اپنا کچھ اثر ڈالو۔ پھر وہ بھی آنے لگیں گے۔"

"مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم بھی یہیں ہو اور میں بھی یہیں ہوں۔ خود ہی دیکھ لینا۔ یہی لوگ ہوں گے جو میرے پیچھے پیچھے پھریں گے۔" کرم دین نے بات کی۔

مبارک، کرم دین کی بات کا جواب دیے بغیر مٹھائی کھاتا رہا، پھر مٹھائی حلق سے اتارتے ہوئے بولا "ویسے مٹھائی کے ساتھ چائے بھی ہوتی تو مزا آجاتا۔" مبارک نے بات کی اور پھر صابر سے اپنی بات کی تصدیق کروانے کے لیے بولا "کیوں بھئی صابر؟ کیا خیال ہے؟"

صابر نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی، جب مبارک نے اس سے اپنی بات کی تصدیق چاہی تو وہ فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا "بات تو تمہاری صحیح ہے، مٹھائی ہو اور ساتھ چائے نہ ہو تو کچھ مزا نہیں آتا۔"

"تم مٹھائی کھاؤ۔ میں چائے کا بندوبست کرتا ہوں" کرم دین نے بات کی اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" کرم دین کو اٹھتا دیکھ کر مبارک نے دریافت کیا پھر خود ہی بولا "ہمیں گھر کی بنی ہوئی چائے نہیں چاہیے۔"

"تو بازار سے منگوا دیتا ہوں۔"

"نہیں چائے وہاں سے آنی چاہئے جہاں سے اس روز سگریٹ کی ڈبی آئی تھی۔" مبارک نے کرم دین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

مبارک کی بات سن کر کرم دین چھت کو دیکھتے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا، کرم دین کے منہ سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے، ان دونوں کو ہی اس کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی، اس لیے وہ خاموشی سے بیٹھے کرم دین کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے، پھر کرم دین نے بڑبڑانا بند کر دیا اور پہلے کی طرح ان دونوں سے باتیں کرنے لگا، اس وقت ان دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جب کچھ ہی دیر بعد ان تینوں کے سامنے چائے کے کپ رکھ دیے گئے تھے، جن میں سے باقاعدہ بھاپ اٹھ رہی تھی، مبارک اس قسم کا مظاہرہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا، اس لیے اس کی حیرت صابر کی نسبت بہت کم تھی جبکہ صابر دیر تک بے یقینی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھتا رہا اور چائے پیتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں مسلسل یہی سوال اٹھتا رہا کہ اس نے کمرے میں کسی کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا پھر گرم گرم چائے کے کپ ان کے سامنے کون رکھ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

غفوراں نے عائشہ کی زبانی تمام حالات سنے تو وہ کمرے سے نکل کر اکیلی بیٹھی دیر تک یہ سوچتی رہی کہ وہ اس بارے میں اپنے خاوند اور بیٹوں کو بھی اطلاع کر دے یا پھر شام تک ان کے آنے کا انتظار کرے، وہ دیر تک خود سے لڑتی رہی کہ اگر ابھی اطلاع دی تو وہ نہ جانے کیا سوچ بیٹھیں، لیکن پھر اسے خیال آتا کہ اگر اس نے ابھی اطلاع نہ دی اور شام تک ان کے آنے کا انتظار کیا تو کہیں وہ اس بات سے خفا نہ ہو جائیں کہ انہیں اسی وقت کیوں نہیں بتایا۔

دیر تک غفوراں اسی کشمکش میں رہی کہ اسے کیا کرنا چاہئے مگر اس سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا، آخر کار دل نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس نے اپنے خاوند اور بیٹوں کو دبے لفظوں میں اطلاع کر دی، غفوراں کے فون کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ تینوں گھر آ گئے۔

عائشہ کا باپ اور بھائی اس سے ملنا چاہتے تھے مگر اس وقت وہ سو رہی تھی، اس لیے وہ بھی دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے، تمام حالات جان کر عائشہ کا باپ گردن جھکا کر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا مگر اس کا بڑا بھائی اکرم غصے سے چیخا "کرم دین کی اتنی جرأت کہ وہ ہماری بہن کے ساتھ کوئی زیادتی کرے۔ ہم اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں گے۔"

"وہ کیا سمجھتا ہے ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ جو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموشی سے بیٹھے رہیں گے۔" اکرم کے بعد اکبر بھی دہاڑا۔

"اس طرح کے معاملات جوش سے نہیں ہوش سے حل ہوتے ہیں۔" مشتاق نے اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔

"تم کچھ بھی کہو ابا۔ میں نے کرم دین کی ٹانگیں ضرور توڑنی ہیں۔ ذرا اس کی جرأت تو دیکھو دو ٹکے کا آدمی ہو کر ہماری بہن کو دھتکار رہا ہے۔"

"پہلے عائشہ سے بات کر لیں۔ پھر سوچیں گے کیا کرنا ہے" مشتاق نے تحمل سے بات کی، پھر آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آمنہ تم جا کر دیکھو وہ اٹھ گئی ہے یا ابھی تک سو رہی ہے؟"

باپ کی بات سن کر آمنہ فوراً عائشہ کے متعلق جاننے کے لیے کمرے سے نکل گئی، آمنہ کا خیال تھا کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے اس لیے ابھی تک سو رہی ہوگی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ جب سے آئی تھی سو نہیں پائی تھی، آمنہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں آئی تھی پھر بھی عائشہ نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی، آمنہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو عائشہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"لیٹی رہو آپی۔" آمنہ نے عائشہ کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"میں کوئی مریض ہوں کیا؟"

"اللہ نہ کرے میری آپی کو کبھی کوئی بیماری آئے۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تم تھکی ہوئی ہو لیٹی رہو"

"بچے کہاں ہیں؟"

"تم فکر نہ کرو۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ابا اور بھائی آئے ہوئے ہیں۔ وہ تمہارے پاس آنا چاہ رہے تھے اس لیے مجھے دیکھنے بھیجا ہے کہ تم سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو۔"

"انہیں اس طرح فون پر اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔ شام کو وہ گھر آتے تو سکون سے بیٹھ کر بھی بات کی جا سکتی تھی۔"

"میں نے تو نہیں بلایا ناں آپی! اماں نے خود ہی اطلاع دی ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ میں وہیں چلتی ہوں۔ جہاں سب بیٹھے ہیں" عائشہ نے یہ کہتے ہوئے چارپائی چھوڑ دی اور آمنہ کے ساتھ چل پڑی۔

آمنہ کے ساتھ عائشہ کو کمرے میں داخل ہوتے

دیکھا تو عائشہ کا باپ اور بھائی اپنی جگہ سے اٹھ گئے، باپ نے آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے لگا لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، وہ باپ کے سینے سے لگی تو ان دونوں کے آنسو بہہ نکلے، عائشہ باپ کے سینے سے لگی رو رہی تھی، اس کا باپ بھی آنسو بہا رہا تھا، دونوں بھائیوں نے بھی آگے بڑھ کر باری باری اسے چپ کرایا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، تمام اہل خانہ اپنی اپنی جگہ آنسو بہا رہے تھے، عجیب سوگوار ماحول تھا، ہر آنکھ اشک بار تھی۔

''بس عائشہ بس۔'' بھائی نے بہن کو چپ کرانے کے لیے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم کیوں روتی ہو۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ روئے گا تو کرم دین، جب اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ہم اسے اپاہج بنا دیں گے۔''

''لیکن یہاں آنے سے پہلے ہمیں کرم دین کے بارے میں بھی کوئی خبر تو دی ہوتی۔ پھر کم از کم تمہیں اس طرح گھر چھوڑنا نہ پڑتا۔''

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا ابا۔ ابھی چلتے ہیں، خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' بھائی نے جذباتی ہو کر بات کی۔

''تم زیادہ بے صبرے نہ ہو۔ مجھے عائشہ سے بات کر لینے دو۔ اس کی بات سن کر ہی کچھ فیصلہ ہو سکتا ہے۔'' باپ نے بیٹے کو سمجھایا، پھر عائشہ کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تم سکون سے مجھے ساری بات بتاؤ۔ تاکہ ہم کرم دین سے کوئی بات کر سکیں۔''

عائشہ تمام حالات و واقعات ماں کو سنا چکی تھی، اب باپ کے پوچھنے پر وہ تمام باتیں پھر سے دہرانے لگی، بات کرتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، کئی بار آنسو بہے مگر وہ سب کچھ بتاتی رہی، جب عائشہ بات مکمل کر چکی تو باپ نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی اور بولا۔ ''تم اپنے گھر میں بیٹھی ہو۔ روتی کیوں ہو۔ میں اور تمہارے بھائی کرم دین کے پاس جاتے ہیں۔'' مشتاق نے بات کی اور بات کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، باپ کو اٹھتا دیکھ کر دونوں بیٹے بھی اٹھ گئے تھے، پھر ایک ایک کر کے سبھی اپنی اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے، وہ تینوں نکل گئے تو عائشہ کی ماں اسے پیار کرتے ہوئے تسلی دینے لگی۔

☆☆☆☆☆

مبارک اور صابر مٹھائی کے ساتھ چائے سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہاں سے چلے گئے تھے، کرم دین بہت خوش تھا، زندگی میں پہلی بار اس نے ایک ساتھ اتنی رقم دیکھی تھی، اس سے قبل بھی تھوڑے تھوڑے کر کے کچھ نہ کچھ رقم آنے لگی تھی مگر ایک ہی دن میں ہزاروں روپے اس کی جیب میں آ جانا اس کے لیے بہت زیادہ خوشی کا باعث بنا تھا، جیب میں ڈالے ہوئے نوٹوں کو تھپتھپانے کے بعد اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اب وہ دن زیادہ دور نہیں، جن کے لیے اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

کرم دین سکون سے چارپائی پر لیٹا خواب بن رہا تھا کہ دروازے پر لگی کنڈی کی کھٹ کھٹ نے اس کا سارا تسلسل توڑ کر رکھ دیا، وہ بے دلی سے اٹھا اور کنڈی کھول دی، وہاں عائشہ کا باپ اور بھائی کھڑے تھے، وہ انہیں دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اتنی جلدی آ جائیں گے، کرم دین ان کے چہروں کو دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ وہ بہت غصے میں ہیں۔

''آیئے آیئے۔ اندر آ جایئے۔'' کرم دین نے اس ڈر سے کہ وہ کہیں وہیں کھڑے کھڑے ہی اسے برا بھلا نہ کہنے لگیں، خود ایک طرف ہو کر انہیں گزرنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہم یہاں بیٹھنے نہیں آئے کرم دین۔'' اکرم نے تلخ لہجے میں بات کی۔

''تم لوگ اندر تو آؤ۔ پھر ہی بات ہو سکے گی ناں۔'' کرم دین نے انتہائی دھیمے لہجے میں بات کی۔

کرم دین کی بات سن کر تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتے ہوئے کرم دین کی بات سن لینے کا پروگرام بنا لیا، سب سے پہلے مشتاق نے گھر میں قدم رکھا تھا پھر اکرم اور اکبر بھی باپ کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے، جب وہ تینوں ہی اندر آ گئے تو کرم دین نے دروازہ بند کر دیا اور ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

''تم لوگ بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتا ہوں'' کرم دین نے انہیں کمرے میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم چائے پانی کو چھوڑو اور ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔ ہم نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' مشتاق نے کرم دین کو باہر جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

''چاچا باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ پہلے تھوڑی سی چائے تو پی لو۔ بس میں ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہوں'' کرم دین نے بات کی اور کوئی جواب سنے بغیر تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

وہ تینوں ہی گھر سے کرم دین سے بات کرنے کے لیے وہاں آئے تھے مگر وہ ان سے بات کرنے کی بجائے چائے پانی میں پڑ گیا تھا، کرم دین نے چائے لے کر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی، مگر وہ جب تک نہیں آیا تھا وہ تینوں وہاں غصے کی حالت میں بیٹھے رہے۔

کرم دین نے چائے دانی سے چائے کپوں میں ڈالی اور ٹرے میں رکھ کر ان تینوں کے سامنے رکھ دی، ان تینوں نے ہی تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اپنا اپنا کپ پکڑ لیا تھا۔

''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تم نے عائشہ کو گھر سے کیوں نکالا۔'' مشتاق نے بات کا آغاز کیا۔

''کیا تم نے اسے لاوارث سمجھ رکھا ہے؟'' کرم دین کے جواب دینے سے پہلے اکرم نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''خدا گواہ ہے چاچا! وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا۔''

''تو کیا اس کا دماغ خراب ہے کہ وہ خود گھر چھوڑ کر چلی گئی۔'' اکبر چیخا۔

''میں بھلا یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا، اور ویسے بھی اس نے ہمیشہ ہر دکھ سکھ میں میرا ساتھ دیا ہے، میں بھلا اسے گھر سے کیوں نکالنے لگا۔''

''وہ تو کہتی ہے کہ جو پچھلے دنوں اس کے دو بچے مرے، اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اور جو بچے زندہ ہیں، تمہاری وجہ سے ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔'' مشتاق نے تفصیل بتائی۔

''ذرا خود ہی سوچو چاچا۔ کیا کبھی کوئی باپ اپنے بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے مار سکتا ہے۔ ان معصوموں نے بھلا میرا کیا بگاڑا تھا، جو میں ان کی موت کا سبب بنتا۔''

''کیا یہ سچ نہیں کہ تم پیسہ کمانے کے چکر میں اپنے بچوں کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو۔''

''ذرا تم ہی انصاف سے بتاؤ۔ انسان پیسہ کس کے لیے کماتا ہے۔''

''ظاہر ہے اپنے بیوی بچوں کے لیے۔'' مشتاق نے جھٹ سے جواب دیا۔

''خدا تمہارا بھلا کرے چاچا۔ بس یہی میں کر رہا ہوں۔ مگر وہ سمجھتی نہیں۔''

''مگر وہ ایسا کیوں کہتی ہے کہ اس گھر میں اس کے

بچوں کو خطرہ ہے، اس لیے وہ یہاں نہیں رہے گی۔"

"چاچا تم ہی بتاؤ، کوئی باپ اپنے بچوں کا دشمن ہو سکتا ہے؟"

"لو یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ باپ تو اپنے بچوں کے لیے سایہ ہوتا ہے۔"

"پھر تم خود ہی بتاؤ چاچا۔ میں بھلا اپنے بچوں کا دشمن کیسے ہو سکتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ مشتاق کوئی جواب دیتا، اکبر، جو اب تک خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر غصے سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا بول پڑا۔ "ابا۔ تم کون سی باتیں لے بیٹھے ہو۔ سیدھی طرح کہو کہ ہم سے ہماری بچی کے آنسو نہیں دیکھے جاتے"

"دیکھو اکبر۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے عائشہ سے کوئی زیادتی کی ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔"

"تو کیا وہ پاگل ہے جو بچوں کو لے کر روتی ہوئی ہمارے پاس پہنچی ہے؟"

"گھر میں میاں بیوی میں چھوٹی موٹی باتیں ہو جایا کرتی ہیں، لیکن اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ گھر ہی چھوڑ دیا جائے۔ اگر عائشہ کو مجھ سے کوئی شکایت تھی تو اسے تم لوگوں کے پاس جانے کی بجائے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔"

"کرم دین بس اتنا یاد رکھنا۔ اگر تم نے ہماری بہن کو اپنے گھر میں نہ بسایا یا کوئی دکھ دیا تو یہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" اکبر چیخا۔

"وہ میری بیوی ہے۔ اور میں بھلا اسے کوئی دکھ کیوں دینے لگا۔ یہ اسی کا گھر ہے وہ جب چاہے آئے اور آ کر خوشی خوشی رہے" کرم دین نے دھیمے لہجے میں بات کی اور اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا "تم لوگوں نے تو چائے بھی نہیں پی۔ اور پڑی پڑی ٹھنڈی بھی ہو گئی۔ میں ابھی دو منٹ میں گرم کر کے لاتا ہوں" یہ کہتے ہوئے کرم دین نے ٹھنڈی چائے واپس چائے دانی میں ڈالی اور گرم کرنے کے لیے لے گیا۔

"کرم دین نے تو ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسے عائشہ سے کوئی ناراضگی ہے" مشتاق نے کرم دین کے کمرے سے جانے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"کہتے تو ابا تم ٹھیک ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" اکبر نے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی، اکرم بھی ہاں میں ہاں ملانا چاہتا تھا، مگر وہ بات کرنے سے پہلے ہی رک گیا، کیونکہ کرم دین چائے گرم کر کے لے آیا تھا، چائے گرم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے حجرے سے مٹھائی کا ڈبہ بھی اٹھا لایا تھا۔

کرم دین نے چائے کپوں میں ڈال کر ان تینوں کے ہاتھوں میں تھما دی اور مٹھائی کا ڈبہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور بولا "لیں گرما گرم چائے پئیں اور مٹھائی کھائیں اور اگر میری طرف سے تم میں سے کسی کے بھی دل میں کوئی میل ہے تو وہ نکال دیں۔"

کرم دین کی بات سن کر وہ تینوں ہی خاموشی سے چائے پینے لگے مگر ان میں سے کسی نے بھی مٹھائی نہیں کھائی تھی، مشتاق نے سب سے پہلے اپنی چائے ختم کی اور کپ ایک طرف رکھتا ہوا بولا "اب وہ گئی ہے تو کچھ دن رہ لے پھر میں اسے چھوڑ جاؤں گا"

"وہ تمہاری بیٹی ہے چاچا۔ تم اسے جتنے دن چاہو رکھ لو، جب تمہاری خوشی ہو گی لے آنا اور اگر مجھے کہو گے تو میں لینے آ جاؤں گا۔" کرم دین نے بات کی۔

"تم بھی لینے آ جاؤ گے تو کوئی حرج نہیں، لیکن تم بے فکر رہو میں اسے خود چھوڑ جاؤں گا۔ بیٹیوں والے جھکے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔"

"یہ بات نہ کرو چاچا۔ میرے دل میں تمہارے

لیے بہت عزت ہے۔ عائشہ تمہاری بیٹی ہے تو میں بھی تمہارا بیٹا ہوں۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ لو اب ہم چلتے ہیں۔" مشتاق نے بات کی اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اسے اٹھتے دیکھا تو کرم دین اور عائشہ کے دونوں بھائی بھی اٹھ گئے۔

"چاچا کھانا کھا کر جاتے۔"

"بس پتر۔ گھر والے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"اچھا چاچا۔ رب راکھا۔"

وہ تینوں کرم دین سے ہاتھ ملاتے ہوئے چل پڑے، کرم دین ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا تھا، انہیں رخصت کرنے کے بعد وہ واپس کمرے میں آیا اور وہاں پڑے ہوئے چائے کے برتن اور مٹھائی کا ڈبہ سمیٹ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین سے ملاقات کے بعد وہ تینوں گھر پہنچے تو تمام اہل خانہ ان کے انتظار میں بیٹھے تھے، جس وقت سے وہ تینوں گھر سے گئے تھے، اس وقت سے ان پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، انہیں کسی پل چین نہیں آیا تھا اور تب سے ہی ان کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ تینوں گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے کسی بھی قسم کی ناگواری یا غصے کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی، وہ چارپائیوں پر آ کر بیٹھے تو گھر کی خواتین شہد کی مکھیوں کی طرح فوراً ان کے اردگرد جمع ہو گئیں، عائشہ نے بھی انہیں اندر آتے دیکھ لیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی تھی۔

"کیا کہتا ہے کرم دین؟" عائشہ کی ماں نے بے چینی کے عالم میں دریافت کیا۔

"سب خیر ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ عائشہ کو بھی یہیں بلا لو۔ پھر بات کر لیتے ہیں......" مشتاق نے سکون سے جواب دیا۔

"جاؤ۔ اسے بھی یہیں بلا لاؤ۔" عائشہ کی ماں نے آمنہ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ماں کا اشارہ پاتے ہی وہ جلدی سے عائشہ کو بلانے چلی گئی، اب وہاں مکمل خاموشی تھی اور سبھی عائشہ کے منتظر تھے، تھوڑی ہی دیر میں آمنہ، عائشہ کو لے کر آ گئی۔

"آؤ۔ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔" مشتاق نے عائشہ کو اپنے پاس چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

باپ کی بات سن کر عائشہ خاموشی سے اس کے قریب جا بیٹھی "تم۔ چار دن یہاں سکون سے رہو۔ پھر میں تمہیں خود ہی چھوڑ آؤں گا......" مشتاق نے بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

عائشہ نے باپ کی بات سن کر گردن جھکا دی، پھر ہمت کر کے آہستہ سے بولی۔ "مگر...... میں...... وہاں نہیں جانا چاہتی۔"

"پگلی نہ ہو تو۔ اس طرح بھی اپنا گھر چھوڑا جاتا ہے کبھی۔" باپ نے بیٹی کو سمجھایا۔

"جس گھر میں میرے بچے محفوظ نہ ہوں۔ اس گھر کو چھوڑ دینا ہی اچھا ہے۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ تمہارے بچے اس کے بھی تو بچے ہیں اور کوئی بھی باپ اپنے بچوں کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اور پھر کرم دین اتنا بھی بیوقوف یا کم عقل نہیں۔ ہم تینوں نے ہی اس سے تفصیل سے بات کی ہے۔ تمہیں یقیناً کرم دین کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ کچھ دن

یہاں رہ لو، تب تک تمہارا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"جب تم فیصلہ کر ہی آئے ہو تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ مجھے بے شک کل ہی چھوڑ آنا۔ وہاں جیسے بھی حالات ہوں گے میں خود ہی بھگت لوں گی۔" عائشہ نے تلخ لہجے میں بات کی، مگر اس کے لہجے کی تلخی کو کسی نے کوئی اہمیت نہ دی اور سبھی نے خاموشی اختیار کر لی۔

عائشہ کے دونوں بھائی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے بہت بڑا کام سرانجام دے لیا ہے، تھک ہار کر کچھ دیر آرام کے لیے وہاں سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے، ان دونوں کے جاتے ہی ان کی بیویاں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی وہاں سے نکل گئی تھیں، عائشہ کی ماں اور باپ نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہاں سے چلے گئے۔

اب میدان خالی تھا، دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی لمحوں میں عائشہ کی چھوٹی بہن بڑی بن گئی تھی اور اسے سمجھانے لگی "آپی۔ میں نہیں کہتی کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کون غلط ہے اور کون صحیح لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں، جب بیٹی بیاہ کر چلی جائے تو اس کے دکھ سکھ اسی گھر سے جڑ جاتے ہیں جہاں وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہے۔ یقیناً تمہیں کوئی نہ کوئی دکھ تو پہنچا ہوگا جو تم آنسو بہاتی ہوئی اپنے بچوں کو لیے یہاں آئی ہو۔ پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ اپنے مسائل کو خود سلجھانا سیکھو۔ سبھی ماں باپ اپنی بیٹیوں کو ان کے گھروں میں بستا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، تم خدانخواستہ جب بھی کبھی اس طرح کسی وجہ سے جھگڑ کر یہاں آؤ گی، یہ جیسے تیسے بھی تمہیں اور کبھی بھائی کرم دین کو سمجھا بجھا کر تمہیں واپس وہیں چھوڑ آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جب بھی کبھی کوئی مسئلہ پیش آئے، اسے دوسروں تک پہنچانے کی بجائے، عقل مندی سے کام لیتے ہوئے خود اس کا کوئی حل نکال لیا جائے۔"

بہن نے چھوٹی ہو کر بڑی بڑی باتیں کر ڈالی تھیں، عائشہ انہیں خاموشی سے گردن جھکائے سنتی رہی پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولی "باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ پھر بھی تمہاری نصیحتوں کا شکریہ۔ میں کوشش کروں گی۔ آئندہ ایسا کچھ نہ ہو۔ جیسا اب ہوا۔"

"تھینک یو۔ آپی۔" کہتے ہوئے آمنہ نے عائشہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

☆☆☆☆☆

عائشہ کچھ روز اپنے والدین کے ہاں رہی پھر اس کا باپ خود اسے اس کے سسرال چھوڑ گیا، ان دنوں میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا مگر عائشہ نے خود کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا، مشتاق اسے چھوڑ کر صبح ہی واپس چلا گیا تھا، جانے سے پہلے اس نے ان دونوں کو بہت سی نصیحتیں کی تھیں اور کرم دین کو عائشہ اور بچوں کا خیال رکھنے کا کہا تھا، کرم دین نے بھی کسی سعادت مند بچے کی طرح سسر کی تمام باتیں تحمل سے سنی تھیں اور اسے ہر طرح سے مطمئن کر کے بھیجا تھا، پھر اس کے جانے کے بعد وہ عائشہ اور بچوں سے کوئی بات کیے بغیر اپنے حجرے میں جا بیٹھا تھا، صبح سے شام پھر شام سے رات ہو گئی تھی مگر کرم دین اپنے حجرے سے نکل کر باہر آیا تھا اور نہ ہی عائشہ اس کے پاس گئی تھی، اس دوران اس نے کرم دین کے لیے دونوں وقت کا کھانا بچوں کے ہاتھ اس کے حجرے میں ہی بھجوا دیا تھا۔

سونے کا وقت ہو گیا تھا مگر کرم دین اپنے حجرے سے باہر نہیں آیا تھا، عائشہ نے بچوں کو سلا کر کرم دین کے لیے بھی چارپائی بچھا دی اور ایک چارپائی اپنے لیے بچھا کر لیٹ گئی تھی، اس کے ذہن میں اس بات کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں تھا کہ کرم دین اس کے پاس آ کر اپنی زیادتیوں پر شرمندہ ہوتے ہوئے اسے منانے کی کوشش کرے گا اور نہ ہی اسے کرم دین کا انتظار تھا۔

نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی، اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی، وہ خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹی آنے والے وقت کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہی تھی، اسی دوران کرم دین آیا اور خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا، اس نے سونے سے پہلے عائشہ سے کوئی بات نہیں کی تھی، پھر کچھ ہی دیر بعد کرم دین کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

کرم دین کو کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، عائشہ کروٹ لیے اس طرح لیٹی تھی کہ اس کی پیٹھ کرم دین کی طرف تھی، نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں، اسی لمحے اس نے اپنی کمر پر ہلکی سی گدگدی محسوس کی مگر وہ جان بوجھ کر خاموشی سے لیٹی رہی، وہ سوچنے لگی کہ دن بھر کرم دین نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر اب اسے منانے کے لیے اس کے پاس بیٹھا اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا، پھر ایسا ہی کچھ اسے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگا مگر وہ خاموشی سے اپنی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی تاکہ کرم دین کو احساس ہو کہ وہ اس سے ناراض ہے۔

اگلے ہی لمحے جب کرم دین کے خراٹوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ یہ سوچ کر کانپنے لگی کہ اگر کرم دین اپنی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا تو وہ کیا تھا جس کے سانسوں کی آواز وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی، یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں، کمرے میں جلنے والے زیرو کے بلب کی روشنی میں اس کے چہرے پر رینگنے والا اژدھا اپنا پورا منہ کھولے اسے کاٹنے کے لیے تیار تھا، اژدھا کی آنکھوں سے عجیب سی روشنی نکل رہی تھی، اس کا منہ اس کے چہرے پر تھا جبکہ دھڑ اس کے بازوؤں اور کمر پہ تھا، عائشہ نے پوری طاقت سے اپنے بازو کو اوپر اٹھا کر زور سے جھٹک دیا، جس سے اژدھا دور جا گرا، اژدھا دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی، بلب کی روشنی میں اژدھا صاف دکھائی دے رہا تھا، عائشہ نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا بڑا اور خوفناک اژدھا نہیں دیکھا تھا، اژدھا دیکھ کر وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ خود پر قابو پانے کی کوشش کے باوجود اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

اژدھا زمین پر بل کھاتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، چیخ سن کر کرم دین ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، عائشہ اپنی چارپائی پر بیٹھی تھی، اس کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" کرم دین نے عائشہ کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

عائشہ کی سانس پھولی ہوئی تھی اور خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے لفظ ادا نہیں ہو پا رہے تھے اس لیے وہ کرم دین کے سوال کا جواب نہیں دے پا رہی تھی، وہ انگلی کے اشارے سے کرم دین کی توجہ اس طرف کرواتے ہوئے جہاں اژدھا تھا، بمشکل اتنا کہہ پائی تھی "س...... س......سانپ......"

کمرے میں جلے زیرو کے بلب کی روشنی ناکافی سمجھ کر کرم دین نے ٹیوب لائٹ جلا دی تھی تاکہ باآسانی کمرے کا جائزہ لیا جا سکے اور فوراً اس طرف نظر دوڑائی تھی جس طرف عائشہ نے اشارہ کیا تھا مگر اسے وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

عائشہ کی سمجھ میں یہ بات تو آ رہی تھی کہ اژدھا دن میں کسی وقت کمرے میں آ کر بیٹھ گیا ہوگا لیکن اس کی

سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے اژدھا کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا، دروازے میں کہیں بھی اتنی جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ اژدھا گزر کر باہر جا سکتا، پھر وہ کہاں سے نکل گیا تھا۔

"وہاں تو کچھ بھی نہیں۔" کرم دین نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد بات کی۔

جب تک وہ کمرے کے اندر اور باہر کا جائزہ لیتا رہا، عائشہ کی نگاہیں اسی پر لگی رہیں، اس کے واپس آنے تک عائشہ کی سانسیں بحال ہونے لگی تھیں اور وہ ڈر اور خوف کی کیفیت سے باہر نکل آئی تھی۔

وہ ہمیشہ سے کرم دین کا ہر زخم سہتی آئی تھی مگر اب حالات بدل گئے تھے، وہ دو بچوں کی موت کا دکھ دیکھ چکی تھی، اس میں مزید کوئی نیا دکھ سہنے کی ہمت نہیں تھی، کرم دین کمرے میں واپس آیا تو عائشہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ "لگتا ہے جب تک تمہاری وجہ سے میں اور میرے دونوں بچے بھی قبر میں نہیں جا سوئیں گے تمہیں سکون نہیں آئے گا۔"

"تم ہر بات کو میرے ساتھ کیوں جوڑ دیتی ہو؟"

"اس گھر میں جتنی بھی آفتیں آرہی ہیں وہ سب تمہاری وجہ سے ہیں ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کبھی نہ ہوتا......"

"اچھا چلو۔ ان باتوں کو جانے دو۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا" عائشہ کا غصہ دیکھ کر کرم دین نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں بات کی۔

کرم دین کا ہاتھ لگتے ہی عائشہ کو مزید غصہ چڑھ گیا اور اس نے تیزی سے اس کے ہاتھوں کو بری طرح جھٹک دیا۔

"اس قدر خفا کیوں ہوتی ہو؟"

"مجھے تنگ مت کرو۔ میں اس وقت تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔"

"لگتا ہے ابھی تک غصے میں ہو۔"

"میں نے کہا ناں۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ پھر خوامخواہ بات کو کیوں بڑھا رہے ہو؟" عائشہ نے تیز لہجے میں بات کی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کرم دین کچھ دیر تک عائشہ کے پاس کھڑا گردن جھکائے سوچتا رہا پھر ایک لمبی سانس چھوڑی اور خاموشی سے اپنے بستر پر جا لیٹا۔

ان کی شادی کے بعد اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ جب بھی کسی معاملے میں ان میں کوئی اختلاف ہوا یا گرمی سردی ہوئی، انہوں نے وقتی طور پر منہ پھلایا اور پھر کچھ ہی دیر بعد ناراضگی ختم ہوگئی، یہ اور بات ہے کہ بات کرنے میں ہمیشہ عائشہ نے پہل کی تھی، ان کی شادی شدہ زندگی مین پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ناراضگی اس قدر طول پکڑ گئی تھی۔

کرم دین کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی عائشہ ہی منانے میں پہل کرے گی، لیکن جب وہ اس کے منانے پر بھی نہ مانی تو وہ خاموشی سے اپنے بستر پر جا لیٹا، وہ رات دونوں پر ہی بھاری گزری تھی اور وہ رات بھر سو نہ سکے تھے۔

دن بھر کرم دین اپنے حجرے میں گھسا رہا اور عائشہ گھر کے کاموں میں مصروف رہی، دن میں ایک بار بھی وہ عائشہ اور بچوں کے پاس نہیں آیا تھا، کرم دین نے ایک روز قبل ہی کچھ سبزیاں، گوشت اور دالیں لا کر رکھ دی تھیں، اس لیے اسے کسی چیز کے لیے بھی کرم دین سے کہنا نہیں پڑا تھا، دن کا زیادہ تر حصہ اس نے یہ سوچتے ہوئے گزار دیا تھا کہ اس نے رات کو جو اژدھا دیکھا تھا وہ شائد اس کا وہم ہو لیکن پھر وہ خود ہی

سوچنے لگتی کہ یہ وہم نہیں تھا کیونکہ اس نے خود اژدھا کو اپنے جسم پر دیکھ کر جھٹکے کے ساتھ دور پھینکا تھا اور پھر اسے جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا، یہاں تک بات اس کی سمجھ میں آتی تھی مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اگر واقعی وہ اژدھا تھا تو وہ دروازے سے کیسے نکل گیا جبکہ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے اتنا موٹا اژدھا گزر جاتا، اپنی تسلی کے لیے اس نے صبح اٹھ کر دروازے سے باہر کا بھی بغور جائزہ لیا تھا مگر کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کوئی سانپ وہاں سے رینگتا ہوا گزرا ہوگا۔

رات ہوئی تو کرم دین کو پھر سے عائشہ کی اہمیت اور موجودگی کا احساس ہوا اور وہ ایک بار پھر منت سماجت کرنے لگا، عائشہ پہلے سے جانتی تھی کہ وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرے گا، وہ مسلسل انکار کرتی رہی اور کرم دین مسلسل اصرار کرتا رہا، جب فرار کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو اس نے مجبوراً کرم دین کی جھولی میں خیرات ڈال دی۔

اگلی صبح کرم دین اٹھا تو بہت اچھے موڈ میں تھا، ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے عائشہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور جیب سے بہت سی رقم نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنے پاس رکھ لو۔"

"یہ کس کے پیسے ہیں؟" عائشہ نے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے بہت سے نوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تمہارے ہیں۔ انہیں جیسے چاہو خرچ کرو۔"

"میں جانتی ہوں۔ تم نے لوگوں سے جھوٹ سچ بول کر یہ نوٹ اکٹھے کیے ہیں، اسی کمائی کی وجہ سے میں روٹھ کر گئی تھی اور آج تم وہی پیسے مجھے دے رہے ہو"

"تم پھر جذباتی ہو رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ کوئی بد مزگی پیدا ہو، میں انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہوں۔" کرم دین نے عائشہ کی ہتھیلی سے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور اپنے حجرے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا، دونوں بچے اپنے اپنے سکولوں میں گئے ہوئے تھے اور کرم دین حسب معمول اپنے حجرے میں تھا، اچانک عائشہ کے کان میں سرگوشی ہوئی، اس نے جلدی سے ادھر ادھر پلٹ کر دیکھا، کمرے میں اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا، اس نے اسے وہم جان کر کوئی پرواہ نہ کی، مگر تھوڑے سے وقفے کے بعد وہی آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی، اب کی بار اسے آواز صاف سنائی دے رہی تھی کوئی اسے کہہ رہا تھا "ہم تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔" اس آواز نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، اس بار اس نے واضح الفاظ سنے تھے مگر وہ اب بھی اسے اپنا وہم ہی سمجھی تھی، پھر وہ آواز دن میں بار بار اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی، وہ انتہائی خوف زدہ تھی مگر اس نے کرم دین سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ سنی ان سنی کر ڈالے گا۔

وقت کے ساتھ ساتھ کرم دین کی شہرت بستی سے نکل کر دور دور تک پھیلنے لگی تھی، اس لیے اب وہ شام کو اٹھتا تو اس کی جیبیں نیاز مندوں اور ضرورت مندوں سے ملنے والے نوٹوں سے بھری ہوتی تھیں، ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ کسی روز خالی ہاتھ اٹھا ہو، وہ کچھ نہ کچھ لے کر ہی حجرے سے نکلتا تھا مگر اس روز اس کے چہرے پر اداسی چھائی تھی، وہ اترا ہوا چہرہ لیے بجھے دل کے ساتھ حجرے سے نکلا تھا، رات ہو چکی تھی، باہر ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا وہ حجرے سے نکل کر صحن سے گزرتا ہوا کمرے کی طرف جا رہا تھا، اسی لمحے دروازے پر ہونے والی دستک اس کے کانوں

میں پڑی تھی اور اس کے قدم وہیں رک گئے تھے۔

''کھوکھر صاحب آئے ہیں'' دروازہ کھولنے پر باہر کھڑے شخص نے بلاتمہید اطلاع دی۔

اس شخص کی بات سن کر کرم دین کی نظر اوپر اٹھی تو اس نے دیکھا، علاقے کی جانی پہچانی شخصیت اور ایم پی اے، عمران کھوکھر گاڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے، انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کرم دین تیزی سے ان کے قریب پہنچ گیا اور سلام کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''کھوکھر صاحب آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا'' کرم دین نے بات کی۔

''ہمیشہ ضرورت مند کو ہی چل کر جانا پڑتا ہے اور اس وقت ضرورت میری تھی اس لیے میں خود چل کر آیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ یہاں محلے داروں کا رش لگ جائے، میرا خیال ہے گاڑی میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں'' کھوکھر صاحب نے بات کی اور پھر کرم دین کا جواب سنے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

کرم دین جان چکا تھا کہ یقیناً کوئی نہ کوئی ضرورت ہی عمران کھوکھر کو اس کے دروازے پر کھینچ لائی تھی، گاڑی کا دروازہ کھلنے پر وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا، کھوکھر صاحب بھی دروازہ بند کر کے دوسرے دروازے سے اس کے برابر آ بیٹھے تھے، ان کا اشارہ پا کر ان کے ساتھ آنے والا شخص باہر ہی کھڑا رہا تھا، اب گاڑی میں ان دونوں کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا، گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی تیسرا شخص نہیں سن سکتا تھا۔

''حکم کریں کھوکھر صاحب'' کرم دین نے کھوکھر صاحب کے گاڑی میں بیٹھتے ہی بات کی۔

''میں نے تمہاری بڑی شہرت سنی ہے، اس لیے خود چل کر یہاں آیا ہوں۔ یہ تو تم نے بھی سنا یا اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا کہ اس بار ہونے والے الیکشن کے لیے پارٹی نے میرے بجائے کسی اور کو ٹکٹ دے دیا ہے، میں نے پارٹی کا فیصلہ سمجھ کر خاموشی سے گردن تو جھکا دی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں، تم کچھ ایسا کرو کہ وہ الیکشن میں اس بری طرح ہارے کہ میری پارٹی کو بھی احساس ہو جائے کہ انہوں نے مجھے ٹکٹ نہ دے کر غلط فیصلہ کیا تھا''

''آپ خود چل کر یہاں آئے ہیں اور بے فکر ہو کر جائیں۔ جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا'' کرم دین نے مکمل اعتماد کے ساتھ یقین دہانی کرائی۔

کرم دین کی بات سن کر کھوکھر صاحب نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولے۔ ''یہ رکھ لو کام ہونے پر ایسا ہی ایک لفافہ اور پہنچ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کرم دین نے لفافہ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور پھر خاموشی سے درواز کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا، اس کے نکلتے ہی باہر کھڑا شخص تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی چلا دی، ان کے جانے تک کرم دین وہیں کھڑا رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ کھوکھر صاحب کی طرف سے دیے جانے والے لفافے میں نئے نئے نوٹ ہوں گے، اس لیے چاہتا تھا کہ وہ جلدی سے وہاں سے جائیں تا کہ ان کے جانے کے بعد وہ لفافہ کھول کر دیکھ سکے کہ اس میں کتنی رقم ہے۔

اندر آنے کے بعد وہ کمرے میں جانے کی بجائے واپس اپنے حجرے میں آ بیٹھا تھا، اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھولا تھا مگر اس میں نئے نوٹوں کی بجائے ہزار ہزار کے پرانے نوٹ تھے، لیکن

اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، لفافے میں نئے نہ سہی پرانے سہی، تھے تو نوٹ ہی، وہ جلدی جلدی سے نوٹ گننے لگا، جیسے جیسے گنتی آگے بڑھتی جاتی تھی اس کی خوشی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، کھوکھر صاحب پورے پچاس ہزار روپے دے کر گئے تھے، اس نے نوٹ گن کر پھر سے لفافے میں ڈالتے ہوئے جیب میں رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کرم دین نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا مگر ایک ساتھ ملنے والی بڑی رقم نے اس کی بھوک اڑا دی تھی، اس کی خواہش تھی کہ وہ جلدی سے یہ بات عائشہ کو بھی بتائے، لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس بات سے خوش ہونے کی بجائے ناراضی کا اظہار کرے گی، اس لیے اس نے بدمزگی سے بچنے کے لیے عائشہ سے اس بات کا تذکرہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، وہ کمرے میں داخل ہوا تو عائشہ چارپائی پر لیٹی اپنے دونوں ہاتھ گردن پر رکھے تڑپ رہی تھی، اس کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کی گردن دبا رہا تھا اور وہ اس سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اسے آواز دی، اس کی آواز سنتے ہی وہ یوں اٹھ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ساری کہانی سنا رہے تھے۔

''وہ مجھے بھی مار ڈالیں گے کرم دین۔'' عائشہ نے روتے ہوئے کہا۔

''کون مار ڈالے گا تمہیں؟'' کرم دین نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ......وہ......وہ پچھلے دو دن سے اٹھتے بیٹھتے میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ اگر کرم دین نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں تو وہ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔ اب وہ میری گردن دبا کر اپنی بات پر زور دے رہے تھے کہ میں تم سے بات کیوں نہیں کرتی۔'' عائشہ نے گردن جھکائے روتے ہوئے بات کی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں'' کرم دین نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

عائشہ جانتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ اسے تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں کرے گا، اس لیے اس نے مزید کوئی بات نہ کی اور اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے خاموشی سے اٹھی اور کھانا لا کر کرم دین کے سامنے رکھ دیا، کرم دین کا دل کھانا کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا، کھانا رکھ کر عائشہ اپنی چارپائی پر جا لیٹی تھی، کرم دین نے بھی بے دلی سے کھانا کھایا اور برتن ایک طرف رکھ کر لیٹ گیا۔

اگلے روز عائشہ نے میاں جی کو اپنی کیفیت بتائی تو انہوں نے رات کو سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر سونے کو کہا تھا اور ساتھ ہی ایک تعویز بھی دیا تھا، جسے ہر وقت گلے میں ڈالے رکھنے کی تاکید کی تھی۔

کرم دین اپنی ہی دنیا میں مگن تھا، اس نے عائشہ کی حالت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی مگر پھر بھی بیگانوں کی طرح بے پروائی سے کام لے رہا تھا، عائشہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دو بار باتوں باتوں میں تمام حالات اس کے کانوں میں ڈال دیے تھے مگر اس نے اپنی عادت کے مطابق سنی ان سنی کر دی تھی اور دولت سمیٹنے کے چکر میں پڑا رہا۔

عائشہ نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی، اس لیے انتہائی احتیاط سے کام لینے لگی تھی، وہ میاں جی کا دیا ہوا تعویز ہر وقت گلے میں ڈالے رکھتی اور رات کو آیت الکرسی پڑھ کر سوتی تھی، ایسا کرنے سے اسے حوصلہ ملا تھا، مگر اس کے اندر کا خوف اب بھی ہر پل اسے گھیرے میں لیے رکھتا تھا۔

وہ سو رہی تھی جب اسے احساس ہوا کہ اس نے

نہانے سے قبل تعویز گلے سے اتار کر رکھا تھا مگر نہانے کے بعد دوبارہ گلے میں ڈالنا بھول گئی تھی، یہ خیال آتے ہی اس نے گلے کو ہاتھ لگا کر دیکھا، تعویز گلے میں موجود نہیں تھا، وہ اسی وقت اٹھ کر تعویز گلے میں ڈال لینا چاہتی تھی لیکن اس پر نیند اس قدر غالب آ گئی تھی کہ وہ اٹھ نہ سکی۔

کرم دین کی آنکھ کھلی تو عائشہ کی چارپائی خالی پا کر اسے انتہائی تشویش ہوئی، دونوں بچے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے مگر عائشہ نہیں تھی، صبح ہو گئی تھی وہ اٹھ بیٹھا تھا اور یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہ باتھ روم میں گئی ہو گی، لیکن جب کافی دیر تک وہ نہ آئی تو کرم دین کو پریشانی لگ گئی، اس نے جلدی سے چارپائی چھوڑ دی اور باتھ روم میں جا کر دیکھا، باتھ روم کا درواز کھلا تھا اور عائشہ وہاں نہ تھی، اس کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا، وہ وہاں بھی دکھائی نہ دی، پھر اس نے پریشانی کے عالم میں گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی، حیران کن بات یہ تھی کہ بیرونی دروازے کی کنڈی بھی اندر سے بند تھی، پھر عائشہ کہاں چلی گئی تھی۔

عائشہ کو گھر میں نہ پا کر کرم دین پریشانی کے عالم میں سر پکڑے چارپائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا، بچے بھی اٹھ گئے تھے اور باپ سے اپنی ماں کے بارے میں دریافت کر رہے تھے، مگر جس بات سے وہ خود بے خبر تھا انہیں اس بارے میں کیا بتا سکتا تھا، جب کرم دین کو کوئی راہ دکھائی نہ دی تو اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے سسرال میں فون کر کے عائشہ کے بارے میں دریافت کیا مگر عائشہ وہاں بھی نہ تھی، کرم دین کی بات نے انہیں بھی پریشان کر ڈالا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ بھی وہاں آ پہنچے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں عائشہ کی گمشدگی کی خبر گھر سے نکل کر پورے محلے میں پھیل گئی تھی، باہمی مشورے کے بعد مساجد میں بھی اعلانات کروا دیے گئے تھے، عائشہ کی گمشدگی کی اطلاع پا کر تمام محلے دار کرم دین کے ہاں آ جمع ہوئے تھے، سب کے لیے عائشہ کی گمشدگی ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی، جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق ہر کوئی اپنی اپنی رائے قائم کر رہا تھا اور طرح طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

جو شخص محلے کے گھروں میں موٹر سائیکل پر دودھ دینے آتا تھا، مختلف گھروں میں دودھ دیتے ہوئے اس کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی تھی اور وہ بھی کرم دین کے گھر کے باہر موجود لوگوں کے پاس آ کھڑا ہوا تھا، اس نے وہاں کھڑے لوگوں میں سے ایک دو جان پہچان والوں کے ساتھ آہستہ سے بات کی تھی اور بتایا تھا کہ اس نے صبح ادھر آتے ہوئے گراؤنڈ کے پاس دور سے ایک عورت کو بے سدھ پڑے دیکھا تھا مگر وہ اس بات کا کوئی بھی نوٹس لیے اور رکے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔

گوالے کی بات چند کانوں میں پڑی تھی مگر اگلے ہی لمحے یہ بات ہر کان میں پڑ چکی تھی اور اب کرم دین، اس کے سسرال والوں اور محلے داروں کا رخ اس طرف تھا، جس جگہ کی نشاندہی دودھ والے نے کی تھی، گوالے کی بات سچ ثابت ہوئی تھی، عائشہ گراؤنڈ میں بے جان پڑی تھی اور اس کے چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، اسے چادر سے ڈھانپ دیا گیا اور پولیس کو اطلاع کر دی گئی۔

عائشہ کی لاش ملی تو کرم دین کے سسرال والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا، اب کرم دین ان کے نشانے پر تھا اور تمام توپوں کا روخ اسی طرف تھا، تھوڑی ہی دیر میں لوگ وہ سب باتیں بھی جان گئے تھے جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کرم دین پر تھو تھو کر رہے تھے، عائشہ کے گھر والے اس کی لاش اپنے

ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن باہمی رضامندی سے بمشکل فیصلہ ہوا کہ عائشہ کی قبر بھی اس کے دونوں بچوں کے پاس ہی بنا دی جائے۔

تدفین کے بعد کرم دین کے سسرال والے عائشہ کے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بضد تھے، کرم دین نے انہیں ایسا کرنے سے روکنے کے لیے ہر طرح منت سماجت کی تھی لیکن ان لوگوں نے ایک نہیں سنی تھی، ان کا یہی کہنا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی ان نشانیوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتے، اس فیصلے میں تمام محلے دار بھی ان کے ساتھ تھے اور ان کا پلڑا بھاری تھا، اس لیے انہوں نے بچوں کو ساتھ لیا اور بلا تاخیر وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں کسی مقتل میں رہ رہا ہو، جہاں ہر طرف اس کے خاندان والوں کی لاشیں تھیں اور جگہ جگہ اس کے بیوی بچوں کے جسم کے اعضاء بکھرے پڑے تھے، گھر کا کوئی کونا ایسا نہیں تھا جہاں کوئی نہ کوئی انسانی عضو موجود نہیں تھا، وہ جس کمرے میں جاتا کوئی نہ کوئی عضو اس کے پاؤں سے ٹکرا جاتا، یہاں تک کہ وہ کوئی چیز لینے کے لیے فرج بھی کھولتا تو اس میں بھی کسی نہ کسی بچے کا تن سے جدا کیا ہوا سر ملتا یا کسی خانے میں کسی بچے کا بازو لٹک رہا ہوتا، وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا مگر اگلے ہی لمحے وہاں کچھ بھی نہ ہوتا، نہ کوئی لاش، نہ تن سے جدا کیا ہوا سر اور نہ ہی کسی کے جسم کا کوئی حصہ۔

اس نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا مگر گھر میں انہی کی لاشیں اور بکھرے ہوئے اعضاء نے کرم دین کو خوف زدہ کر ڈالا تھا، جب خوف حد سے بڑھ جاتا تو وہ باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا، وہ ڈر اور خوف کے مارے دن بھر گھر سے باہر رہتا مگر رات کو گھر آنا اس کی مجبوری تھی، دن کی طرح اس کی رات بھی بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزرتی تھی۔

اس کیفیت نے اسے ذہنی مریض بنا ڈالا تھا، وہ دن بھر ڈرا سہما گھر کے کسی کونے میں پڑا رہتا یا بلاوجہ محلے میں ہی ادھر ادھر گھومتا رہتا، ان حالات کی وجہ سے اس کے پاس تعویز دھاگے کے لیے آنے والوں کی آمد و رفت بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئی تھی، وہ انتہائی تکلیف دہ حالات سے گزر رہا تھا، ایسے میں اسے بابا سائیں کے پاس جانے کے سوا کوئی دوسری راہ دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن وہ ان کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بابا سائیں اس سے کتاب کے متعلق ضرور سوال کریں گے، مگر ان کے پاس جائے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا، اس لیے اس نے بابا سائیں سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

وہ بابا سائیں کے آفس پہنچا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا، تالے پر پڑی ہوئی مٹی دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کافی دنوں سے کھولا نہیں گیا تھا، کرم دین پریشانی کے عالم میں بابا سائیں کے پاس آیا تھا مگر دفتر کے دروازے پر لگے تالے نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا، چند لمحوں میں اس کے ذہن میں بہت سے خیالات ابھرے، مگر اس نے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آیا ہو اور دفتر بند ملا ہو، کرم دین نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تاکہ وہ کسی ایسے شخص سے بات کرے، جس سے مکمل معلومات حاصل ہو سکیں، بابا سائیں کے دفتر کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے دفاتر اور دکانیں تھیں مگر کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی، اچانک ایک

ریڑھی والے پر اس کی نظر پڑی جو پھل فروخت کررہا تھا اور مسلسل اسی کی طرف دیکھے جارہا تھا، وہ پھل فروش کرم دین کو کام کا آدمی لگا تھا، اس لیے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

''جی باؤ جی! کیا چاہیے؟'' پھل فروش نے کرم دین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں بابا سائیں کے پاس آیا تھا' مگر وہاں تالا لگا ہوا ہے'' کرم دین نے بابا سائیں کے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے اس نے تمہیں بھی ہاتھ دکھا دیے ہیں۔'' پھل فروش نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بات کی۔

''کیا مطلب؟'' کرم دین نے حیران ہوکر دریافت کیا۔

''وہ فراڈ ہے فراڈ۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟ جانتے ہو کس کے بارے میں بات کررہے ہو؟''

''میں اسی بابا سائیں کی بات کررہا ہوں۔ جسے تم ملنے آئے ہو، نہ جانے وہ کتنے غریبوں کو لوٹ کر کھا گیا اور بنا پھرتا ہے بابا سائیں!''

پھل فروش کے منہ سے بابا سائیں کے متعلق گستاخانہ الفاظ سن کر کرم دین کا دماغ گھوم گیا، اس نے اسے گلے سے پکڑ کر زمین پر گرا لیا اور اس کی چھاتی پر بیٹھا غصے سے بے قابو ہوکر اس کے چہرے پر گھونسے مارنے لگا، پھل فروش کرم دین کے مقابلے میں کافی کمزور تھا، کرم دین کے سامنے اس کا کوئی بس نہیں چل رہا تھا مگر وہ مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔

انہیں گتھم گتھا دیکھ کر آس پاس کے دکان دار وہاں پہنچ گئے اور انہیں ایک دوسرے سے چھڑانے لگے، بہت سے راہ گیر بھی وہاں آ کھڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے کافی بھیڑ لگ گئی تھی، تین چار نوجوان او ایک باریش شخص نے بمشکل انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا۔

''کیا معاملہ ہے' تم دونوں کیوں لڑرہے ہو؟'' باریش شخص نے پھل فروش سے سوال کیا۔

''بھلے کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ یہ مجھ سے سامنے والے بابا سائیں کے بارے میں پوچھ رہا تھا، میں نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ فراڈ ہے۔ بس اتنی سی بات پر یہ مجھ سے الجھ پڑا۔'' پھل فروش نے لڑائی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی۔ ایسا ہی ہوا ہے؟'' باریش شخص نے کرم دین سے سوال کیا۔

''بات تو یہی ہوئی ہے جو یہ بتارہا ہے۔ لیکن یہ ہوتا کون ہے میرے بابا سائیں کو فراڈ کہنے والا۔''

''تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں سکون سے بیٹھ کر ساری بات سمجھاتا ہوں۔'' باریش شخص کرم دین سے بات کرتے ہوئے بولا اور پھر وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''تم لوگ بھی اب جاؤ یہاں سے۔ لڑائی ختم ہوچکی ہے رش بھی ختم کرو۔''

بات کرتے ہی باریش شخص کرم دین کو لیے وہاں سے چل پڑا کچھ اور لوگ بھی ان دونوں کے ساتھ ہو لیے تھے اور باقی کچھ دیر تک پھل فروش کے ساتھ ہمدردی جتانے کے بعد وہاں سے نکل گئے تھے، لوگوں کے جانے کے بعد پھل فروش نے اپنے کپڑے جھاڑے اور ریڑھی کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے چوٹوں کو سہلانے لگا۔

باریش شخص نے اپنے آفس میں بٹھا کر کرم دین کے سامنے بابا سائیں کے متعلق ایسے ایسے انکشافات کیے تھے کہ وہ آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا تھا، ان سب سے بڑھ کر یہ بات اور بھی حیران کردینے والی تھی کہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے بابا سائیں جیل میں تھے۔

کرم دین اپنے غموں کا علاج اور مسائل کا حل ڈھونڈنے بابا سائیں کے پاس آیا تھا مگر وہ تو خود جیل میں سزا کاٹ رہے تھے، حالات جیسے بھی تھے بابا سائیں سے ملاقات کرنا انتہائی ضروری تھا، کرم دین فوراً سے پہلے بابا سائیں سے ملنا چاہتا تھا مگر پھل فروش سے گتھم گتھا ہونے کی وجہ سے اس کے کپڑوں کی حالت اس قدر خراب ہوچکی تھی کہ ان میں بابا سائیں سے ملاقات کے لیے جانا مناسب نہیں تھا، اس لیے وہ واپس گھر کی جانب چل پڑا۔

اگلے روز وہ صبح سویرے ہی بابا سائیں سے ملاقات کے لیے گھر سے نکل پڑا تھا، جیل سے باہر ملاقاتیوں کا کافی رش تھا مگر تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے بابا سائیں سے ملاقات کا اجازت نامہ مل گیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم کب کے بابا سائیں کو بھول چکے ہوگے۔'' سلام دعا کے بعد بابا سائیں نے کرم دین سے بات کی۔

''یہ کیسے ممکن ہے سرکار کہ کرم دین آپ کو بھول جائے۔ بس کچھ اپنی ذاتی الجھنوں کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر نہیں ہوسکا۔ اب آیا تو پتا چلا کہ آپ یہاں ہیں۔''

''ہم فقیروں کا کیا ہے کرم دین۔ یہاں ہوئے یا وہاں، ایک ہی بات ہے۔ وہاں بھی چاہنے والے بہت تھے اور یہاں بھی چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ تم اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ اب تک تو تمہارا کام بھی خوب چل نکلا ہوگا''

''سچ تو یہ ہے سرکار کہ آپ نے جو کچھ مجھے دیا تھا، وہ میرے لیے بہت تھا مگر مجھے دولت سمیٹنے کی اس قدر جلدی تھی کہ نفع نقصان کی پروا کیے بغیر وہ کچھ بھی کرتا چلا گیا جس کی آپ کی طرف سے کوئی اجازت نہیں تھی۔''

''ایسا کیا کرلیا تم نے؟''

بابا سائیں کا سوال سن کر کرم دین نے شرمندگی سے گردن جھکا دی اور خاموش کھڑا رہا، بابا سائیں کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے پھر بولے ''کیا بات ہے کرم دین۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

''مجھے معاف کردیجیے بابا سائیں۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی۔ جس کی اتنی بڑی سزا پائی ہے کہ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' کرم دین نے بات کی اور روتے ہوئے بابا سائیں کے قدموں میں گر گیا۔

''تم نے ایسا کیا کرلیا کرم دین۔ جس کے لیے اس قدر شرمندہ ہورہے ہو۔'' بابا سائیں نے کرم دین کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں......میں وہ......وہ......وہ کتاب۔''

''کتاب! کہیں تم' عملیات والی کتاب کی بات تو نہیں کررہے؟''

''جی سرکار!''

''تو وہ کتاب تم لے گئے تھے؟'' بابا سائیں نے حیران ہوکر سوال کیا پھر خود ہی بولے ''کہیں تم نے اس کتاب سے کوئی چلہ تو نہیں کاٹ لیا؟''

''جی سرکار!'' کرم دین نے شرمندگی سے گردن جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتاب تم لے گئے ہوگے۔''

''نہ جانے کیوں مجھ سے غلطی ہوگئی سرکار۔''

''جیسا تم کہہ رہے ہو۔ اس کتاب میں دیے گئے طریقوں کے مطابق ویسا تو ہونا ہی تھا۔'' بابا سائیں بات کرتے ہوئے رکے پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے

ہوئے بولے "مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ تم نے کون کون سے عملیات کیے تھے؟"

بابا سائیں کی بات سن کر کرم دین کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے تمام تر تفصیلات بیان کرنے لگا، وہ بولتا رہا، بابا سائیں خاموشی سے سنتے رہے، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو بابا سائیں افسردہ لہجے میں بولے "یہ تم نے کیا کیا کرم دین؟ سچ پوچھو تو تم نے خود پر ہی نہیں اپنے بیوی بچوں پر بھی بہت بڑا ظلم کیا ہے۔"

"مجھے بہت سزا مل چکی۔ اب کچھ کیجیے سرکار! نہیں تو میں زندگی بھر کبھی سکون سے سو نہیں پاؤں گا۔" بات کرتے ہوئے کرم دین رو پڑا۔

"اب روتے کیوں ہو۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب آنے والی مزید مشکلات سے بچنے کا سوچو۔"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں سرکار۔ مجھے کسی طرح اس عذاب سے بچا لیجیے۔"

کرم دین کی بات سن کر بابا سائیں کسی گہری سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "تم مجھے کچھ وقت دو۔ میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔"

"جتنا چاہیں وقت لے لیں سرکار۔ مگر مجھے کسی طرح اس عذاب سے نجات دلا دیں۔"

"میں نے کہا ناں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ تم میرے پاس ایک ہفتے بعد آنا۔ امید ہے تب تک میں اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ ہی لوں گا۔"

"تو پھر اب میں جاؤں سرکار؟"

"ہاں ہاں اب تم جاؤ۔ بس اب اور زیادہ پریشان نہیں ہونا۔"

بابا سائیں کی بات سن کر کرم دین نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومے اور پھر باری باری انہیں اپنی آنکھوں پر لگا کر پھر سے چوما اور وہاں سے نکل پڑا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں کو جیل میں دیکھ کر کرم دین کو دلی دکھ ہوا تھا، وہ اپنی پریشانی کی وجہ سے ان سے یہ بھی دریافت نہیں کر پایا تھا کہ انہیں کس جرم میں وہاں بند کیا گیا تھا، لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ چاہے اسے کتنی ہی دولت خرچ کرنی پڑے وہ کسی بھی طرح انہیں قید سے رہائی ضرور دلائے گا، ویسے بھی اب تک اس نے جو کچھ کما کر جمع کیا تھا وہ انہیں کی وجہ سے تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ دو وقت کی روٹی بھی بمشکل پوری کر پاتا تھا۔

اسے اس بات کی تسلی تھی کہ اس نے اپنی الماری میں جو دولت جمع کر رکھی تھی، وہ اس سے شہر کے بڑے سے بڑے وکیل کو بھاری فیس دے کر مقدمہ جیت لے گا اور بابا سائیں کو رہائی دلوانے میں کامیاب ہو جائے گا، اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی اس جیب کو تھپتھپایا جس میں الماری کی چابیاں تھیں، جہاں اس کی دولت بہت سے تالوں کے پیچھے محفوظ تھی، اس نے یہ سوچ کر الماری کو کئی تالے لگا رکھے تھے کہ اگر کبھی کوئی چور، ڈاکو آ جائے تو با آسانی اس کی دولت چرا نہ سکے۔

کچھ دن بعد جب معقول رقم اس کے پاس اکٹھی ہو جاتی، وہ اسے گن کر الماری میں رکھ دیتا اور تسلی سے سارے تالے بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا، پچھلے کچھ عرصے سے اس کے پاس تعویز دھاگے کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا، الماری میں رکھی ہوئی دولت کے علاوہ اس کے پاس جو رقم تھی وہ اسی میں سے خرچ کر رہا تھا، ایک عرصے سے الماری میں پڑی ہوئی رقم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ کھولی بھی نہیں گئی تھی۔

بابا سائیں نے ایک ہفتے کے بعد آنے کا کہا تھا اور یہ سات دن اسے سات صدیاں لگ رہے تھے، مگر جیسے تیسے ایک ایک کر کے دن کٹتے گئے اور آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب اسے بابا سائیں کے پاس جانا تھا، وہ صبح جلدی ہی اٹھ گیا تھا، وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ آج بابا سائیں سے مل کر اس کی ساری کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی، اس نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔

کرم دین کا خیال تھا کہ وہ بازار سے ناشتہ کرنے کے بعد گھر واپس آئے گا تو اسے دیر ہو جائے گی، اس لیے اس نے پروگرام طے کرلیا تھا کہ وہ جاتے ہوئے راستے میں ہی ناشتہ کرلے گا اور پھر وہیں سے بابا سائیں سے ملاقات کے لیے نکل پڑے گا۔

اس نے پچھلے سات دنوں میں اس بات کی مکمل منصوبہ بندی کر لی تھی کہ وہ بابا سائیں سے تفصیلی بات کر کے اسی روز ان کے لیے کوئی اچھا وکیل کر لے گا جو ایک دو پیشیوں میں ہی انہیں با عزت بری کروا دے گا، وہ اپنے ساتھ کچھ رقم لے جانا چاہتا تھا تا کہ اس میں سے کچھ رقم بابا سائیں کو دے سکے اور پھر واپسی پر وکیل کی فیس بھی ادا کی جا سکے۔

کرم دین نے جیب سے چابیاں نکال لیں اور الماری کھولنے لگا، اب سب تالے کھل چکے تھے اور نوٹوں کی گڈیاں اس کے سامنے تھیں، وہ سوچنے لگا "عائشہ بیوقوف اور پاگل تھی، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گنوار تھی، اسے دولت کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں تھا، وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ دولت تو دولت ہوتی ہے خواہ کسی بھی ذریعے سے کمائی جائے، مگر اسے دولت سے بڑھ کر اپنے بچے پیارے تھے" وہ اور بھی بہت کچھ سوچتا، لیکن بچوں کے متعلق آنے والی سوچ نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، پھر جیسے ہی خیالوں سے نکل کر اس کی نظر رنگ برنگے نوٹوں کی گڈیوں پر پڑی تو اسے سب کچھ بھول گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ نوٹوں کی گڈیوں کی طرف بڑھا دیے، مگر اگلے ہی لمحے اس کا سر چکرا کر رہ گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اس نے گرتے گرتے الماری کو پکڑ لیا تھا، اس لیے گرنے سے بچ گیا، بظاہر نظر آنے والی دولت، مٹی کا ڈھیر بنی پڑی تھی، اس نے باقی گڈیوں کو بھی اٹھا کر دیکھا انہیں بھی دیمک چاٹ گئی تھی، وہ جس گڈی کو ہاتھ میں لیتا وہ مٹی بن کر اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر جا گرتی تھی۔

کرم دین کو جس دولت کا بہت گھمنڈ تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کی شکل میں فرش پر پڑی دکھائی دینے لگی تھی، جس میں مختلف رنگوں کے نوٹوں کے کچھ ٹکڑے بھی دکھائی دے رہے تھے، قریب تھا کہ فرش پر پڑی اس ڈھیری کو دیکھ کر وہ بھی فرش پر ہی ڈھیر ہو جاتا، اس نے خود کو قریب بچھی ہوئی چارپائی پر گرا دیا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

جب کرم دین نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو قبروں میں اتارا تھا اور پھول جیسے بچوں پر مٹی ڈالی تھی، تب بھی اسے کوئی دکھ نہیں ہوا تھا، اس نے جس دولت کو پانے کی خاطر اپنے بیوی بچوں کی قربانی دی تھی، اسے مٹی کا ڈھیر بنے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا تھا، درد کی شدت اسے سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی، بیوی بچوں کو دفن کرتے ہوئے اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا، کیونکہ جس چیز سے اسے پیار تھا وہ تو اس کی الماری میں تالوں کے پہرے میں محفوظ پڑی تھی اور اس کی چابیاں اس کی جیب میں تھیں، پھر وہ کیوں روتا، مگر آج اسے اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہا تھا اور مسلسل روئے جا رہا تھا۔

گو کہ اس پہ بہت مشکل اور بھاری وقت گزر رہا تھا مگر اسے یہ اطمینان تھا کہ اس کی تجوری میں

بہت سی دولت جمع ہے، وہ جب چاہے گا اپنے لیے خوشیاں خرید لے گا، لیکن شائد اسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اگر خوشیاں صرف دولت سے خریدی جاسکتیں تو کسی بھی دولت مند کو کبھی کوئی دکھ، کوئی صدمہ نہ پہنچتا۔ وقت نے ایک بار پھر اُسے بہت پیچھے دھکیل دیا تھا مگر اب بھی اس کے لیے بابا سائیں کا سہارا باقی تھا، اس نے خود کو سمیٹا اور بابا سائیں کے ہاں سے چرائی ہوئی عملیات کی کتاب کپڑے میں لپیٹ کر ان سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین نے جیسے ہی بابا سائیں کو دیکھا تو خود پر قابو نہ پاسکا اور ان سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔

''رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کرم دین۔ اپنے دل کو مضبوط کرو، ابھی تو تمہیں بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا ہے، تم اگر ابھی سے ہمت ہار گئے تو آنے والے حالات کا مقابلہ کیسے کر پاؤ گے''

''میں حالات سے لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں سرکار! اب حالات سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں ہمت باقی نہیں رہی۔ مجھے صرف آپ کا ہی سہارا ہے، اب آپ ہی میری مدد کرسکتے ہیں۔'' کرم دین نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے پچھلے کئی دنوں سے تمہارے معاملے پر بہت غور کیا ہے اور میری نظر میں اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔''

''آپ جو بھی کہیں گے میں کرنے کو تیار ہوں سرکار۔''

''کام بہت مشکل ہے۔''

''سرکار آپ ایک بار حکم تو کریں۔''

''تو سنو کرم دین۔ تمہاری تمام تر مشکلات کا حل اس میں ہے کہ تم کوئی ایسا شخص تلاش کرو جو یہ علم سیکھنا چاہتا ہو۔ جب تم یہ علم کسی اور کو منتقل کردو گے تو تمہارے سر سے یہ بوجھ اتر جائے گا، ورنہ عمر بھر پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہو گے۔ لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا، تم جس شخص کو بھی اس کام کے لیے تیار کرو، وہ اپنے وظیفے کے لیے آبادی سے دور کسی کھلی جگہ کا انتخاب کرے، ورنہ وہاں کے لوگوں پر کوئی بھی آفت آسکتی ہے۔''

''میں سمجھ گیا سرکار۔ جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔'' کرم دین نے بات کی اور پھر کپڑے میں لپٹی ہوئی کتاب بابا سائیں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''اور یہ کتاب بھی رکھ لیجیے سرکار، جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔''

''قصور اس کتاب کا نہیں، قصور تمہاری سوچ کا ہے۔ جس پر تم قابو نہیں پاسکے اور سب کچھ سمیٹنے کی ہوس میں اندھے ہو کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔''

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے سرکار۔ کوشش کروں گا آئندہ ایسا نہ ہو۔''

''تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے کرم دین۔ اسی لیے تمہیں مشکلات سے نکلنے کی راہ دکھا رہا ہوں۔ ورنہ جو غلطی تم نے کی ہے وہ قابل معافی نہیں۔ کرم دین میں جیسا بھی ہوں وہ میرا ذاتی فعل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے تمہارے لیے اچھا ہی سوچا تھا۔ مگر تم کسی اور ہی راہ پر چل نکلے۔''

''سرکار!۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھ سے واقعی بہت بڑی بھول ہوگئی۔ اب جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔'' کرم دین نے روتے ہوئے بابا سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اب روتے کیوں ہو؟ جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''اچھا سرکار اب مجھے اجازت دیں۔'' کرم دین

نے رخصت ہونے کے لیے بابا سائیں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

بابا سائیں نے کرم دین سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے جانے کی اجازت دے دی۔

بابا سائیں سے ملاقات نے کرم دین کو ایک نیا حوصلہ دیا تھا، وہ گھر پہنچا تو بہت مطمئن تھا، اس کی حالت اس مریض کی سی تھی جو اپنی بیماری کے علاج کے لیے کسی اسپیشلسٹ سے نسخہ لکھوا کر لایا ہو اور اسے اس بات کی تسلی ہو کہ اب اس کی بیماری ختم ہوجائے گی۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو بخوشی وہ سارا علم سیکھنے کے لیے تیار ہوجاتا، جس کے بوجھ تلے وہ بری طرح دبا ہوا تھا، وہ حسب عادت سر پہ بازو رکھے چارپائی پر پڑا دیر تک سوچتا رہا مگر اس کے دوستوں اور ملنے ملانے والوں میں سے کوئی بھی ایسا شخص ذہن میں نہیں آرہا تھا جس سے اس سلسلے میں بات کی جاسکتی، اچانک اس کے ذہن میں ایک ایسا نام ابھرا جس کے بارے میں اسے مکمل یقین تھا کہ وہ اس کام کے لیے بخوشی تیار ہوجائے گا۔

مبارک کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور وہ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگا، ایک وقت تھا جب وہ عملیات کا علم جاننے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا مگر اب وہ اسے بوجھ لگنے لگا تھا جسے وہ کسی اور کے کندھوں پر ڈال دینا چاہتا تھا۔

اس نے مبارک کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے مکمل منصوبہ بندی کرلی تھی، کرم دین کا پیغام ملنے کے کچھ ہی دیر بعد مبارک اس کے ہاں پہنچ گیا تھا، کرم دین اسے یوں گلے لگا کر ملا تھا جیسے بچھڑنے کے بعد اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہو، وہ اسے اپنے مخصوص کمرے میں لے گیا اور بلا مقصد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

مبارک اس سے پہلے بھی کئی بار کرم دین کے ہاں آچکا تھا، آج کرم دین نے پیغام بھجوا کر خصوصی طور پر اسے بلوایا تھا مگر ابھی تک کرم دین کی کسی بات سے اسے یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ اسے کس مقصد کے لیے بلوایا گیا تھا۔

''کوئی کام تھا کرم دین؟'' مبارک نے سوال کیا۔

''کیا کسی کام کے علاوہ میں تمہیں نہیں بلوا سکتا۔'' مبارک کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کرم دین نے الٹا اس سے سوال کردیا۔

''کیوں نہیں۔ تم جب چاہو مجھے بلوا سکتے ہو۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ شاید کوئی کام ہو۔''

''کام کیا ہونا ہے۔ بس ایسے ہی تم سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا اسی لیے پیغام بھجوا دیا۔ اب تم یہ بتاؤ تمہاری کیا خدمت کی جائے؟''

''کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں۔ بس گپ شپ لگاتے ہیں۔''

''میں نے کون سا کوئی تکلف کرنا ہے...... بس ذرا سا ایک اشارہ کرنا ہے اور سب کچھ حاضر۔''

''یہ بات ہے تو پھر جو چاہے منگوالو۔''

''لاؤ بھئی میرے دوست کے لیے اچھی قسم کی کچھ کھانے پینے کی چیزیں لاؤ۔'' کرم دین چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا

مبارک، کرم دین کی ایسی کیفیت پہلے بھی دیکھ چکا تھا اس لیے اسے زیادہ حیرانی نہ ہوئی لیکن وہ اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کرم دین کے موکل کیا لے کر آتے ہیں، وہ ابھی اسی سوچ میں تھا کہ کرم دین کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ چھت کی طرف

دیکھتے ہوئے گردن ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' اس کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کی بات کا جواب دے رہا ہو۔

''آؤ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔'' کرم دین نے اٹھتے ہوئے مبارک سے کہا۔

کرم دین کی بات سن کر کوئی بھی سوال کیے بغیر مبارک بھی اٹھ گیا تھا، کرم دین چلا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا، وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جس کمرے میں داخل ہوئے تھے، وہاں میز پر طرح طرح کے انتہائی اعلیٰ قسم کے تازہ پھل پڑے تھے جن کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ ''جو دل چاہے جی بھر کے کھاؤ......'' کرم دین نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''یہ سب کیسے ہو جاتا ہے؟'' مبارک نے پھلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''آسان سی بات ہے۔ میرے پاس موکل ہیں، میں جب بھی ان سے جو چاہتا ہوں منگوا لیتا ہوں۔ وہ میرے حکم کے غلام ہیں اور میرا اشارہ پاتے ہی جیسا میں چاہتا ہوں کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے مجھے کہیں جانا پڑتا ہے اور نہ ہی جیب سے کوئی رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔''

''بڑی حیرانی کی بات ہے۔'' مبارک نے سیب کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اس میں حیران ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ تم چاہو تو یہ سب تم بھی حاصل کر سکتے ہو۔''

''نہ بھئی نہ، مجھے تو جنوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا؟ جن تو تمہارے غلام ہوں گے۔ تم ان سے جو کام لینا چاہو لے سکو گے۔''

''پھر بھی ڈر تو لگتا ہے ناں۔''

''میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''نہ بابا نہ، میں نے نہیں سیکھنا یہ کام......'' مبارک نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

مبارک کی باتیں کرم دین کی مایوسی بڑھا رہی تھیں، اسے مبارک کے رویے میں روشنی کی جو کرن دکھائی دے رہی تھی وہ ختم ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ ''اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو تمہاری خوشی۔ یہ کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ میں تو اپنا دوست سمجھ کر تمہیں یہ علم سکھانا چاہتا ہوں۔ ورنہ تو کسی کی منت سماجت پر بھی میں یہ علم کسی کو نہ سکھاؤں'' مبارک کو اپنے مقصد کے لیے تیار کرنے کے لیے کرم دین نے بھرپور وار کیا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ مگر۔ پھر بھی۔''

''اچھا تم اپنے ذہن پر اتنا زور مت ڈالو'' کرم دین نے بات کی اور پھر پھلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارے سامنے جو کچھ پڑا ہے، یہ کھانے کے لیے ہے دیکھنے کے لیے نہیں۔ کم از کم اس کے ساتھ تو انصاف کرو۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا'' مبارک نے ہنستے ہوئے بات کی اور پھل کھانے لگا۔

ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ

